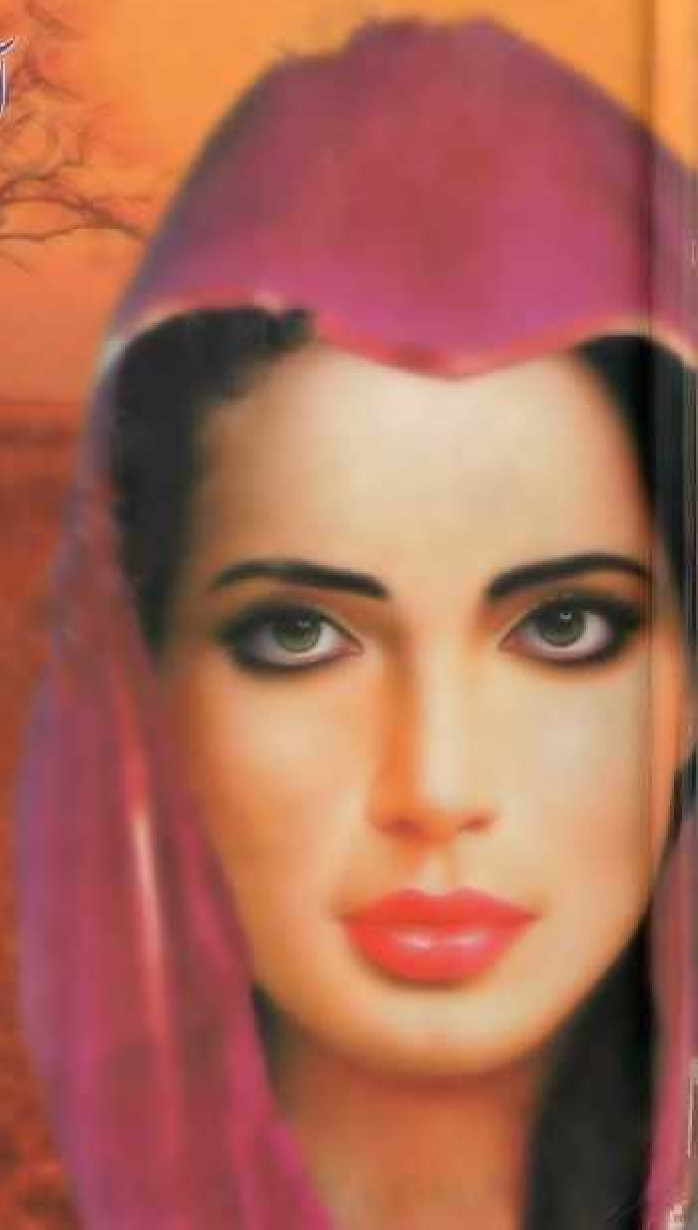
# شام ڈھلے

آمنہ اقبال احمد



ہرسُو گہرا سکوت تھا، چاروں اور گھمبیر سناٹا۔ یہاں وہاں کھڑے گارڈز ساکت تھے اور—

ڈھلتی شام کے دھندلکوں میں دور تک پھیلی پرشکوہ حویلی بہت پراسرار لگ رہی تھی۔

وہ گاڑی سے اُتر آئی۔ آس پاس نگاہ ڈالی۔ کوئی بھی تو جانا پہچانا چہرہ نہیں تھا۔ ڈرائیور اجنبی، سامان اُٹھانے والا اجنبی— گارڈز کے چہرے اجنبی!

غم سے نڈھال وہ حویلی کے بڑے سے منقش چوبی دروازے میں داخل ہوئی— تو قدم جیسے رک سے گئے۔ حویلی تو سائیں سائیں کر رہی تھی۔ سورج غروب ہو چکا تھا مگر ایک بھی بتی ایک بھی فانوس روشن نہیں تھا۔ سردی گھر آئی تھی

'Let your heart guide you.
It whispers, so listen closely.'

مگر کہیں بھی انگیٹھیوں میں جلتی بڑی بڑی لکڑیوں کی آگ نظر نہیں آ رہی تھی۔
شام گہری ہو چلی تھی اِس کے باوجود ملازموں کے چلنے پھرنے، چائے پانی سرو کرنے کی کوئی کھنک سنائی نہ دیتی تھی!

''کوئی ہے...؟'' صدمے سے بے حال وہ بمشکل پکاری۔

مگر—— اُس کی آواز حویلی کی دیواروں سے ٹکرا کر واپس آ گئی۔

تھکن سے چُور وہ وہیں وسیع و عریض ہال میں ایک طرف صوفے پر بیٹھ گئی۔
اُسے اپنے ہی گھر میں اپنا آپ اجنبی سا لگنے لگا۔

تبھی—— وہ قدموں کی آہٹ پر چونکی۔ نظریں اُٹھا کر دیکھا۔

چاروں اور پھیلے ملگجے اندھیرے میں سیڑھیوں پر سے اُترتی لمبے قد کی ایک چالیس بیالیس سالہ عورت کرخت سا چہرہ نیم وا آنکھیں لئے پُراسراری نظروں سے اُسے گھورتی کسی زومبی کی طرح آہستہ آہستہ چلی آ رہی تھی۔

پتہ نہیں کیوں؟ وہ دہل سی گئی۔

''آیئے۔ آپ کا سامان آپ کے کمرے میں پہنچ چکا ہے۔'' گہرے سناٹے کو توڑتی اُس کی آواز بھی جیسے کئی سربستہ راز لئے تھی۔

''سب لوگ کہاں ہیں؟'' اُس نے وہیں بیٹھے بیٹھے پوچھا۔

''کون سب لوگ؟'' کسی بھی جذبے سے خالی وہ کسی مشین کی طرح بولی۔

''ماما الفت، اکرم بابا، باقی سب...''

''مجھے کچھ معلوم نہیں۔'' اُس کا لہجہ سپاٹ، آنکھوں میں بے شمار بھید تھے۔

''آپ... آپ کون ہیں؟'' وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

وہ مسکرا دی۔ ایک عجیب پُراسراری مسکراہٹ!

''مسز علی۔ جہانگیر حیدر صاحب نے مجھے آپ کی دیکھ بھال کے لئے بھیجا ہے۔''

''اوہ''۔



''آپ کا سامان آپ کے کمرے میں لگ چکا ہے''۔ اُس نے ایک بار پھر اپنی بات دہرائی۔ اور جانے کے لئے قدم بڑھائے۔

وہ خاموشی سے اُس کے پیچھے ہو لی۔

اوپر جاتی سیڑھیاں، وسیع و عریض راہداریاں، دور تک پھیلے کمرے، سبھی اندھیروں میں ڈوبے تھے۔

اُس نے اُس کے لئے اُس کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ لائیٹ آن تھی اور انگیٹھی میں آگ جل رہی تھی۔ غنیمت تھا یہ بھی!

وہ—— اِس عورت سے پاپا کے بارے میں کچھ پوچھے، کچھ بات کرے۔ یہ تو اُسے معلوم ہی ہوگا۔ پر——

پتہ نہیں کیوں؟ اُس کا روکھا روکھا سا رویہ دیکھ کر اُسے جھجک سی محسوس ہو رہی تھی۔ پھر بھی——

''آپ... کب سے یہاں ہیں؟'' اُس نے پوچھ ہی لیا۔

''میں آپ کے لئے چائے بھجواتی ہوں''۔ اُس کی اَن سنی کرتے ہوئے اُس نے جذبات سے عاری آواز میں کہا۔ اور دروازے کی طرف بڑھی۔

اوہ—— اُس کی جیسے کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔ اُس کی بیزاری صاف بتا رہی تھی!

وہ جاتے جاتے دروازہ بند کر گئی۔

اور—— شاندانہ ہکا بکا بند دروازے کو تکتی رہ گئی۔

اُس کا ذہن ماؤف تھا۔ پاپا کا غم، اوپر سے حویلی کا یکسر بدلا اجنبی ماحول!
کس سے کہے؟ کس سے سنے؟

اُس کے صبر کا مزید یارا نہ رہا۔ بستر پر پڑ کر وہ بے اختیار رو دی۔ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ وہ حیران تھی اب تک خود کو سنبھالا کیسے تھا؟

پاپا کی بہت خواہش تھی کہ وہ ڈاکٹر بنے۔ اے لیولز کے بعد انہوں نے اُسے

میڈیکل میں ایڈمشن بھی دلوا دیا تھا مگر ___ اُسے اِس فیلڈ سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ اُسے فائن آرٹ سے ہمیشہ دلچسپی رہی تھی۔ سو ___ پاپا کی منت سماجت کر کے میڈیکل چھوڑ چھاڑ وہ 'لنڈن سکول آف آرٹس' میں داخلہ کروا کے لنڈن چلی گئی۔
بمشکل تین مہینے گزرے تھے کہ اُسے پاپا کے ڈیتھ کی اطلاع ملی۔ اسلحے کی صفائی کر رہے تھے کہ گولی چلی اور اُن کی موت کا سبب بن گئی۔ اُس پر پردیس میں اِس کمسنی میں کیا بیتی تھی؟ وہ ہی جانتی تھی۔ وہیں مقیم پاپا کے دوست درانی انکل و آنٹی نے اُسے سنبھالا دیا۔ اُس کے پاکستان آنے کا بندوبست کیا۔ ورنہ وہ تو سدھ بدھ کھو بیٹھی تھی۔
غم سے نڈھال ایئرپورٹ پر اتری، باہر نکلی۔ تو اُس کی نظریں بے تابی سے انکل جہانگیر کو تلاش کر رہی تھیں۔ اتنی دیر اُس نے خود کو بمشکل سنبھالا تھا۔ اب اُن کے کندھے پر سر رکھ کر ڈھیر سارا رونا چاہتی تھی۔ وہ پاپا کے چھوٹے بھائی تھے۔ اُن میں اُس نے بارہا پاپا کی خوشبو محسوس کی تھی۔ مگر ___
اُن کے بجائے اُن کے ایک بالکل اجنبی ڈرائیور نے اُسے ریسیو کیا۔ اُس کے استفسار پر اُسے بتایا کہ وہ دو ہفتے کی میٹنگ کے لئے کراچی گئے ہوئے تھے۔ اُس کے لب و لہجے میں بھی سرد مہری تھی۔ جب اُس نے انکل کی فیملی آنٹی، سرفراز بھائی، ثانیہ اور ناجیہ کے بارے میں دریافت کیا تو پتہ چلا وہ لوگ بھی ساتھ گئے تھے۔ یہ بتاتے ہوئے ڈرائیور کے لہجے کی بیزاری صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔
ایسا کیوں تھا؟ وہ تب بھی سمجھ نہیں پائی تھی!
پُررونق حویلی میں زندگی کی ہلچل کیوں رک گئی تھی؟ روشنیوں کی چکاچوند اندھیروں میں کیوں بدل گئی تھی؟ مانوس مشفق چہروں کی جگہ اجنبی اور سرد مہر صورتوں نے کیوں لے لی تھی؟
یہ معمہ اب بھی اُس کی سمجھ سے باہر تھا!



روتے روتے ہی اُسے خیال آیا۔ انکل جہانگیر موجود نہیں تھے۔ وہ ماموں جان سے تو بات کر سکتی تھی۔
آنسو پونچھتے ہوئے وہ بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گئی۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھے فون کا ریسیور اُٹھایا اور نمبر ڈائیل کرنے لگی۔ مگر جانے کیوں نمبر مل ہی نہیں رہا تھا۔ مایوس ہوتے ہوئے وہ اُٹھی۔ الماری میں رکھے پرس میں سے اپنا سیل فون نکالنا چاہا مگر اُسے حیرت ہوئی سیل فون وہاں نہیں تھا۔ بہرحال ___
اُس نے سوٹ کیس سے کپڑے نکالے، واش روم گئی، گرم پانی سے نہائی، نرم و گرم ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے، بال برش کئے ہی تھے کہ وہی ملازم جو اُس کا سامان گاڑی سے لایا تھا اُس کے لئے چائے لے کر آ گیا۔
''فون خراب ہے کیا؟'' شنذی نے اُس سے پوچھا۔
''جی نہیں۔ آپ زیرو ڈائیل کریں۔ مسز علی آپ کو مطلوبہ نمبر ملا کر دے دیں گی۔''
تو ___ فون بھی مسز علی کے قبضے میں تھا!
اُس نے اِرادہ ترک کر دیا۔ چائے بنائی اور کپ اُٹھاتے ہوئے بالکنی میں آ کھڑی ہوئی۔
رات کی تاریکیاں گھر آئی تھی، دور حویلی کے گیٹ کی بتیاں جلا دی گئی تھیں اور ساکن ساکن سے گارڈز نے جابجا پوزیشن سنبھال لی تھی!
اُس کا ذہن مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ تصور میں جو اُس نے دیکھا تھا۔ کہ وہ گھر پہنچے گی تو انکل جہانگیر اور اُن کی فیملی ہو گی۔ ماموں جان اور اُن کا پورا خاندان ہو گا۔ ماما الفت ہوں گی۔ اکرم بابا ہوں گے۔ خاندان کے دُکھی لوگ خود روتے ہوئے اُس کے آنسو پونچھیں گے۔ اُسے تسلی دیں گے، ڈھارس بندھائیں گے۔ وہ جو پردیس میں پاپا کے ڈیتھ کی خبر سن کر تڑپی تھی، اُس کا مداوا ہو گا۔ اُسے صبر آئے گا۔ ایسا کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا۔ سرے سے کوئی تھا ہی

نہیں۔ ماما الفت، جو اُسے رو رو کر پاپا کے ڈیتھ کی تفصیل بتاتیں، اکرم بابا جو اُس
کے سر پر ہاتھ رکھ کر اپنے آنسو روک نہ پاتے۔ کہیں بھی تو نہیں تھے دونوں!

آنسو لڑھک کر اُس کے گالوں پر آ رہے۔ وہ واپس کمرے میں آ گئی۔
چائے کا کپ جوں کا توں میز پر رکھ دیا۔ تھکے تھکے بے جان سے قدم اٹھاتی
دروازہ کھول کر وہ کوریڈور میں آ گئی۔

حویلی میں گہرا سناٹا تھا۔ ہر سُو تاریکیوں کا راج تھا۔

پتہ نہیں کیوں؟ اپنا گھر ہوتے ہوئے بھی اُسے خوف سا محسوس ہونے لگا۔ خود
اپنے قدموں کی آہٹ پراسرار سی لگنے لگی۔

چلتے چلتے وہ پاپا کے کمرے پر آ کر رک گئی۔ دروازہ کھولنے کا ارادہ کیا ہی
تھا کہ 'چرررر' کر کے پٹ خود بخود وا ہو گیا۔ اُسے جھرجھری سی آ گئی۔

سامنے ہی پاپا کا بیڈ دیکھا۔ تو سب بھول بھال گئی۔ اُن کے تکیوں سے لپٹ
کر چیخ چیخ کر رونے لگی۔

''پاپا آپ کیوں چلے گئے۔ میں آپ کے بغیر کیسے رہوں گی... پاپا میں
بالکل اکیلی ہوں... مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے... بہت اندھیرا ہے پاپا...''

وہ روتے روتے بے سدھ ہو گئی۔

دفعتاً اُس نے اپنے کندھے پر ہاتھ کا دباؤ محسوس کیا۔ خوفزدہ سی ہوتے
ہوئے اُس نے رخ موڑ کر دیکھا۔ مسز علی تھی!

''ڈائننگ ہال میں آپ کا کھانا لگا ہے کھا لیجئے گا''۔ اُس نے اطلاع دی
اور ــــ دھیرے دھیرے چلتی باہر نکل گئی۔

نہ مسز علی نے کمرے کی لائیٹ آن کی تھی نا ہی شندی نے آن کی۔ اسی طرح
باہر نکل آئی۔ کوریڈور میں واپس چلتے ہوئے اُس نے محسوس کیا وہ بے حد تھکی ہوئی
تھی۔

پپ کمرے کے آگے سے گزرنے لگی تو اُسے خیال آیا اتنی بڑی خالی حویلی



اور وہ بالکل تنہا۔ رات اکیلے سوتے ہوئے اُسے ڈر لگے گا۔ مگر ــــ کس سے کہے؟
نہ ماما الفت تھیں نہ اکرم بابا نہ باقی ملازموں کی ریل پیل۔ صرف ایک ملازم تھا
اور ــــ مسز علی۔ دونوں جیسے روبوٹ تھے۔ سپاٹ لہجے میں روکھی سی بات کی اور
چل دیئے۔

آج ڈائننگ ٹیبل پر پاپا کی سیٹ خالی تھی۔ وہ پھر رو دی۔ ایک نوالہ بھی حلق
سے نہیں اُترا۔ اُٹھ کر وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ رات کے کپڑے تبدیل کئے اور
بستر میں لیٹ گئی۔ تھکی آنکھیں موند کر سونے کی کوشش کی مگر ــــ حویلی کا بدلہ بدلہ
نقشہ ذہن پر چھایا رہا۔ نہ نیند آئی نہ کچھ سلجھا سکی۔

تبھی ــــ مسز علی ٹرے میں دودھ کا گلاس لئے آ گئی۔ کوئی بھی دستک دیئے بنا
، کوئی بھی آہٹ کئے بغیر۔

''یہ دودھ پی لیجئے گا''۔ اُس نے گلاس میز پر رکھتے ہوئے میکینیکل انداز
میں کہا اور ــــ

اپنی مخصوص دھیمی چال چلتی باہر نکل گئی۔

وہ بستر سے اُٹھ آئی۔ صوفے پر بیٹھی۔ اور نہ چاہتے ہوئے بھی گلاس
اُٹھا کر منہ سے لگا لیا۔ کہ وہ کئی گھنٹے سے بھوکی پیاسی تھی اور سخت نقاہت محسوس
کر رہی تھی۔

واش روم جا کر اُس نے دانت برش کئے، واپس آئی، لائیٹ آف کی
اور بستر میں گھس گئی۔

مسز علی کا رویہ سمجھ میں نہ آنے والا تھا۔ روکھا روکھا اور جیسے بھید سے لئے تھا۔
اُسے اکیلے میں خوف آنے لگا۔ ہر چیز پُراسرار نظر آنے لگی۔ سنسان حویلی،
ساکت ساکت سے چوکیدار اور سب سے بڑھ کر چلتی پھرتی زومبی ــــ مسز علی!

تکیوں سے چمٹتے ہوئے اُس نے آنکھیں سختی سے میچ لیں۔

معاً ــــ سائیڈ ٹیبل پر رکھے فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔

وہ اچھل کر رہ گئی۔ بمشکل ہاتھ بڑھا کر ریسیور اُٹھایا۔

''جہانگیر حیدر صاحب سے بات کریں''۔ مسز علی کی مکروہ سی آواز سنائی دی۔

مگر___ انکل جہانگیر کا سن کر اُس کی جان میں جان آ گئی۔

وہ ضروری آفیشل کام سے کراچی گئے تھے۔ اُنہیں افسوس تھا کہ اُسے خود ریسیو نہ کر سکے۔ آنٹی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے ڈاکٹر سے چیک اَپ کروانے ساتھ گئی تھیں۔ وہ چونکہ کام میں مصروف تھے اِس لئے ثانیہ، ناجیہ اور سرفراز بھائی آنٹی کو سنبھالنے ساتھ گئے تھے۔ مسز علی بقول اُن کے بہت اچھی خاتون تھی۔ اب چونکہ شاندانہ اکیلی رہ گئی تھی، اور بے شمار املاک کی اکلوتی وارث تھی اور پیسہ ہی چونکہ انسان کا سب سے بڑا دشمن رہا ہے۔ اِس لئے اب اُسے بے انتہا احتیاط برتنا تھی۔ ایسے میں مسز علی جیسی مضبوط عورت ہی اُس کا بہتر خیال رکھ سکتی تھی۔ فون بھی اُس کی تحویل میں اِس لئے دیا گیا تھا کہ اب وہ اکیلی تھی اور ڈائریکٹ کالز اُس کی پریشانی کا سبب بن سکتے تھے۔ ماما الفت، اکرم بابا، پرانے ملازم و چوکیدار سب نمک حرام تھے۔ اِس لئے اُن کو نکال باہر کیا گیا تھا...

سلسلہ منقطع ہوا تو اُس نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ سر ایک بار پھر تکیوں میں دے کر آنکھیں موندلیں۔

انکل کی آواز سن کر اُس میں ہمت آ گئی تھی، وہ روئی تھی تو اُنہوں نے اُسے تسلی دی تھی۔ حوصلہ دیا تھا، دنیا کی اونچ نیچ سمجھائی تھی اور___ کہ اِسے ہی زندگی کہتے ہیں!

''پیسہ ہی انسان کا سب سے بڑا دشمن رہا ہے۔ تمہیں بے انتہا احتیاط برتنا ہو گی...'' اُس کے کانوں میں انکل کی آواز گونجی۔

اُس کی سینکڑوں کروڑوں کی جائیداد تھی۔ امی کی پہلی شادی ایک



Millionaire سے ہوئی تھی۔ امی خود بھی ایک کھاتے پیتے باعزت گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ پڑھائی کے دوران داؤد صاحب کو کچھ ایسی بھا گئی تھیں کہ ڈیڑھ سال سے ہوئی اپنی منگنی تڑوا کر اپنے خاندان والوں کی مخالفت کے باوجود اُن سے شادی کر لی۔ شادی کے بعد البتہ اُن لوگوں نے امی کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اکلوتے بیٹے کی بیوی تھیں۔ سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ مثالی خاندان اور مثالی شادی تھی۔ مگر امی کو اتنی خوشیاں راس نہ آئیں۔ سال بھر بعد ہی روڈ ایکسیڈنٹ میں سب ختم ہو گئے۔ ساس، سسر، بیٹا، سبھی۔ امی پتہ نہیں کیسے معجزانہ طور پر بچ گئیں۔ اکیلی امی پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ اپنے پرائے سب کی نظر اُن کے شوہر کی بے پناہ دولت پر لگی تھی۔ طرح طرح سے پریشان کرنے لگے۔ گھر سے باہر نکلتیں تو ہراساں کرتے۔ فون کالز کر کر کے ڈراتے دھمکاتے۔ زندگی دوبھر ہو کر رہ گئی تھی۔ نانا انتقال کر چکے تھے۔ ایک بھائی تھا وہ بھی اپنے بکھیڑوں میں الجھا تھا۔ ایک بڑی سوتیلی بہن شادی کے بعد کینیڈا میں قیام پذیر کبھی پیچھے مڑ کر ہی نہیں دیکھا تھا۔ نانی کو اپنے دکھ بتا کر وہ اِس عمر میں اُنہیں پریشان کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ دل کا حال بتاتیں بھی تو کس کو؟

مگر نانی ماں تھیں۔ اُنہوں نے نہیں بھی بتایا پھر بھی سب سمجھ گئیں۔

زندگی کے برسہا برسوں کے تجربے کی روشنی میں اُنہوں نے امی کو کسی مضبوط سہارے کا مشورہ دیا۔ اور دور پار کے جاننے والوں میں نکاح کے دو بول پڑھا کر اُنہیں پاپا کی حفاظت میں دیدیا۔

پاپا ایک شریف انسان تھے۔ بیرسٹر تھے۔ جتنے اچھے خود تھے اتنے ہی اچھے شوہر ثابت ہوئے۔ امی سے بے لوث محبت کی۔ اُن کے لامحدود املاک کی نہایت ایمانداری سے دیکھ بھال کی۔

شاندانہ پیدا ہوئی تو لگا دونوں مکمل ہو گئے۔ ہر طرف سکون تھا اطمینان تھا۔ زندگی ایک خوبصورت ڈگر پر چل نکلی تھی۔ حویلی میں اُس کی وجہ سے چہل پہل

ہوتی تھی، رونق ہوتی تھی۔ امی اور پاپا کے علاوہ نوکر چاکر بھی تو جان چھڑکتے تھے اُس پر۔ پھر وہ شہر سکول جانے لگی۔ وقت دھیرے دھیرے سرک رہا تھا۔ وہ بارہ سال کی تھی کہ اچانک ایک دن امی کا ہارٹ فیل ہوگیا۔ پاپا اور وہ اکیلے رہ گئے۔ لگتا تھا وہ اور پاپا یہ صدمہ برداشت نہ کر پائیں گے۔ مگر انسان بہت سخت جان واقع ہوا ہے۔ وقت ہولے ہولے مرہم لگاتا گیا اور اُن دونوں نے ایک بار پھر زندگی سے سمجھوتہ کرلیا۔ پاپا کی ساری توجہ شندی پر مرکوز ہوگئی تھی۔ ماما الفت بھی اولاد سے کم خیال نہ رکھتی تھیں۔ اکرم بابا بھی بہت محبت کرتے تھے اُس سے۔ انکل جہانگیر، آنٹی، تانیہ ناجیہ، سرفراز بھائی اور اسی طرح ماموں جان، ممانی جان، فاریہ، شاہد بھائی اور فہد بھائی بھی ہمیشہ کی طرح گاہے گاہے ملنے آتے رہتے۔ اور یوں ــــ زندگی رواں دواں تھی۔

اے لیولز کے بعد وہ پاپا سے اپنی خواہش منوا کر لنڈن گئی۔ اور واپس آئی تو اپنے بہت ہی پیارے پاپا کو ہمیشہ کے لئے کھو چکی تھی۔

حویلی وہ حویلی ہی نہیں رہی تھی۔ ہر نگاہ اجنبی تھی۔ اُسے اپنا آپ بھی اجنبی اجنبی سا لگنے لگا۔

تھکا ذہن تھکی روح لئے جانے کس پہر اُس کی آنکھ لگ گئی۔





اُسے آئے آج دسواں دن تھا۔ اس دوران اُسے اپنے اوپر لگی اور بہت سی پابندیوں کا پتہ چل گیا تھا۔ حویلی کے باہر ایک خاص حد کے بعد وہ آگے نہیں جا سکتی تھی۔ سورج غروب ہونے سے پہلے حویلی کے دروازے بند ہوجانے کے بعد وہ اُنہیں کھلوانے پر قادر نہ تھی۔ اُس کی کسی دوست کا فون نہیں آسکتا تھا۔ نہ ہی اُسے اجازت تھی اُنہیں کونٹیکٹ کرنے کی۔ نہ اُس کی کوئی دوست اُسے ملنے آسکتی تھی۔ نا ہی وہ کہیں جاسکتی تھی۔ حتیٰ کہ تک نواز اور مسز علی کے علاوہ باہر کسی چوکیدار تک سے بات کرنے کی مجاز نہ تھی۔

بہرحال ــــ آج وہ بہت خوش تھی۔ رات ماموں جان کا فون آیا تھا۔ اُنہیں کل ہی اُس کے آنے کا پتہ چلا تھا۔ اور آج وہ بمعہ اہل وعیال اُس سے

ملنے آ رہے تھے۔ یہ بھی غنیمت تھی کہ اُن کے آنے پر پابندی نہیں عائد کی گئی تھی۔

وہ شدت سے اُن لوگوں کی منتظر تھی۔ وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے کا تو راستہ تھا۔ ختم کیوں نہیں ہو رہا تھا؟

وقت گزارنے کے وہ اپنے بک ریک سے ایک دلچسپ ناول نکال کر بالکنی میں دھوپ میں آ بیٹھی۔ پھر ـــ وہ بے خبر ہو گئی۔

دور گیٹ میں اُن کی گاڑیاں داخل ہوئیں۔ تو اُس کی محویت ٹوٹی۔

وہ دوڑتی ہوئی نیچے گئی۔ وہ سب حویلی کے انٹرنس میں داخل ہو چکے تھے۔

سب سے پہلے وہ ماموں جان سے ملی۔ اُن کے گلے لگ کر زاروقطار رونے لگی۔ پاپا کی جدائی کی وجہ سے بھی اور اپنے اوپر عائد کی گئی افتاد کی وجہ سے بھی۔

پھر باری باری سب سے ملی۔ ممانی جان اور فاریہ کے علاوہ شاہد اور فہد بھائی بھی بمعہ اپنے اہل وعیال کے آئے تھے۔

وہ سب ڈرائینگ روم میں بیٹھ گئے۔ چائے کے دوران ماموں جان اور ممانی جان پاپا کی اچانک ڈیتھ کے بارے میں ہی باتیں کرتے رہے۔ اُسے تسلی دیتے رہے۔ صبر کی تلقین کرتے رہے۔ اُسے واقعی بہت ڈھارس ملی تھی اُن کے آنے سے۔

لنچ پر بھی باتیں ہوتی رہیں۔ پاپا کی بھی، دور نزدیک کے رشتہ داروں کی بھی، دوستوں کی بھی، جان پہچان والوں کی بھی ـــ مسز علی اپنی مخصوص مُردنی چال اور پراسرار آنکھیں لئے یہاں وہاں سے گزرتی نظر آ رہی تھی ـــ مجسم راز تھی جیسے!

کھانے کے بعد ماموں جان اور ممانی جان تھوڑی دیر کو ستانے بیڈ روم میں چلے گئے۔ باقی سب پچھلی طرف لان میں دھوپ میں بیٹھ کر گپ شپ کرنے لگے۔

شندی نے چپکے چپکے فاریہ کو سب بتا دیا۔ حویلی کا یکسر بدلا ماحول، اُس پر عائد کی گئی بے شمار پابندیاں اور ـــ مسز علی کا روکھا اور پراسرار رویہ! پاپا کی



ڈیتھ کا غم تو ایک طرف وہ تو اپنے ہی گھر میں غیر بنا دی گئی تھی۔ مسز علی ہی مختارِ کل تھی!

اپنے اُوپر آئی مصیبتوں کا ذکر کرتے کرتے وہ ایک بار پھر رو دی۔ فاریہ نے اُسے تسلی دی کہ وہ ابو سے بات کرے گی۔ اور وہ اِس مسئلے کا کوئی حل نکالنے کی کوشش کریں گے۔

وقت بہت اچھا کٹا۔ وہ لوگ اُس کی خاطر شام ڈھلے تک رکے رہے۔ مگر جانا تو تھا۔ صبح سب نے اپنے اپنے آفس بھی جانا تھا۔ ماموں جان نے اُسے ڈھیروں تسلیاں دیں۔ اُسے اپنی املاک سنبھالنے کا حوصلہ اور درازیٔ عمر کی دعائیں دیں۔ ممانی جان نے بھی کچھ کم ہمت نہیں بندھائی۔ پھر سب نے اُسے اپنے یہاں آنے کی پرزور دعوت دی۔ اور رخصت ہو گئے۔

بھرپور دن گزارنے کے بعد ایک بار پھر تنہائی کے عذاب سے خوفزدہ وہ اندر کی طرف بڑھی۔

سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ تو اچانک ـــ ٹانگیں بے جان سی محسوس ہوئیں۔ اُس نے ریلنگ کا سہارا لیا اور دھیرے دھیرے چلتی اوپر اپنے کمرے میں آ گئی۔

لائیٹ آن تھی۔ انگیٹھی میں بڑی بڑی لکڑیاں جل رہی تھیں۔ ماحول خاصا کوزی تھا۔

اُس نے انٹرکوم پر کچن سے چائے منگوائی اور ـــ شال لپیٹتی حسب معمول بالکنی میں آ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

بلا مقصد اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتی رہی۔ ذہن اب بھی اسی اُدھیڑ بن میں مصروف تھا۔ اُسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ سب کیا تھا؟ کیوں تھا؟

معاً اُسے خیال آیا۔ ماموں جان اور سب نے اُسے اپنے گھر آنے کی دعوت دی تھی۔

اُسے یکدم ہی بہت ساری خوشی کا احساس ہوا۔ اُن کے یہاں جانے پر یقیناً

کوئی روک ٹوک نہیں ہوتی تھی۔

تبھی دروازے پر دستک ہوئی۔ نواز اُس کے لئے چائے لیکر آیا تھا۔

برتن اُس کے آگے میز پر لگا کر وہ خالی ٹرے لئے واپس جانے لگا۔

''مسز علی کو بھیجو''۔ شندی نے کہا۔

اور۔۔۔ تھوڑی ہی دیر میں مسز علی بغیر دستک دیئے، بغیر کوئی کھٹکا کئے اپنی مخصوص وضع قطع میں اُس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ بولی کچھ نہیں، بس آر پار ہوتی نظریں اُس پر جما دیں۔

''مسز علی۔ میں اپنے ماموں کے گھر تو جا سکتی ہوں نا''۔

اُسے امید تھی اُس کا جواب 'ہاں' میں ہوگا۔ کہ ماموں جان کے یہاں آنے پر بھی کوئی پابندی نہیں لگائی گئی تھی۔

''سوری ۔ آپ وہاں نہیں جا سکتیں''۔ مسز علی اپنے مشینی لب ولہجے میں بولی۔

''کیوں؟'' وہ چڑ ہی گئی۔

''مجھے یہی حکم ہے''۔

''کیا میں اپنے ہی گھر میں قیدی بن کر رہوں گی''۔ وہ جھنجلا اُٹھی۔

''کم از کم جہانگیر حیدر صاحب کے آنے تک تو ایسا ہی ہوگا۔'' اُس نے کہا۔ اور واپس مڑتے ہوئے چل دی۔

مارے غصے اور بے بسی کے اُس سے چائے بھی نہیں پی گئی۔

جھنجلائی جھنجلائی سی۔۔۔ وہ پھر سے آس پاس دیکھنے لگی۔ ۔ور بھاری آہنی گیٹ کی بتیاں جلا دی گئی تھیں اور۔۔۔ اِدھر اُدھر کئی چوکیدار حرکت میں آ گئے تھے۔

اُس نے یہ بات بھی نوٹ کی تھی۔ پاپا کے وقتوں میں حویلی کے اِرد گرد کوئی چار چوکیدار پہرہ دیا کرتے تھے۔ مگر اِن دنوں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بہت



سارے چوکیدار اسلحہ سنبھالے کھڑے رہتے تھے۔ کیا یہ سب بھی اُسی پر نگران تھے؟ وہ سوچے بنا نہ رہ سکی!

رات کی تاریکیاں گھر آئیں، سردی چبھنے لگی، تو وہ اندر چلی آئی۔

آگ کے قریب صوفے پر بیٹھی میگزین کے اوراق الٹ پلٹ کر رہی تھی۔ کہ نواز نے آ کر ڈنر لگنے کی اطلاع دی۔

اُس نے بے دلی سے تھوڑا سا کھانا کھایا۔ اور واپس بیڈروم میں آ گئی۔

کچھ دیر یوں ہی ٹی وی پر مختلف چینلز بدل بدل کر دیکھتی رہی۔ مسز علی اُس کے لئے دودھ لے آئی۔ تو اُس نے ٹی وی آف کر دی اور۔۔۔ دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اب وہ اندر سے کنڈی لگانے لگی تھی۔ کہ کون تھا جس کے لئے وہ دروازہ کھلا چھوڑتی۔ پہلے تو پاپا ہوتے تھے جو رات کو وقت بے وقت اُس کی خبر لینے چلے آتے تھے۔ اور پھر اب تو اُسے مسز علی سے بھی خوف آتا تھا۔ پتہ نہیں کیوں؟

دودھ پی کر وہ کپڑے بدلنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ لائیٹ چلی گئی۔ بجلی کو پتہ نہیں کیا ہو گیا تھا۔ بار بار چلی جاتی تھی۔ اور بقول مسز علی جنریٹر خراب تھا۔ اُس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھی بڑی سی کینڈل جلائی۔ ڈریسنگ روم جا کر کپڑے تبدیل کئے۔ نائیٹ سوٹ پہنا، واپس آئی۔ بستر میں گھسی اور سرہانے رکھا ادھورا چھوڑا کیتھرین اینڈرسن کا 'Forever After' اٹھا کر کینڈل لائیٹ میں ہی پڑھنے لگی۔

رات کا ایک بج گیا۔ تو اُس نے کتاب بند کر کے سائیڈ ٹیبل پر رکھی اور موم بتی بجھاتے ہوئے بستر میں لیٹ گئی۔

دو بجنے کو تھے کہ اچانک کوریڈور میں کسی کے چلنے کی آہٹ سے اُس کی آنکھ کھل گئی۔

اِس وقت کون ہو سکتا تھا؟ مین دروازہ تو وہ خود اپنے ہاتھ سے بند کر کے آئی

تھی۔

وہ اُٹھی۔ صوفے کی پشت پر سے شال اُٹھا کر کندھوں پر لی۔ دروازے کا بولٹ کھولتے ہوئے ذرا سا وا کر کے دیکھا___

کوئی عورت تھی۔ اِس طرف پیٹھ تھی۔ گھٹنوں سے نکلتے کھلے بال لئے، موم بتی روشن کیئے، آہستہ آہستہ کوریڈور میں چلی جا رہی تھی۔

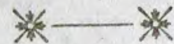
دروازہ کھلنے کی آہٹ پر عورت ہولے سے مڑی۔ ہاتھ میں پکڑی موم بتی کی روشنی میں وہ کوئی بدروح لگ رہی تھی۔ وہ پراسرار انداز میں قدرے مسکرائی اور رخ واپس موڑتے ہوئے دھیرے دھیرے آگے بڑھ گئی۔

شندی کے کاٹو تو لہو نہیں تھا بدن میں۔ خوف اُس قدر غالب تھا کہ آواز تک نہ نکل رہی تھی۔ بمشکل دروازہ بند کیا۔ اور بستر میں گھستے ہوئے تکیوں سے چمٹ کر آنکھیں میچ لیں۔

پہلے ہی دن جب وہ گھر لوٹی تھی تو ڈنر سے قبل کوریڈور میں چلتے چلتے پاپا کے کمرے پر جا کر رک گئی تھی۔ دروازہ کھولنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ 'چرررریں' کر کے پٹ خود بخود وا ہو گیا تھا۔ تب بھی اُسے جھرجھری سی آ گئی تھی۔ پھر سامنے ہی پاپا کا بیڈ دیکھا تو بھول بھال گئی سب۔ بعد میں اس واقعے کو اپنا وہم سمجھ کر بھلا دیا۔

مگر___ ابھی ابھی___ یہ عورت!

خوف سے تھر تھر کانپتی لحاف میں سر منہ لپیٹے وہ بستر سے چمٹی رہی اور___ رات بیتتی چلی گئی۔





چند دن اور گزر گئے۔ وہی صبح وہی شام۔ صبح اُس کا ناشتہ کمرے میں آتا۔ بعد میں کپڑے وغیرہ تبدیل کر کے وہ نیچے اندرونی لان میں دھوپ میں آ بیٹھتی۔ کوئی کتاب پڑھتی یا یوں ہی خالی خالی نظروں سے خلاؤں میں تکتی رہتی۔ لنچ کے بعد آرام کرتی۔ شام چائے پینے کے بعد تھوڑا سا حویلی کے باہر نکل جاتی۔ یا پھر اپنی بالکنی میں ہی پوری شام گزار دیتی۔

وہی سائیں سائیں کرتی حویلی تھی، وہی پابندیاں تھیں، اور وہی سربستہ راز! اب تو اُس نے پوچھ گچھ یا تگ و دو ہی چھوڑ دی تھی۔ بس انکل جہانگیر کے آنے کا انتظار تھا۔ جو طویل سے طویل تر ہوتا جا رہا تھا۔ آنٹی کے کچھ مزید چیک اپ کرنا تھے۔ ساتھ ہی رپورٹس کا انتظار تھا۔ اِس لئے اُن لوگوں کا قیام اور بھی

بڑھ گیا تھا۔

دوپہر کو سو کر اٹھی تو ساڑھے چار بج رہے تھے۔ وہ واش روم میں گئی۔ گرم پانی کا شاور لیا تو طبیعت بشاش ہوگئی۔ موو رنگ کے گرم کپڑے پہنتے ہوئے اُس نے بال برش کئے۔ وائیٹ خوبصورت جیکٹ پہنی اور بالکنی میں آ کھڑی ہوئی۔

اِردگرد نگاہ دوڑائی۔ فطرت سے سرگوشیاں کرتے مناظر نے اُسے مسحور کر لیا۔ اچھا تھا اُسے بالکنی میں آنے کی اجازت تھی۔ ورنہ اِس پر بھی پابندی ہوتی تو وہ کیا کر سکتی تھی!

سورج دور اُس پار سرئی پہاڑ کے پیچھے غروب ہو رہا تھا۔ گھنے قدآور درخت چپ چاپ ایستادہ تھے اور۔۔۔ تاحدِ نگاہ پھیلی سرسوں ڈوبتے سورج کا سیندور چرائے لئے جا رہی تھی۔

حسبِ معمول یہاں وہاں گارڈز چوکس کھڑے تھے۔ دور آہنی گیٹ پر بھی پہرہ تھا اور۔۔۔ حیرت سے اُس نے دیکھا آج حویلی کے مین چوبی دروازے پر بھی ایک گارڈ کھڑا تھا۔

اگر یہ سب اُس ایک اکیلی جانِ ناتواں کے لئے کیا گیا تھا تو اُسے ایسا کرنے والے کی بزدلی پر ہنسی آ رہی تھی!

اندر واپس کمرے میں آتے ہوئے اُس نے اپنے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر سے رات والا ناول اٹھایا اور بالکنی میں آ کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے پڑھنے میں محو ہوگئی۔

تبھی نواز اُس کے لئے چائے لے کر آ گیا۔ برتن اُس کے آگے میز پر لگائے، خالی ٹرے لی اور خاموشی سے واپس چل دیا۔

شام کی چائے کے ساتھ وہ اور پاپا ضرور ہلکی پھلکی سنیکس لیا کرتے تھے۔ کبھی سینڈوچز، کبھی فِش فنگرز، کبھی کوئی عمدہ کیک۔ مگر اب تو جیسے وہ بھول ہی چکی تھی یہ سب۔ نہ اِن لوگوں نے کبھی کچھ آفر کیا۔ نہ اُس نے کوئی فرمائش کی۔ اور پھر۔۔۔ پاپا بھی تو نہیں تھے۔ وہ اکیلی کیا کھاتی؟



کپ میں چمچ چلاتے چلاتے دو آنسو لڑھک کر اُس کے گالوں پر آ رہے۔

''پاپا آپ کے بغیر میری زندگی نامکمل ہے۔ آپ کے بغیر میں زندگی Manage نہیں کر پا رہی۔ آپ کے بغیر میں جیوؤں گی کیسے پاپا؟''

بھیگے گال انگلیوں کی پوروں سے خشک کرتے ہوئے اُس نے کپ اٹھالیا۔

کھیتوں کے اُس پار سرئی پہاڑ کے دامن میں اُن کے مزارعوں کی کچی پکی بستی میں شام کی پکوان کے دھوئیں اٹھنے لگے تھے، تھکے ہارے گڈریئے اپنے ریوڑ ہانکتے گھروں کی طرف چل دیئے تھے اور۔۔۔ دن بھر کے نڈھال پنچھی اپنے اپنے آشیانوں کی سمت رواں دواں تھے!

چائے پیتے پیتے وہ پھر سے کتاب کے اوراق پلٹنے لگی۔ بہت دلچسپ ناول تھا۔ وہ جلدی ہی محو ہوگئی۔

شام گہری ہونے لگی، سردی کاٹنے لگی، تو اُس نے کتاب بند کر دی۔ ایک نظر آس پاس ڈالی۔ ملگجا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ مگر اب تک اِردگرد کوئی بھی بتی روشن نہیں ہوئی تھی۔ چوکیدار بھی جیسے سارے کے سارے بیک وقت چھٹ گئے تھے۔ وہ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ کمرے میں داخل ہونے کو تھی کہ۔۔۔

بائیں جانب سائیں سائیں کرتے درختوں میں اُسے پاپا جاتے دکھائی دیئے۔ یہ کیسے ممکن تھا؟

ایک منجمد کر دینے والی لہر اُس کی ریڑھ کی ہڈی میں سے تیر گئی۔

وہ جلدی ہی درختوں میں نظروں سے اوجھل ہوگئے۔

خود کو سنبھالتی وہ کمرے میں آ گئی۔ لائیٹ آن کی۔ اور بیچ کمرے میں کھڑی دیر تک اپنے واہمے پر پریشان رہی۔

دھیان بٹانے کو انگیٹھی میں جلتی لکڑیوں کی آگ کے قریب صوفے پر بیٹھتے ہوئے وہ پھر سے ناول پڑھنے لگی۔

چند ہی صفحے باقی تھے کہ نواز نے آ کر ڈنر لگنے کی اطلاع دی۔

وہ صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ جانے کیوں اُسے چکر سا آ گیا۔ فوراً صوفے کا بازو تھام لیا۔ کتنی کمزوری ہو رہی تھی اُسے۔ طبیعت ذرا بحال ہوئی تو وہ نیچے ڈائننگ ہال میں آ گئی۔ کھانا کھا ہی رہی تھی کہ حسبِ معمول لائیٹ چلی گئی۔ ہر سو گھپ اندھیرا چھا گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں نواز سفید بڑی سی جلتی کینڈل لے آیا۔ کینڈل ہولڈر میں اُسے فِکس کیا۔ اور چلتا بنا۔

اُسے حیرت ہو رہی تھی کہ چھ کینڈل ہولڈرز جن میں ہمہ وقت کینڈلز فکسڈ اور لائیٹر ساتھ ہوتا تھا۔ اب ایسا کیوں نہیں ہوتا تھا؟

بہرحال ۔۔۔ وہ پھر سے کھانا کھانے لگی۔ کینڈل ہی سے اُسے یاد آیا۔ کل اُس کی بہت ہی پیاری دوست ناہید کی برتھ ڈے تھی۔ ساتھ ہی اُسے سخت مایوسی ہوئی۔ وہ تو اُسے فون پر بھی گریٹ نہیں کر سکتی تھی۔ ناہید نے بھی تو اُسے کونٹیکٹ کرنے کی کوشش کی ہوگی۔ اُسے یقیناً پاپا کی ڈیتھ کا علم ہوگا۔ اور یہ بھی اندازہ ہوگا کہ وہ ضرور پاپا کی ڈیتھ پر آئی ہوگی۔ برتھ ڈے پر انویٹیشن نہ سہی اُس کے پاپا کی ڈیتھ پر تو اُس کے پاس آنے کی بھی کوشش کی ہوگی مگر ۔۔۔ یہاں تو کایا ہی پلٹ گئی تھی۔ راز کیا تھا؟ انکل جہانگیر کے آنے پر ہی پتہ چلنا تھا!

اِس وقت پھر اُس کی خوبصورت آنکھیں نم ہو گئیں۔ اب تو آنسوؤں نے پلکوں پر ہی بسیرا کر لیا تھا جیسے!

نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے وہ اپنے کمرے کی طرف چل دی۔

کتنی ویرانی تھی! کتنی تاریکی! کوریڈورز میں جابجا موم بتیوں کے فانوس بھی تھے مگر ۔۔۔ مسز علی اور نواز ۔۔۔ شاید اُنہوں نے غور ہی نہیں کیا تھا۔ خود وہ ۔۔۔ پاپا کے بعد اور ۔۔۔ انکل کے انتظار میں ۔۔۔ بس وقت ہی کاٹ رہی تھی۔ کسی چیز میں کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔

جیسے تیسے کر کے وہ کمرے میں پہنچی۔ یہاں البتہ کینڈل روشن تھی۔ اُس نے نجات کی سانس لی۔ ایک نظر ٹی وی پر ڈالی۔ لائیٹ ہی نہیں تھی تو ٹی وی کیا آن



ہوتی!

خیر ۔۔۔ وہ ڈریسنگ روم گئی۔ رات کے کپڑے پہنے۔ واپس کمرے میں آئی۔ تو مسز علی اُس کے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر دودھ کا گلاس رکھ چکی تھی۔

بستر میں گھستے ہوئے اُس نے پشت تکیوں سے ٹکا لی۔ اور ناول کے باقی چند صفحات کینڈل کی روشنی میں پڑھنے لگی۔

بہت انٹرسٹنگ کہانی تھی۔ جلدی ہی اُس نے ختم کر لی۔ دودھ پیا، دانت برش کیے اور ۔۔۔ کینڈل بجھا کر نرم و گرم فلفی لحاف اچھی طرح اوڑھتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

معاً ۔۔۔ اُس کی نظروں میں شام بالکنی سے اندر کمرے میں آتے آتے بائیں جانب درختوں میں پاپا کا ہیولہ گھوم گیا۔

پٹ سے اُس کی آنکھیں کھل گئیں۔

کبھی پاپا کے کمرے کے دروازے کا پٹ 'چرررر' کر کے خود بخود وا ہو جانا، کبھی کسی عورت کا کوریڈور میں چلنا، اور آج شام پاپا کا گھنے درختوں میں نظر آنا!

کہیں اُس کا وہم تو نہیں تھا یہ سب؟ سنسان سنسان حویلی اور پراسراری مسز علی سے دل ہی دل میں خائف اور سہمی سہمی رہتی تھی۔ یہ سارا خوف کہیں لاشعور میں بس کر گاہے گاہے اِن واقعات کی شکل میں تو سامنے نہیں آ رہا تھا؟

جتنا سوچتی تھی اُتنا ہی ڈر محسوس ہو رہا تھا۔ اُس نے خیال جھٹک دیا۔ آنکھیں ایک بار پھر بند کر لیں۔ آہستہ آہستہ غنودگی نے آ لیا۔

'ٹک ... ٹک ... ٹک ...'

اُس کی آنکھ کھل گئی۔ کوریڈور میں پاپا کے بُوٹس کی آہٹ تھی۔ پاپا کے قدموں کی چھاپ!

اُسے لگا آج وہ زندہ نہیں بچے گی۔ خوف اُسے مار ڈالے گا۔ اُس کا دل

پنجر توڑ کر باہر آنے لگا۔

قدموں کی آہٹ آہستہ آہستہ معدوم ہوگئی۔ وہ بستر میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔

اُسے نیچے جانا چاہئے تھا۔ مسز علی اُسے ویلکم کرے نہ کرے۔ اُس کا اُس کے پاس ہونا ضروری تھا۔ کوئی بھی اور واقعہ ہوا تو وہ یقیناً برداشت نہ کر پائے گی۔

ہمت اکٹھی کر کے وہ بستر سے اٹھ آئی۔ بمشکل دروازہ کھولا اور ــــ سہمی سہمی پھیلی پھیلی آنکھیں لئے کوریڈور میں آگے کی طرف بڑھنے لگی۔ اِسی طرف سے ایک شورٹ کٹ راستہ نیچے مسز علی کے کمرے کی طرف جاتا تھا۔

چہار سو گھپ اندھیرا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سوجھائی نہ دیتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔

تبھی ــــ اُس نے دیکھا۔ سامنے کے موڑ کے پاس ہی پاپا کی لائبریری میں موہوم سی روشنی ہو رہی تھی۔ کون ہو سکتا تھا رات کے اِس پہر؟ پھر بھی اُسے کچھ ڈھارس سی ہوئی۔ لامتناہی اندھیروں میں روشنی کی رمق تو نظر آئی تھی!

وہ شورٹ کٹ چھوڑ اُسی سمت ہولی۔ قریب پہنچی۔ ہولے سے پٹ وا کیا۔

ہمیشہ کی طرح دروازے کی طرف پیٹھ کئے اپنی کرسی پر اپنے مخصوص برانڈ کی جلتی سگریٹ انگلیوں میں دبائے پاپا بیٹھے تھے!

اُس کی ایک بے دریغ چیخ نکلی۔ اور پھر اُسے کوئی ہوش نہیں رہا۔

آنکھ کھلی تو وہ اپنے بستر پر تھی۔ اِردگرد دیکھا۔ صبح کی پو پھٹنے کو تھی۔ کمرے میں مدھم روشنی ہو رہی تھی اور ــــ اجلی اجلی صبح تاریکیوں کے اِسرار کو نگل گئی تھی!





انکل جہانگیر اور اُن کی فیملی واپس آچکے تھے۔ رات انکل نے اُسے اپنے پہنچنے کی اطلاع دی تھی اور یہ بھی کہ آج وہ اُسے ملنے آرہے تھے۔

وہ بہت خوش تھی۔ سارا خوف، رنج و فکر جاتے رہے تھے۔ دنوں بعد بہت ہلکا محسوس کر رہی تھی۔

دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ گرم پانی کا شاور لے کر اُس نے اوشن بلو شلوار قمیض پہنی۔ کپڑوں سے میچ کرتا خوبصورت پرنٹڈ سٹول کندھے پر ڈالا، ہمرنگ لیدر کے شوز پہنے، گھنے خوبصورت بالوں میں برش کیا اور ــــ

سیڑھیاں اترنے لگی۔ اِس وقت پھر اُسے سخت کمزوری نے آلیا۔ نہائی بھی تھی شاید تھک گئی تھی اس لئے۔ نڈھال سے قدم سنبھالتی وہ حویلی سے باہر نکل

آئی۔

بوجھل گھٹائیں پورے آکاش کو گھیرے میں لئے تھیں۔ نرم خرام ہوا بھیگی بھیگی تھی اور۔۔۔ بارش اب برسی کہ اب!

شدید سردی تھی۔ اِس کے باوجود اُسے اچھا لگ رہا تھا سب۔ وہ آگے ہی آگے بڑھتی گئی۔

تاحدِ نظر پھیلے سرسوں کے پھولوں، گھنے قد آور درختوں، اور اُس پار سرئی پہاڑ پر۔۔۔ بادل جھک جھک آرہے تھے۔ دن میں ہی شام اُتر آئی تھی جیسے۔ سحر زدہ ماحول اُسے بھی اپنے سحر میں جکڑے تھا!

''رکیئے''۔ تیزی سے پاس آتے ہوئے ایک گارڈ نے کہا۔

چونکتے ہوئے وہ رک گئی۔

''آپ کو یہاں سے آگے جانے کی اجازت نہیں ہے۔'' وہ مزید بولا۔

اوہ۔۔۔ وہ واقعی مقرر کردہ حد کراس کر گئی تھی۔

تبھی۔۔۔ گارڈ کا سفید رومال نیچے گر گیا۔

''آپ کو کوئی slow poison کر رہا ہے۔ احتیاط کیجئے گا۔'' جھک کر اپنا رومال اٹھاتے اٹھاتے وہ اچانک رازداری سے بولا۔

وہ متحیر سی اُسے دیکھنے لگی۔

''تم... تم کون ہو؟''

''گارڈ۔۔۔ آپ کا گارڈ''۔

وہ مڑا۔ اور اُسی تیزی سے واپس چلدیا۔

وہ سن سی وہیں کھڑی رہی۔

'آپ کو کوئی slow poison کر رہا ہے...' بار بار اُس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔

وہ جیسے حدود دکھانے سے زیادہ اُسے وارن کرنے آیا تھا کہ اُسے slow poison کیا جا رہا تھا۔ اور۔۔۔ کہ اُسے احتیاط کرنا چاہیئے تھا۔



اُس کی ساری ایکسائیٹمنٹ جاتی رہی۔ تھکے تھکے سے قدم سنبھالتی وہ پھر سے حویلی کی طرف آنے لگی۔

کمرے میں آکر وہ انگیٹھی میں جلتی آگ کے قریب صوفے پر ڈھیر ہوگئی۔

کون اُسے زہر دے رہا تھا؟ اِس گارڈ کو کیسے معلوم ہوا؟

یہ گارڈ۔۔۔ اِس تمام عرصہ میں اور تمام لوگوں میں پہلی بار کوئی اُس سے ہمدردی کر رہا تھا!

اُسے یہ سب کیسے معلوم ہوا تھا؟ وہ اُس وقت اِس قدر کنفیوزڈ تھی کہ پوچھ ہی نہ سکی۔ اور۔۔۔ پوچھتی بھی کیسے کہ وہ تو خود اتنی رازداری برت رہا تھا۔ لگتا تھا رومال بھی اُس نے خود گرایا تھا کہ اٹھاتے اٹھاتے اُسے بات کرنے کی مہلت مل سکے۔ اُسے تو خود جیسے آس پاس کھڑے چوکیداروں کا خیال تھا۔

اُسے کچھ کچھ حویلی میں بچھائے گئے جال کا احساس ہونے لگا۔ اِس قدر سخت پابندیاں، مسز علی کی پراسرار نظریں اور حویلی کا ہیبتناک ماحول۔ اِن سب کے پیچھے کیا راز تھا اور کس کا ہاتھ تھا؟ وہ سمجھنے سے قاصر تھی!

لنچ تک انکل جہانگیر آگئے۔ اکیلے ہی آئے تھے۔ اُن کے کندھے پر سر رکھ کر وہ بے طرح رو دی۔

دونوں نے لنچ اکٹھے کیا۔ اُس کے بعد وہ اُس کے ساتھ اُس کے بیڈروم میں آکر بیٹھ گئے۔

بہت ساری باتیں ہوئیں۔ پاپا کے متعلق، انکل اور اُن کی فیملی کے متعلق، ماموں جان کے بارے میں۔ بات نہیں ہوئی تو۔۔۔ حویلی کے بدلے ماحول کی!

وہ مزید اپنے من میں اٹھتے ان گنت شور مچاتے سوال دبا نہ سکی۔ سب پوچھ ڈالا۔ بے شمار پابندیوں کی وجہ، مسز علی کا رویہ اور آخر میں جو بار بار حویلی میں انہونے واقعات اُسے ہراساں کر کے پاگل کرنے پر تلے ہوئے تھے!

انکل نے گہری سانس لی۔ مسکرائے۔ اُن کی مسکراہٹ اچانک بہت اجنبی سی

لگنے لگی تھی۔

''بیٹے۔ جہاں تک تمہیں حویلی میں ڈر لگنے کا سوال ہے۔تو یہ سب تمہارے اکیلے پن کی پیداوار ہے۔ بھائی صاحب اِس دنیا میں ہیں نہیں تو حویلی کے باہر درختوں میں یا پھر اپنی سٹڈی میں کیسے نظر آ ئیں گے؟ کوئی پُراسرار عورت کوریڈور میں سے گزر رہی تھی، تو جب تم نے خود اپنے ہاتھ سے مین دروازہ بند کیا تھا تو کوریڈور میں کسی عورت کے چلنے پھرنے کا کیا سوال؟ رہی بات پابندیوں کی۔ تو یہ تو اُس وقت تک برقرار رہیں گی جب تک تمہاری شادی نہیں ہو جاتی ...''

''میری شادی؟'' وہ پریشان سی بولی۔

ابھی تو اُس نے صرف اے لیولز ہی کیا تھا۔ اور پھر شادی تک یہ پابندیاں؟ اتنا لمبا عرصہ وہ اِس قید و بند میں کیسے گزارے گی؟

''ہاں بیٹا! ہم نے طے کرلیا ہے کہ آنیوالے اتوار کو تمہارا نکاح پڑھا دیا جائے۔ تاکہ تمہارا اکیلا پن ختم ہو۔ تم آزادی سے گھوم پھر سکو۔ تمہارے املاک کو سنبھالنے والا بھی تمہیں مل جائے۔ اور میرا بھی وعدہ پورا ہو ...''

وہ ہکا بکا انہیں دیکھ رہی تھی۔

''کیسا وعدہ؟'' اُس کی آواز جیسے دور سے آ رہی تھی۔

''بھائی صاحب کے ساتھ کیا ہوا وعدہ۔ مرتے وقت اُنہوں نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ چونکہ اُن کے بعد تم تنہا رہ جاؤ گی۔ تو ایسا نہ ہو پیسے کی خاطر کوئی تمہاری زندگی کو نقصان پہنچائے۔ اِسی لئے اُنہوں نے مجھ سے تمہارا نکاح سرفراز سے کرنے کی ریکویسٹ کی تھی۔''

''ک... کون سرفراز؟'' وہ سمجھ نہیں پائی۔

''میرا بیٹا۔ اور کون؟''

اُسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے انکل کو دیکھ رہی تھی۔



سرفراز بھائی ــــ پہلے سے شادی شدہ، تین بچوں کے باپ، جہان بھر کے آوارہ اور کئی غلط کاموں میں ملوث!

''مگر وہ تو شادی شدہ ہیں۔ بچے ہیں اُن کے۔''

''اِس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ مرد چار چار شادیاں کرسکتا ہے''۔

''مگر... میں ایسا نہیں کرسکتی''۔ انکل کی بہت عزت کرنے کے باوجود وہ اِس وقت بول اُٹھی۔

''یہ تمہارے پاپا کی خواہش تھی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ تمہاری شادی غیروں میں ہو''۔

وہ جانے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ بھی کھڑی ہوگئی۔

''مگر... میں سرفراز بھائی سے شادی نہیں کروں گی''۔

پاپا کو تو وہ ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے۔ بلکہ تاکید کی تھی کہ وہ آئیں تو شندی زیادہ سامنے نہ آئے اُن کے۔ شادی کا کیسے کہہ دیا؟

''اچھا۔ میں چلتا ہوں۔ ضروری تیاریاں بھی کرنی ہیں''۔ وہ اُس کی اَن سنی کرتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔

''انکل میں یہ شادی نہیں کروں گی''۔ وہ ہمت کر کے ایک بار پھر بولی کہ ــــ

ایک شادی شدہ اور بدکار شخص کے ساتھ شادی کرنے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

وہ واپس مڑے۔ آنکھوں میں غیض و غضب اتر آیا تھا۔

''تم کون ہوتی ہو انکار کرنے والی۔'' وہ بھپرتے ہوئے بولے۔

وہ سہم کر رہ گئی۔ اُن کا یہ روپ وہ پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ مگر ــــ سرفراز کے ساتھ شادی؟ یہ بھی اُس کے لئے ممکن نہیں تھا۔

''میری مرضی کے بغیر میری شادی نہیں ہوسکتی''۔

اور انکل نے تڑاخ سے ایک تھپڑ اُس کے پھول سے گال پر جڑ دیا۔

''اب تمہارا باپ نہیں ہے تمہاری ہر جائز ناجائز سننے کو۔ چیونٹی کی طرح مسل کر رکھ دوں گا''۔

ساتھ ہی وہ بڑے بڑے قدم اٹھاتے کمرے سے باہر نکل گئے۔

گال سہلاتی وہ صوفے پر اوندھی پڑ رہی۔ اُس کا ذہن ماؤف تھا۔ سوچنے سمجھنے کی قوت سلب ہو چکی تھی۔ بس آنسو تھے کہ تواتر سے بہہ رہے تھے۔

حواسوں میں آئی تو چھ بجنے کو تھے۔ آسمان کھل کر برسنے کے بعد اب مطلع صاف تھا۔ مٹیالی شام گھر آئی تھی، سردی در آئی تھی اور ___ حویلی کا اسرار سوا ہو گیا تھا!

اٹھتے ہوئے وہ واش روم گئی۔ چہرے پر پانی کے چھینٹے دیئے، واپس کمرے میں آئی اور شال کندھوں پر لیتی بالکنی میں نکل آئی۔

ڈھلتی شام کے دھندلکوں میں اُس نے دیکھا۔ یہاں وہاں اب بھی گارڈز کھڑے تھے۔

'آپ کو کوئی slow poison کر رہا ہے' اُس گارڈ کی آواز اُس کے کانوں میں گونجی۔

انکل جہانگیر ہی اُسے poison کر رہے تھے۔ وہ کچھ بھی کر سکتے تھے۔ وہ اچانک اِس قدر بدل گئے تھے کہ لگتا ہی نہیں تھا کہ پاپا سے اُن کا خون کا رشتہ تھا۔

لیکن ___ وہ اُسے poison کیوں کر رہے تھے؟ وہ تو اُس کا رشتہ اپنے بیٹے سے کرنا چاہتے تھے۔ پھر ایسا کرنے کا فائدہ؟

کیا پاپا نے واقعی اُن سے وعدہ لیا ہوگا۔ سرفراز سے اُس کی شادی کرنے کا؟ اُسے کسی طور یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ تو اُسے اُس کے ذلیل کرتوتوں کی وجہ سے پسند ہی نہیں کرتے تھے۔ پھر اپنی لاڈلی بیٹی کا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں کیسے دے سکتے تھے؟



'پیسہ ہی انسان کا سب سے بڑا دشمن رہا ہے' کچھ دن قبل کی انکل جہانگیر کی فون پر کہی بات اُس کے کانوں میں گونجی۔

کیا یہی مجبوری تھی پاپا کی؟ کیا دولت کی وجہ سے اُس کی زندگی کو لاحق خطرے کی بناء پر اُنہوں نے کم مہلت کے باعث یہی فیصلہ کر لیا تھا؟

مانا کہ بالکل تنہا ہونے کی وجہ سے اُنہیں اُس کی شادی کرا دینا ہی مناسب لگا ہوگا۔ لیکن ___ سرفراز سے؟

قریبی رشتہ داروں میں واقعی کوئی اور نہیں تھا۔ ماموں جان کے بھی دونوں بیٹے شادی شدہ تھے۔ پھر جب وہ دونوں اور سرفراز، سبھی شادی شدہ تھے تو تینوں میں سے اُنہیں سرفراز بہتر لگا ہوگا۔ کہ اپنے بھائی کا بیٹا جو تھا اور پھر ___ بقول انکل جہانگیر کے مرد چار چار شادیاں کر سکتا ہے۔ سرفراز قلبی سکون تو نہ دے سکتا تھا ہاں شاید اُس کے جائیداد کی حفاظت کر پاتا!

دور پار کا کوئی رشتہ دار بھی تو ہو سکتا تھا۔ لیکن پاپا کے پاس مہلت نہیں تھی۔ گولی سینے میں لگی تھی اور ایسی حالت میں وہ صرف اتنا ہی سوچ سکتے تھے۔

''پاپا آپ تو مجھے اپنی جان سے زیادہ چاہتے تھے۔ مجھے کیسے جیتے جی مار سکتے ہیں آپ؟'' وہ خود سے بولی۔

'ذلیل اور غلیظ بہت دیکھے ہیں مگر سرفراز جیسا نہیں دیکھا۔ بدنصیب ہے اُس کی بیوی۔ اُس کے ساتھ شادی کرانے سے تو بہتر تھا خود اپنے ہاتھوں سے مار دیتا باپ اُسے۔' اچانک اُس کے کانوں میں پاپا کے الفاظ گونجے۔

'بدنصیب ہے اُس کی بیوی... اُس کے ساتھ شادی کرانے سے تو بہتر تھا خود اپنے ہاتھوں سے مار دیتا باپ اُسے... خود اپنے ہاتھوں سے مار دیتا باپ اُسے... مار دیتا باپ اُسے...'

نہیں ___ پاپا اُس کی شادی سرفراز سے کبھی نہیں کرا سکتے تھے۔ اگر وہ اُس کی بیوی کو اُس کے ساتھ شادی پر بدنصیب گردانتے تھے تو خود اپنی نورِ نظر کو کیونکر اُس

کے حوالے کر سکتے تھے؟

جھوٹ تھا یہ سب۔ انکل پاپا سے وعدے کا گھڑ کر اپنا اُلو سیدھا کرنا چاہتے تھے۔ باقی دنیا سے کہیں زیادہ وہ خود اُس کے پیسے کے چکر میں تھے۔

اِس وقت اُس کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ کم عمر سہی لیکن جائیدادوں کے لئے کیئے گیئے سنے سنائے واقعات سامنے آنے لگے۔ پھر کڑیاں ملائیں تو بھی یہی بات سامنے آنے لگی۔

اتنے بڑے حادثے پر بھی انکل کا منظر سے غائب ہو جانا کہ اُن کا نام آئے بغیر ہر ناروا سلوک اُس کے ساتھ روا رکھا جائے۔ پرانے نوکروں کا صفایا کر دینا تا کہ کوئی اُسے کچھ بتا نہ سکے۔ اُس کا سیل فون غائب ہو جانا تو کہ وہ کسی ہمدرد کو اپنا حال نہ بتا سکے۔ مسز علی کی پر اسراریت، کہ وہ ڈری سہمی رہے اور حویلی کے باہر کڑا پہرہ تا کہ تنگ آ کر وہ بھاگ نہ کھڑی ہو!

پچھلے دنوں پاپا کے کمرے کے دروازے کا خود بخود کھل جانا، کسی عورت کا کوریڈور میں سے گزرنا، پاپا کا یہاں وہاں نظر آنا___ گو وہ یہ معمہ حل نہ کر پا رہی تھی مگر___ مارے خوف کے وہ پل پل مر رہی تھی۔ اُسے شدید خواہش ہو رہی تھی کہ حویلی میں اُس کے ساتھ کوئی دوسرا ہمدرد موجود ہو اور___

وہ ہمدرد انکل کو سرفراز کی شکل میں نظر آیا تھا!

کہیں... یہ سب بھی... انکل تو نہیں کر رہے تھے؟ مگر کیسے؟ وہ الجھ کر رہ گئی!

ہر سو رات پَر پھیلا چکی تھی۔ سیاہ گھٹاؤں نے اِس وقت بھرپور آکاش کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ اُس پار پہاڑوں کے اوپر، بجلیاں تڑپنے لگی تھیں اور___ سردی شدید تر ہو گئی تھی!

گہری سانس لیتے ہوئے وہ اندر کمرے میں چلی آئی۔

نواز انگیٹھی میں آگ جلا گیا تھا۔ کمرہ کوزی ہو رہا تھا۔

وہ آگ کے قریب بیٹھ گئی۔ بڑی بڑی جلتی لکڑیوں پر نظریں جمائے وہ ہنوز



ادھیڑ بُن میں مصروف تھی۔

سرفراز سے وہ کسی طور شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مر جاتی مگر ایسا نہ ہونے دیتی۔ وہ یہاں سے فرار ہو جائے گی۔ گرچہ پہرہ بہت کڑا تھا۔ مگر___ وہ نکلے گی، کسی بھی طرح!

رات ڈنر کے بعد وہ اپنے بیڈ روم میں گئی۔ ایک نظر اپنے کپڑوں پر ڈالی۔ پھر الماری میں اپنے ہینڈ بیگ کا جائزہ لیا۔ چھوٹی موٹی ضرورت کی چیزیں موجود تھیں۔ کچھ نقدی اور اپنے بینک اکاؤنٹ کا چیک بک بھی تھا۔ اچھی طرح تسلی کر چکی، تو صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔ وقت گزارنے کے لئے میز پر رکھا میگزین اٹھایا اور___ اوراق پلٹنے لگی۔

اُس نے مین دروازے سے نکلنے کا اِرادہ کیا تھا۔ کیونکہ گذشتہ تین دن سے مین دروازے کا چوکیدار کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ شاید باقی چوکیداروں میں جا ملا تھا۔ ڈارک گرے شلوار قمیض میں ملبوس گارڈز بھی تو بے شمار تھے۔ کچھ پتہ نہ چلتا تھا کون کہاں تعینات تھا؟

آج اُس نے نواز اور مسز علی کے جانے کے بعد وہ دروازہ اندر سے بند بھی نہیں کیا تھا۔ تا کہ نکلے تو کنڈی کی آہٹ نہ ہو۔

بارہ بج چکے تو اُس نے لائیٹ آف کی اور___ آہستہ سے کمرے سے باہر نکل آئی۔ پنجوں کے بل چلتی، سیڑھیاں اترتی وہ مین دروازے تک آ ئی۔ بالکل دھیرے سے دروازے کے پٹ پر ہاتھ رکھا۔ مگر دھک سے رہ گئی۔ وہ تو باہر سے بند تھا۔ اتنا عرصہ وہ خواہ مخواہ بیوقوف بنتی رہی، خود آ کر دروازہ بند کرتی رہی۔

بہر حال___

آج اُس نے تہیہ کر ہی لیا تھا۔ دروازہ چھوڑ اُس نے قریبی کھڑکی کھول لی۔ باہر اترتے ہوئے قدم زمین پر رکھے۔

''ہمیں پتہ تھا تم بھاگنے کی کوشش کرو گی۔'' مین دروازے کے پاس ہی

کھڑی مسز علی نے گرجدار آواز کے ساتھ اُسے آلیا۔ بازو سے پکڑا اور دروازے کا تالا کھولتے ہوئے واپس اندر گھسیٹ لائی۔ ''جبھی آج دروازہ بھی اندر سے بند نہیں کیا۔ ہم نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلیں ...''

چیختی چلاتی شاندانہ کو وہ دوبارہ اُس کے بیڈروم میں لے آئی۔ غصے سے اُسے بستر پر دھکیلا۔ اور ـــــ

شاندانہ سے مزید برداشت نہ ہوا۔ اٹھی اور ـــــ کس کر ایک تھپڑ مسز علی کے منہ پر رسید کر دیا۔

''تمہاری یہ ہمت''۔ مسز علی آتشِ پا ہو گئی اور ـــــ

تڑاخ تڑاخ اُسے کئی چانٹے دے مارے۔ پھر ـــــ کھٹ پٹ کرتی باہر نکل گئی۔

وہ سُن سی صوفے پر بیٹھ گئی۔ نازونعم میں پلی ـــــ آج تک کسی نے اُس سے زور سے بات تک نہیں کی تھی ـــــ اتنی انسلٹ!

''پاپا''۔ اُس نے بے اختیار پاپا کو پکارا۔ اور پھر ـــــ اپنی بے پناہ بے بسی پر سر گھٹنوں پر رکھتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

دل کی بھڑاس نکال چکی۔ تو واش روم گئی۔ چہرے پر پانی کے چھینٹے دیئے۔ اور خود کو سنبھالتی دوبارہ کمرے میں آ گئی۔

ایک بار پھر انگیٹھی کے قریب بیٹھتے ہوئے وہ اِس جال سے نکلنے کی ترکیبیں سوچنے لگی۔ اتوار میں صرف چار دن باقی تھے۔ وہ تیزی سے ذہن لڑانے لگی۔

اور ـــــ لمحے بیتتے چلے گئے۔

معاً ـــــ کمرے میں کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس منعکس ہوئیں۔

یقیناً انکل آئے تھے۔ اور یقیناً مسز علی نے اُنہیں ساری صورتحال بتا دی تھی۔

وہ غیر ارادی طور پر اٹھ کھڑی ہوئی۔ جلدی سے کمرے کی لائیٹ آف کی۔ اور سہمی سہمی سی وہیں دروازے کے قریب کھڑی رہی۔



پھر ـــــ کوریڈور میں انکل اور مسز علی کے قدموں کی چھاپ ابھری۔

''اتوار کو نہیں۔ کل ہی۔ صبح دس بجے نکاح ہوگا''۔ انکل کہہ رہے تھے۔ ''مگر دھیان رہے شاندانہ کے کانوں میں بھنک بھی نہ پڑے''۔

''جیسا حکم''۔ یہ مسز علی تھی۔

ڈری ڈری سی وہ جلدی سے دروازے سے ہٹ آئی۔ بستر میں گھس کر سوتی بنی۔

انکل دھڑام سے دروازہ کھولتے ہوئے اندر آ گئے۔ لائیٹ آن کی۔

''بھاگ رہی تھی''۔ بے دھڑک اُس کا لحاف کھینچ کر پرے ہٹاتے ہوئے وہ دھاڑے۔ ''ابھی چکھاتا ہوں بھاگنے کا مزا''۔

اور پھر ـــــ اپنے ساتھ لائے چمڑے کے بید سے اُسے اتنا پیٹا، ایسی بے دردی سے پیٹا۔ کہ وہ ہلنے جلنے کے بھی قابل نہ رہی۔ وہیں قالین پر پڑی رہی۔ جگہ جگہ زخموں سے خون رس رہا تھا مگر ـــــ کوئی پرسانِ حال نہیں تھا۔ کوئی ہمدرد نہیں تھا اور ـــــ

رات دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔

اب اُس کے آگے دو ہی راستے تھے۔ یا تو وہ انکل کی بات مان لیتی، سرفراز سے شادی کر لیتی۔ یا پھر یہاں سے بھاگ نکلتی۔ لیکن ـــــ کوشش کی تو تھی بھاگنے کی۔ کتنا خوفناک انجام ہوا۔ پھر؟

صبح کے ڈھائی بج چکے تھے۔ دس بجے انکل نے اُس کے نکاح کا پروگرام بنایا تھا۔ وقت بالکل کم تھا۔ سوچنے میں وقت ضائع کرنے کی گنجائش نہ تھی۔

آر یا پار ـــــ اُسے فیصلہ کرنا ہی تھا۔ یہاں سے نکلنا ہی تھا!

معجزہ ہی تھا کہ اُس نے انکل کی بات سن لی تھی۔ نہ سنی ہوتی۔ تو کم از کم اس وقت ایسی حالت میں وہ دوبارہ نکلنے کا سوچ تک نہیں سکتی تھی۔

باہر گھپ اندھیرا تھا۔ تیز بارش اور آندھی کے جھکڑ چل رہے تھے۔ بجلی بھی

فیل ہوگئی تھی۔ اُسے اس قدر مار پڑ چکی تھی۔ کہ کم از کم مسز علی یا کوئی اور اتنی جلدی دوبارہ اُس سے فرار ہونے کی توقع نہیں کر سکتا تھا۔ اُسے ہمت کرنی ہی تھی۔ قسمت یاور ہوئی تو کامیاب ہو جائے گی۔ نہ ہوئی تو خود کو پھندے سے لٹکا لے گی مگر سرفراز سے شادی نہیں کرے گی۔

اُس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر ــــ زخموں کی وجہ سے اُس کا رواں رواں درد کر رہا تھا۔ نقاہت الگ محسوس کر رہی تھی۔ ایسے میں کیا وہ اتنی ہمت کر لے گی؟

لیکن دوسری صورت میں سرفراز!

No way. ــــ حوصلہ مجتمع کر کے وہ اُٹھی۔ نہ یہ زخموں سے کراہنے کا وقت تھا اور نہ ہی کچھ اور سوچنے کا!

پھر ــــ اُسے حیرت ہوئی۔ اُس میں اچانک طاقت آ گئی تھی۔ شاید نہایت بھیانک انجام کے ڈر سے، سرفراز سے!

اُس نے جلدی جلدی اپنے جوگرز پہنے، شال لپیٹی اور الماری میں سے اپنا ہینڈ بیگ نکال لیا۔ اب کے وہ مین دروازے کی طرف نہیں گئی۔ نا ہی اپنی بالکنی کا سوچا۔ کہ وہاں سے بھی اُس کے فرار کی توقع کی جا سکتی تھی۔ نہایت آہستگی سے چلتی درمیانی راہداری عبور کرتی پچھلی طرف مہمان خانے میں آ گئی، پھر دھیرے سے اُس کی بالکنی میں۔ اِرد گرد دیکھا ــــ

ہر سو ہُو کا عالم تھا۔ چاروں اور تاریکیاں تھیں، تیز و تند بارش تھی اور ــــ ہڈیوں کو چیرنے والی سردی!

گھُپ اندھیرا تھا۔ مگر پھر بھی پتہ چل رہا تھا کہ بارش اور آندھی کے طوفان کی وجہ سے کوئی بھی چوکیدار اپنی پوزیشن پر نہیں تھا۔ اُسے ایک گونہ تسلی ہوئی۔ جلدی جلدی اپنا دوپٹہ بالکنی کے ریلنگ سے باندھا اور اُس سے لٹک گئی۔ نیچے نظر ڈالی، چھلانگ لگانے کے لئے فاصلے کا اندازہ کرنے لگی۔

تبھی ــــ دو مضبوط ہاتھ آگے بڑھے، اُسے تھاما۔ اور نیچے زمین پر کھڑا کر



دیا۔

خوف کے مارے اُس کی چیخ نکلنے کو تھی کہ اُس نے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''اِسی سیدھ میں چلتی جاؤ۔ لفٹ سائیڈ پر بالکل مت ہونا وہاں دونوں برآمدوں میں گارڈز ہیں۔ برانچ روڈ پر میں انتظار کروں گا۔ کوئیک''۔ اُس نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

وہی گارڈ تھا، صبح والا۔ اُس نے اُس کی آواز پہچان لی۔

جو بھی تھا۔ مگر تھا اُس کا ہمدرد۔ مزید کچھ سوچے بنا وہ ہمت کر کے آگے بڑھی۔

یہ سرونٹس کا ایریا تھا۔ حویلی کے سامنے کے گیٹ کے علاوہ یہ واحد راستہ تھا، جو کھلا ہوتا تھا اور جو ملازموں کے علاقے کو براہِ راست باہر کی دنیا سے ملائے رکھتا تھا۔

پاپا کے وقتوں میں اِس راستے پر بھی مسلح پہرے دار تعینات تھا۔ مگر اِس وقت سرونٹ کوارٹرز ویران پڑے تھے اور ــــ پہریدار ــــ ظاہر ہے برطرف کر دیا گیا تھا!

برانچ روڈ یہاں سے فرلانگ بھر پر تھی۔ مگر اُس کی اپنی حالت اتنی خراب تھی۔ کہ تیز چلنے میں دقت پیش آ رہی تھی۔ قدم قدم پر گارڈز اور مسز علی کا خطرہ الگ!

بارش میں بھیگتی، یخ بستہ جھکڑوں کے تھپیڑے سہتی، زخموں سے چُور، وہ سڑک کے کنارے پہنچتے ہی وہیں بے سدھ ہو کر ڈھیر ہو گئی۔

تبھی ــــ وہ گاڑی پاس لایا۔ عجلت میں اُسے اپنے دونوں بازوؤں پر اُٹھاتے ہوئے گاڑی کی پسنجر سیٹ پر ڈالا، اور ڈرائیونگ سیٹ پر آتے ہوئے گاڑی سٹارٹ کر دی۔

وہ ہوش میں تھی۔ اُس کے من میں اُس سے پوچھنے کو بے شمار سوال تھے۔

کون تھا وہ؟ بات چیت، نقل و حرکت سے وہ کوئی گارڈ ہرگز نہیں لگ رہا تھا۔
خطروں اور بھول بھلیوں میں گھری اِس حویلی میں کیا کر رہا تھا؟

مگر___ اُسے وِیکنس اور تکلیف اتنی زیادہ تھی کہ وہ بولنے پر قادر نہیں تھی۔
سیٹ کی پشت سے سر ٹکائے بے حال پڑی تھی۔

سڑک پر نظریں جمائے وہ آگے ہی آگے بڑھ رہا تھا۔ گاہے گاہے ایک نگاہ شاندانہ پر بھی ڈال لیتا۔ اُس کے کپڑے مکمل طور پر بھیگ چکے تھے۔ اور چہرے کے زخموں پر جمے ہوئے خون کے نشان صاف نظر آ رہے تھے۔

شندی نے شاید پہلو بدلنے کی کوشش کی تھی۔ ایک کراہ منہ سے نکل گئی۔

''بہت مارا ہے نا اُس نے تمہیں''۔ اُس کی آواز میں بھی Concern تھی۔
اُسے کیسے معلوم ہوا؟ شاید اُس کی چیخوں کی آواز سن لی تھی۔

''ہاں''۔ وہ دھیرے سے بولی۔ خوبصورت آنکھیں نم ہو گئیں۔

اُس نے گہری سانس لی۔ گھڑی پر نگاہ کی۔ صبح کے چار بج چکے تھے۔
وہ چلتا چلا گیا۔ اُسے اُس کی تکلیف، گیلے کپڑوں اور دگرگوں حالت کا اندازہ تھا۔ مگر اُس کی جائے قیام بھی خاصی دور تھی۔ اور یہی اُس کے حق میں بہتر تھا۔ جتنا وہ اُسے اُس کے شہر سے دور لیجاتا اتنا ہی اچھا تھا۔

''آپ... کون ہیں؟'' اچانک شندی کی نڈھال مگر تجسس بھری آواز ابھری۔

''میں''۔ وہ ہولے سے مسکرا دیا۔ ''گارڈ... تمہارا گارڈ''۔ وہ بالکل صبح کی طرح بولا۔ کہ اِس تمام دوران وہ اُس کی رکھوالی ہی تو کر رہا تھا!

اُس کے خوبصورت ہونٹوں پر بھی مضمحل سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ بہت سارے دن بعد!

اونچائی دھیرے دھیرے بڑھ رہی تھی۔ چکردار موڑ بھی۔ دائیں طرف اونچی نیچی ہری بھری پہاڑیاں تھیں، بائیں جانب دریا کا سیمیں پانی۔



پہلے پہر کے ٹمٹماتے تارے نیلگوں روشنی بکھیر رہے تھے۔ پیڑ، پہاڑ، پانی، سبھی اجاگر ہونے لگے تھے۔

کائنات کا ذرہ ذرہ سجدہ ریز اور پاکیزگی ثناء خواں تھی!

اُس نے بھی گاڑی آہستہ سے ایک موڑ کے کنارے پر روک لی۔ ایک نظر شندی پر ڈالی۔ زخموں سے چور آنکھیں موندے غالباً سو رہی تھی۔

وہیں بیٹھے بیٹھے وہ اپنے رب العزت کے حضور جھکا، سربسجود ہوا، اُس کی بے پناہ عنایتوں کا شکر بجالایا اور___ ایک بار پھر آگے بڑھنے لگا۔

ہری بھری پہاڑی پر چھوٹے سے ایک گاؤں کے اوپر تلے واقع ٹین کی چھتوں والے کچے پکے مکانوں سے صبح کی پکوان کا دھواں اٹھ رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی ٹیریسڈ کھیتیاں اجاگر ہو گئی تھیں اور___ ڈھور ڈنگر جاگ اٹھے تھے!

وائنڈنگ سڑک پر نظریں جمائے وہ احتیاط سے آگے بڑھ رہا تھا۔
اب شہر کی آبادی بھی نظر آنے لگی تھی۔ بازار، بینک، ہوٹلز اور رہائشی علاقے!
وہ آگے ہی آگے بڑھتا گیا۔ آبادی ایک بار پھر پیچھے رہ گئی تھی۔ گہرے سبز پیڑوں سے لدی پہاڑیاں ایک بار پھر قطار در قطار در آئی تھیں۔

کولتار کی پتلی سیاہ سڑک پر چند موڑ کاٹتا___ وہ آہستہ سے گاڑی ایک بہت بڑے نئے تعمیر شدہ پرائیویٹ ہاسپٹل کے اندر لے گیا۔

یہیں وہ کنسلٹنٹ سرجن تھا۔ سٹاف شاندانہ کو عجلت سے اندر لے گیا۔
اُس کی مرہم پٹی ہوئی۔ ہاسپٹل کے صاف ستھرے کپڑے پہنائے گئے، اور اوپر کی منزل پر روم نمبر 4 میں لایا گیا۔ ہاسپٹل کے اپنے ڈاکٹر کی پیشنٹ تھی اِس لئے اور بھی زیادہ توجہ دی جا رہی تھی۔

گھنٹہ ڈیڑھ بعد یاور خان خود بھی آ گیا۔ ڈارک گرے قیمتی سوٹ پر سفید اوور آل پہنے تھا۔
وہ بائیں جانب بستر پر لیٹی تھی۔ چہرہ بہت کمزور اور خود نڈھال لگ رہی تھی۔

ایک نرس پاس کھڑی تھی۔ اُسے آتے دیکھ کر مؤدب طریق سے ایک طرف ہو گئی۔

''کیا حال ہے میم؟'' وہ اُس کے بیڈ کے قریب آتے ہوئے خندہ پیشانی سے بولا۔

وہ صرف مسکرا دی۔ نقاہت سے۔

نرس نے اُس کا Vital chart یاور خان کے آگے کر دیا۔

''سر سٹچز بھی آئے ہیں۔ پورے جسم پر زخموں کے نشان ہیں''۔ نرس آہستہ آہستہ بتا رہی تھی۔

''ہوں''۔ اُس کی نظریں چارٹ پر لگی تھیں۔ ٹمپریچر 100 ڈگری سینٹی گریڈ تھا۔ بی پی نارمل تھا۔ اور...

''سر۔ ڈاکٹر نادر نے یہ دوائیاں لکھی تھیں۔'' نرس نے ایک جونیئر ڈاکٹر کا حوالہ دیتے ہوئے شاندانہ کی کیس ہسٹری کا فائل کھول کر اُس کے سامنے پکڑا۔

''پھر بھی وہ کہہ رہے تھے کہ آپ سے بات کریں کہ آپ کیا Suggest کرتے ہیں۔''

وہ فائل پر نظریں دوڑا رہا تھا۔ دوائیاں صحیح تھیں۔ مگر ___ اُس نے سسٹر سے فائل لے لی۔ ایک اینٹی بائیوٹک بدل کر اُس کی جگہ دوسری لکھ دی۔ ڈائیٹ بھی لکھ دی۔ پھر فائل نرس کو تھما دی۔

اُس نے شاندانہ کے سرہانے دائیں جانب ٹرالی پر نظر ڈالی۔ بریک فاسٹ جوں کا توں پڑا تھا۔

''میم۔ تم بریک فاسٹ نہیں کرو گی۔ تو سسٹر تمہیں خالی پیٹ دوا کیسے دیں گی، ہوں''۔ اُس کی حالت پر اُسے تشویش اور لب ولہجے میں شفقت اور اپنائیت تھی۔

''جوس لیا ہے''۔ وہ ہولے سے بولی۔



وہ مسکرا دیا۔ خوشگواری سے۔

''صرف جوس سے کام نہیں چلے گا۔ اور آئندہ تمہیں مریضوں والا پرہیزی کھانا نہیں ملے گا۔ You are not ill خوب کھاؤ پیو تاکہ جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ۔ رائیٹ؟''

نرس دیکھ رہی تھی۔ ڈاکٹر خان اپنی پیشنٹ سے خاصی بے تکلفی سے باتیں کر رہا تھا۔ فائل پر ڈائیٹ تک خود لکھ دی تھی۔ شاید جاننے والی تھی کوئی۔

''سسٹر۔ میڈیسنز، جلدی پلیز!'' وہ پلٹ کر نرس سے بولا۔

اور نرس عجلت سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

دنوں بعد شندی کا خوف دور ہوا تھا۔ تنہائی کے عذاب سے چھٹکارا ملا تھا۔ روآں روآں درد کر رہا تھا پھر بھی اطمینان نصیب ہوا تھا۔ مگر ذہن میں کئی سوال اب بھی سر اُٹھا رہے تھے!

یاور خان اُس کے بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ اُس کے چہرے پر آئے زخموں پر نظریں دوڑانے لگا۔

اُس کے بہت خوبصورت چہرے پر نیل پڑ گئے تھے۔ ماتھے اور گردن پر زخم آئے تھے۔ بائیں آنکھ لہولہان ہو رہی تھی۔ کس بے دردی سے مارا تھا اُس کے چچا نے اُسے!

غیر ارادی طور پر اُس کا ہاتھ اُس کے پہلو میں رکھے ہاتھ کے نبض پر گیا۔

''اوہ... مائے... گوڈ!'' ایک کراہ کے ساتھ بے اختیار شندی کے منہ سے نکلا۔

''سوری۔ کیا ہوا؟'' سخت نادم ہوتے ہوئے اُس نے اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

مارے تکلیف کے اُس کی حسین آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

''زخم ہے یہاں بڑا سا'' شندی کا اشارہ اپنے پہلو کی طرف تھا۔ یاور خان نے اُس کی نبض دیکھنا چاہی تھی تو ہاتھ زخم سے چھو گیا تھا۔

"oh—I'm awfully sorry..." قدرے پیچھے ہٹتے ہوئے وہ مزید اَپ سیٹ سا بولا۔

"Don't be, you have been so kind." نم آنکھیں لئے وہ مسکرادی۔

"تمہاری دوائیں شروع ہو جائیں گی۔ تو تم بہتر ہو جاؤ گی۔ تمہاری کچھ Investigations بھی کروانی ہیں۔ اُن کی بھی جلدی ہی رپورٹس آجائیں گی۔ پھر..."

"آپ بتائیں گے نہیں آپ کون ہیں؟" وہ بہرحال جاننے کو بے تاب تھی۔ اُس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔

"اوہ"۔ وہ مسکرادیا، خوبصورتی سے۔ "میرا نام یاور ہے۔ یاور علی خان۔ میں اِسی ہوسپٹل میں کنسلٹنٹ سرجن ہوں۔ وہ میرا گیٹ اَپ تھا۔" اُس کا اشارہ اپنے چند گھنٹے قبل کے گارڈ کے جیسے ڈارک گرے شلوار قمیض کی طرف تھا۔ "اور یہ میری اصلی شکل ہے"۔ اُس نے اپنے سراپے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

اُس کے لب ولہجے میں شرارت سی تھی، انداز دوستانہ سا!

اُسے اچھا لگا، دنوں بعد کوئی ساتھی سا ملا تھا!

وہ اُس تک کیسے پہنچا تھا؟ اُس کے حالات کا اُسے کیسے پتہ چلتا تھا؟ وہ پوچھنا چاہتی تھی بہت ساری باتیں۔ گو باتیں کرنے میں اُسے بہت وِیکنس محسوس ہو رہی تھی مگر___

"آپ... مجھے جانتے تھے؟" اُس نے ابتدا کرنا چاہی۔

"نہیں___ اپنا نام تو بتاؤ۔"

اُس کے انداز پر وہ بے اختیار ہنس دی۔ ساتھ ہی زخموں میں تکلیف بھی ہونے لگی۔

یاور خان نے دیکھا اُس کے دانت بہت خوبصورت اور ہنسی بہت دلکش تھی۔



"میرا نام شاندانہ ہے"۔

"I see۔ لیکن میں نے احتیاطاً یہاں تمہارا نام نیلوفر لکھوایا ہے۔ یاد رکھنا" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"مجھے پتہ ہے"۔ وہ نرس سے سن چکی تھی۔ اور مصلحت بھی جان گئی تھی۔

"اچھا مِس شاندانہ۔ اب میں جاتا ہوں۔" وہ اُٹھتے ہوئے بولا۔

پھر اُس پر کمبل درست کیا، اُس کے بیڈ سے لگے ریموٹ کنٹرول سے اُس کے بستر کا سرہانا اونچا کیا، سرہانے لگی ٹرالی اُس کے قریب کی، بیڈ سائیڈ ٹیبل پر سے ٹی وی کا ریموٹ کنٹرول اُٹھا کر اُس کے قریب رکھا۔

"تم ناشتہ کرو۔ ٹی وی دیکھو۔ کوئی ضرورت ہو تو یہ بٹن لگے ہیں۔" اُس نے اُس کے سرہانے دیوار پر لگے بٹنوں کے پورے بیلٹ کی طرف اشارہ کیا۔

"اِنہیں استعمال کرو۔ میں آج بزی ہوں۔ آپریشنز کروں گا۔ سٹاف تمہارا خیال رکھے گا۔ ٹھیک ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ اُسے ممنون نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

وہ چلدیا۔ اور شندی آہستہ آہستہ ناشتہ کرنے لگی۔

نرس نے آکر اُسے دوائیاں کھلائیں، اُس کا بستر دوبارہ سیدھا کیا، کمبل درست کیا، اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

کمرہ قدرے زیادہ گرم ہو رہا تھا۔ شندی نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے Heat کم کی۔ اور لیٹتے ہوئے جلتی دکھتی آنکھیں موندلیں۔

یہ ڈاکٹر کون تھا؟ کتنا مہربان تھا! سوچتے سوچتے اُسے غنودگی نے آلیا۔

اُسے کھانسی شروع ہوگئی تھی۔ ٹمپریچر بھی تھا۔ اِس دوران بار بار نرسیں آئیں، جونیئر ڈاکٹرز آئے، ڈائیٹیشنز آئی، سبھی اپنی خدمات پیش کرتے رہے۔ شندی ڈاکٹر خان کی پیشنٹ تھی وہ اپنی جگہ۔ مگر امیریکن قواعد وضوابط کے طرز پر چلتے اِس

ہوسپٹل کا نظام ہی ایسا تھا۔ ہر دم ہر لمحہ، ہر مسیحا الرٹ۔ کوئی پرابلم، کوئی کمپلینٹ، منہ سے نکلتے ہی حل کرنے کی کوشش شروع ہو جاتی تھی۔

شام کے ساڑھے چار بج چکے تھے، اُس نے اپنا سرہانا اونچا کیا اور آہستہ سے کروٹ سامنے کی چوڑی سی خوبصورت کھڑکی کی طرف لے لی۔ گہری سبز ہری بھری پہاڑیاں یہاں سے بھی جھانک رہی تھیں۔

وہ Resist نہ کر سکی۔ کوشش کر کے بستر سے اٹھ آئی۔ جسم اب بھی پکے ہوئے دانے کی طرح دکھ رہا تھا۔ دھیرے دھیرے چلتی وہ کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔

دور اُس پار اونچی گہری سبز پہاڑیوں کا سلسلہ تھا۔ اور پھر ___ قطار در قطار کئی سلسلے۔ ہر سلسلہ پچھلے سے کم اونچا۔ حتیٰ کہ آخری درختوں سے لدا سلسلہ ہوسپٹل کے پاس آ کر ختم ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا۔ ایک بڑے سے ہرے بھرے پیالے کے پیندے میں ہوسپٹل بنا دیا گیا تھا۔

گہری سبز پہاڑیوں میں کہیں کہیں سفید بادل بھی در آئے تھے۔ یہاں وہاں کچھ عمارتیں بھی چھپتی نظر آ رہی تھیں۔

تھوڑی دیر وہ وہیں کھڑی قدرت کے لازوال حسن سے لطف اندوز ہوتی رہی۔ پھر تھک کر واپس بستر پر آ گئی۔

اتنی ہی دیر میں وہ بے طرح نڈھال ہو گئی تھی۔ بستر پر لیٹی وہ اپنی سانسیں درست اور کراہیں روکتی رہی۔ قدرے آرام آیا۔ تو سامنے لگا ٹی وی آن کر لیا۔

تبھی ___ شام کی چائے آ گئی۔ یونیفارمڈ وارڈ بوائے نے ٹرے ٹرالی پر رکھی۔ اور خاموشی سے باہر نکل گیا۔

ٹی وی پر پروگرام اتنا انٹرسٹنگ تھا کہ وہ اِردگرد سے بے نیاز ہو گئی۔

پورا پروگرام ختم ہوا۔ تو والیوم بند کرتے ہوئے ریموٹ بائیں جانب سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر اُس نے آہستہ آہستہ اپنے ہاتھ پاؤں سیدھے کئے۔ کمبل ٹھیک کیا۔



اور سر بستر کی پشت سے ٹکا لیا۔

تبھی ___ اُس کی نظر دائیں طرف ٹرالی میں لگے چائے کے برتنوں پر پڑی۔

اوہ ___ چائے تو ٹھنڈی ہو چکی ہو گی!

اُس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھے فون پر کچن ڈائیل کیا۔

''کیا مجھے گرم چائے مل سکتی ہے پلیز!''

سوری میم۔ ٹائم اَپ ہو چکا ہے۔ ٹی ٹائم صرف ساڑھے چار سے ساڑھے پانچ تک ہوتا ہے۔'' بہت مؤدب طریق سے جواب آیا۔

جھنجھلاتے ہوئے اُس نے ریسیور واپس رکھ دیا۔

اُسے حیرت ہوئی۔ عرصہ بعد وہ یوں جھنجھلائی تھی جیسے پاپا کے دنوں میں کسی بات پر جھنجھلاتی تھی۔ غصہ البتہ اُسے بہت کم آتا تھا۔ وہ بہت صلح جو اور امن پسند واقع ہوئی تھی۔

اور پھر ___ اُسے دکھ سا ہوا۔ پچھلا عرصہ اُس نے کیسے چپ چاپ ہر بات، ہر کام، ہر واقعہ خاموشی سے برداشت کر لیا تھا۔ نہ کبھی اپنی مرضی سے کچھ مانگا، نہ کبھی اپنی مرضی سے کچھ کیا۔ بس جو مل گیا، جیسے ہو گیا۔ چپکے سے قبول کر لیا۔ مسز علی کی بدتمیزیاں، حتیٰ کہ اُس کی مار تک اُس نے سہہ لی تھی۔

شاید اِس لئے کہ وہ بالکل اکیلی تھی۔ شاید اِس لئے کہ وہ بے بس تھی۔ بلکہ شاید اِس لئے کہ اُسے انکل جہانگیر کا انتظار تھا کہ جن کے آنے کے بعد سب حالات نے خود بخود درست ہو جانا تھا!

ہاں یہی بات تھی! اُسے اُنہی کا انتظار تھا مگر ___

وہ آئے تو اُس نے جلدی سے خیال جھٹکا۔ وہ اُن منحوس گھڑیوں کے بارے میں سوچنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ اُس بھیانک ماحول سے چھٹکارا پانے کے بعد وہ اِن خوشگوار لمحوں میں جینا چاہتی تھی۔ خوشگوار لمحے ___ انجانے، نا آشنا سے ___ جن کا انجام بھی اُسے معلوم نہیں تھا۔ لیکن دل کو جیسے یقین تھا۔ کہ اُسے عزت اور

پروٹیکشن دی جائے گی۔ خلوص اور شفقت ملے گی!

چھ بج چکے تھے۔ اُس نے کھڑکی کے اُس پار نگاہ ڈالی۔ پربتوں کے پیڑوں پر شام اتر آئی تھی۔ اِکا دُکا عمارتوں میں روشن بتیاں درختوں میں سے چھنتیں اِسرار سا جگا رہی تھیں۔ قدرت کا حسن لازوال ہوگیا تھا!

تبھی ___ دستک ہوئی اور ___

ڈاکٹر خان اندر آ گیا۔ ساتھ میں نرس بھی تھی۔ نرس نے کمرے کی لائیٹ آن کر لی۔

''کیا حال ہے میَم''۔ وہ پاس چلا آیا۔

''ٹھیک ہوں''۔

''ٹھیک تو نہیں ہو''۔ وہ مسکرایا۔ ''ٹمپریچر بھی ہے اور کھانسی بھی شروع ہو گئی ہے۔'' وہ نرس کے ہاتھ میں پکڑا چارٹ دیکھ چکا تھا۔

وہ مسکرا دی۔ اُس کے بے تکلف لب و لہجے سے اُس کی بھی جھجک دور ہو رہی تھی۔

''ایسا تو ہونا تھا۔'' وہ پھر خوشگواری سے بولا۔ ''تم بارش میں بہت بھیگ گئی تھیں۔''

وہ نظریں اُٹھا کر اُسے دیکھنے لگی۔ بولی کچھ نہیں۔

یاور خان کی نظر قریب ہی ٹرالی میں چائے کے برتنوں پر گئی۔

''چائے کیوں نہیں پی؟''

''میں ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ خیال نہیں رہا۔ دیکھا تو چائے ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ اور منگوانے لگی تو جواب ملا۔ Time is up...''

وہ خوبصورتی سے ہنس دیا۔

''تو یہ بات ہے۔ ویسے آئندہ تمہیں ہمارے ہوسپٹل کے ڈسپلن کو Follow کرنا ہوگا۔''



''ہاں۔ لگتا ہے۔'' وہ بھی مسکرا دی۔

''سسٹر۔ پلیز اِن کے لئے چائے کا کہہ دیں''۔ وہ نرس سے مخاطب ہوا۔

''جی سر''۔ وہ مؤدب طریق سے بولی۔ اور باہر نکل گئی۔

''تو ___ میم صاحب''۔ بے تکلفی سے کہتے ہوئے وہ حسبِ سابق اُس کے بیڈ کے کنارے پر ٹِک گیا۔ ''تمہیں پتہ ہے تمہیں مائلڈ نمونیا ہوا ہے''۔

''نو سر ___ مجھے کچھ نہیں ہونا چاہئے''۔ وہ بھی دوستانہ انداز میں بولی۔

''ابھی میں نے آپ سے بہت ساری باتیں پوچھنی ہیں''۔

وہ دلچسپ باتیں کرتی تھی۔ اُسے اچھا لگا۔ ایک بار پھر دلنشیں انداز میں ہنس دیا۔

''میں ___ بہت بہت بہت تھکا ہوا ہوں۔ مجھے سخت آرام کی ضرورت ہے''۔

بات ٹالنے کا طریقہ اچھا تھا۔ وہ بے اختیار ہنس دی۔

''میں واقعی تھک گیا ہوں۔ آج لگا تار تین آپریشن کئے ہیں۔ اب گھر جاؤں گا تو ریسٹ کروں گا۔''

''آپ کا گھر کہاں ہے؟''

''یہاں سے چار پانچ میل پر ہے۔''

''پھر... آپ صبح آئیں گے؟'' وہ کچھ متفکر سی لگنے لگی۔

''اُم م م ___ نہیں۔ آج میں رات کو بھی راؤنڈ لگاؤں گا۔ جن پیشنٹس کا آپریشن ہوا ہے اُنکو دیکھنے آؤں گا۔''

''یہاں بھی آئیں گے؟'' اُس کا اشارہ اپنے کمرے کی طرف تھا۔

وہ اُس کی پریشانی بھانپ گیا۔

''ہاں کیوں نہیں۔ تم پریشان مت ہو۔ میں اپنا فون نمبر دیتا ہوں۔ جب چاہو مجھے کال کر سکتی ہو''۔ وہ اُس کے اوپر سے ہاتھ بڑھا کر اُس کے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر سے کاغذ اُٹھانے لگا مگر ___

''اوہ نو''۔ اُس نے ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ ''یہاں تمہارا زخم ہے ...''

اِس وقت پھر اُس کے لب و لہجے میں بے تکلفی کے ساتھ شرارت سی بھی تھی!

وہ چپکے سے مسکرا دی۔ اُس نے اپنے زخم پر پہلے ہی ہاتھ رکھ دیا تھا۔

وہ اٹھا۔ بیڈ کے گرد گھومتے ہوئے اُس کے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر آیا۔ اور کاغذ پر اپنے پین سے اپنے سیل فون کا نمبر لکھ کر رکھ دیا۔

''اور ہاں ___ تمہیں جو جو چیزیں چاہئیں۔ اُن کی لسٹ بناؤں۔ رات میں اپنے پیشنٹس دیکھنے آؤں گا تو تم سے Collect کرلوں گا۔ کل تک ہر چیز تمہیں مل جائے گی، رائیٹ؟'' وہ شفقت اور اپنائیت سے کہہ رہا تھا۔

اُسے معلوم تھا۔ وہ صرف ایک جوڑا کپڑوں میں آئی تھی اور بس!

وہ ممنون نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ ایک بار پھر ذہن میں سوال مچلا۔

''آپ ... آپ ...''

''کون ہیں؟'' اُس نے شرارت سے اُس کی بات پوری کی۔

ہاں۔'' وہ خوبصورتی سے ہنس دی۔

''کل بتاؤں گا۔ آج بالکل ہمت نہیں ہے۔ ٹھیک ہے۔''

''جی''۔ وہ بھی مصالحت آمیز لہجے میں بولی۔

تبھی ___ وارڈ بوائے ٹرے میں چائے کے برتن سجائے آ گیا۔

''اچھا۔ تم چائے پیو۔ میں چلتا ہوں۔'' اُس نے جانے کے لئے قدم بڑھائے۔ "I'll see you soon Good night."

''گڈ نائیٹ''۔ شندی نے کہا۔

وہ چلدیا۔ اور شندی ایک بار پھر ٹی وی پر نظریں جماتے ہوئے گرم گرم چائے کے گھونٹ حلق سے اتارنے لگی۔

دھیان گاہے گاہے بھٹک کر ڈاکٹر خان کی جانب چلا جاتا۔ بتیس تینتیس سال کا خوش اخلاق اور باوقار آدمی تھا۔ بے تکلفی سے بات کرتا تھا جیسے عرصے کی جان



پہچان تھی۔ And ... he was so damned handsome. اُسے ماننا پڑا۔ لمبا قد، چھوڑے شانے، گندمی رنگ پر بڑی بڑی جیٹ بلیک بولتی آنکھیں، پرکشش نقوش اور ___ دلچسپ باتیں!

سات بجے ہی ڈنر آ گیا۔

کھانے کے بعد اُس نے اپنی ضرورت کی چیزوں کی لسٹ بنائی۔ ساتھ میں کچھ رقم رکھی۔ نو بجے ڈاکٹر خان آیا۔ اُس کے حوالے کی اور ___ دوائیاں لیکر، لائیٹ آف کرتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں۔



شندی ناشتہ کر چکی تھی، صاف ستھرے بیڈ پر تکیوں سے ٹیک لگائے لیٹی تھی۔
کل سے بہت بہتر محسوس کر رہی تھی۔

مگر ___ ذہن مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ کبھی پچھلے واقعات نظروں میں گھومتے۔ تو کبھی آئندہ کی فکر لاحق ہوتی۔ کبھی خوبصورت چہرے پر تشویش کے سائے لہراتے۔ تو کبھی ماند چہرے کو اُمید کی کرنیں روشن کر جاتیں۔

دس بج رہے تھے۔ دھیان بٹانے کو اُس نے ٹی وی آن کر لیا۔ بالکل مدھم والیوم پر مختلف چینلز چیک کرنے لگی۔

تبھی ___ ڈاکٹر خان اندر داخل ہوا۔ سٹاف بھی ساتھ تھا، ایک لیڈی ڈاکٹر بھی تھی۔



"گڈ مورننگ میم"۔ ہشاش بشاش یاور خان بولا ___ "مورننگ"۔ ریموٹ سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے وہ اتنے سارے لوگوں کو دیکھ کر محتاط سی ہو بیٹھی۔

نرس نے یاور خان کو شندی کے بارے میں بریف کیا۔

رات کو ٹمپریچر کافی اوپر چلا گیا تھا۔ صبح کو کم ہو گیا تھا۔ اُس کا بلڈ سیمپل وغیرہ بھی Investigation کے لئے لیا جا چکا تھا۔ وہ مطمئن نظر آنے لگا۔

"How do you feel now?" اُس نے شندی سے پوچھا۔

"I'm much better".

"یہ ___ ڈاکٹر نادیہ ہیں۔" یاور خان نے اپنے ساتھ آئی ڈاکٹر کا اُس سے تعارف کروایا۔ "اور ڈاکٹر یہ میری پیشنٹ نیلوفر ہے۔ جس کا کل میں نے آپ سے ذکر کیا تھا۔"

اُس نے اپنے کولیگز کو یہی بتایا تھا۔ کہ وہ اُسے روڈ سائیڈ پر زخمی پڑی ملی تھی۔

"ہیلو"۔ شندی خوش اخلاقی سے بولی۔

ڈاکٹر نادیہ نے ایک گہری نظر اُس پر ڈالی۔

"ہیلو" وہ لاپروائی سے بولی۔ جیسے وہ اتنی اہم نہ تھی کہ ڈاکٹر خان اُس سے اُس کا تعارف کرواتا۔

بہر حال ___

ڈاکٹر خان نرس کو شندی کے بارے میں کچھ ہدایات دیتا، سب کے ساتھ باہر نکل گیا۔

شندی نے ایک بار پھر ٹی وی پر نظریں جما دیں۔ دیکھتے دیکھتے اُسے اچانک خیال آیا۔

ڈاکٹر نادیہ کے رویے سے اُس کے لئے ناپسندیدگی کا اظہار جھلک رہا تھا۔

کیوں تھا ایسا؟

کچھ نہ سمجھتے ہوئے اُس نے کندھے جھٹکے اور ٹی وی دیکھنے میں محو ہوگئی۔
تھوڑی ہی دیر بعد نرس آئی۔ ہاتھوں میں چند بڑے بڑے شوپنگ بیگز تھے۔
''یہ ڈاکٹر خان کا ڈرائیور دے گیا ہے''۔ وہ خوش اخلاقی سے بولی۔
''اوہ''۔ تو یہ اُس کی ضرورت کی چیزیں تھیں۔ کتنا کیئرنگ، کتنا ہمدرد انسان تھا ڈاکٹر خان! وہ اُس کے احسانوں تلے دبی جا رہی تھی۔ ''سسٹر پلیز! انہیں الماری میں رکھ دیں۔''
سسٹر نے سب بیگ الماری میں رکھ دیئے۔ پھر اُسے خوشگوار سی سمائیل دیتے ہوئے باہر نکل گئی۔
وہ احتیاط سے بیڈ سے اُتر آئی۔ اب اُس کے زخموں کی ٹیسیں کافی کم ہوگئی تھیں۔ ٹمپریچر بھی کم ہوگیا تھا۔ کھانسی البتہ اُسی طرح تھی۔
اُس نے بچوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے سب چیزیں بیگز سے نکال کر بیڈ پر رکھ دیں۔
چند بہت پیارے سوٹ، نائیٹ سوٹ، سویٹر، شال، شوز، سلیپرز، ہیئر برش ـــــ پھر کوفی، چوکلیٹس، Marzipan، اور کئی چھوٹی موٹی چیزیں۔ اِس کے علاوہ الیکٹرک کیٹل، دو مگ، چمچ، ٹی بیگز، شوگر کیوبز، کنڈنسڈ ملک اور میگزینز! اُسے حیرت سی ہوئی۔ یہ چیزیں اُس نے نہیں منگوائی تھیں۔
پھر؟
ڈاکٹر خان نے خود سے شامل کی تھیں؟
اُسے بے اختیار وہ بہت Nice لگا۔ بہت تھینک فل نظر آنے لگی اُس کی۔
اُس نے چیزیں بیڈ کے دائیں جانب الماری میں سجا دیں۔ کیٹل، کوفی اور چائے کا سامان دوسری طرف کھڑکی کے کونے والی چیسٹ پر رکھ دیئے۔
پھر ـــــ کپڑوں میں سے ڈارک گرین سٹول سوٹ نکال کر کپڑے تبدیل کیئے۔ Straight خوبصورت بال برش کیئے اور ویکنس محسوس کی۔ تو دوبارہ



بستر پر لیٹ گئی۔
کپڑے بہت خوبصورت اور ڈیسنٹ تھے۔ پلین قمیض کے گلے اور سٹول کے بارڈر پر مرون، مسٹرڈ اور بلیک شیڈز میں نفیس ایمبرائیڈری ہوئی تھی، اِنہی رنگوں میں دھاری دار شلوار تھی اور سائز ـــــ اِس قدر صحیح کہ اُسے حیرت ہونے لگی۔
بہر حال ـــــ صاف ستھرے کپڑے پہن کر اُس کی طبیعت بشاش ہوگئی۔ قدرے تازہ دم ہوئی۔ تو سرہانے رکھی اِمپورٹڈ چوکلیٹ نکال کر کھاتے ہوئے ایک بار پھر ٹی وی دیکھنے لگی۔

شام کے چھ بج چکے تھے۔ پہاڑیوں کے گھنے جنگلوں میں بادل تیر رہے تھے، شام وقت سے پہلے اندھیری ہو رہی تھی، اور ـــــ چہار سُو برکھا رُت چھا گئی تھی!
کھڑکی سے ہٹ کر اِس طرف آتے ہوئے اُس نے لائیٹ آن کی۔ اِس وقت وہ کافی اچھا محسوس کر رہی تھی۔ کھانسی البتہ پریشان کر رہی تھی۔
آگے بڑھتے ہوئے وہ فریج کے اوپر رکھی بوتل کھول کر گلاس میں پانی ڈالنے لگی۔
تبھی ـــــ دستک کے ساتھ ڈاکٹر خان اندر داخل ہوا۔ نرس بھی ساتھ تھی۔
''گڈ ایوننگ میَم''۔ اُس نے بشاشت سے کہا۔
''ہائے''۔ اُس نے بوتل واپس رکھ دی۔
وہ اُس کے بیڈ کے قریب رک گیا۔
آج وہ اُسے پہلی بار بستر سے باہر نظر آئی تھی۔ سرو قد، چھریرا بدن، کمر تک گھنے ڈارک براؤن بال، بیضوی چہرہ، سفید سفید رنگت پر گرے بلو بڑی بڑی آنکھیں، پیاری سی ناک ـــــ بے حد حسین پاؤں کی اُنگلی میں چمکتا نازک سا سنہری چھلا، مدھر پرفیوم کی اروما بکھیرتا گریس فل سراپا ـــــ اُسے وادیٔ یمن کے

عطر سے مہکتیں بابل ونینوا کی شہزادیوں کا خیال آ گیا!

''کیسی طبیعت ہے اب؟'' وہ ڈیوٹی کی طرف آیا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں''۔ وہ اب بھی وہیں کھڑی تھی۔

وہ مسکرایا۔ خوبصورتی سے۔

''آؤ بستر پر لیٹو۔ دیکھتے ہیں کتنا سچ کہہ رہی ہو''۔

وہ خاموشی سے پاس آئی۔ اور آہستہ سے بستر پر لیٹ گئی۔

نرس نے اُس کے منہ میں تھرما میٹر لگا دیا۔ یاور خان نے اُس کی نبض تھام لی۔

بخار اب بھی تھا، گو ہلکا تھا۔ سسٹر نے اُس کا ٹمپریچر اور بی پی نوٹ کیا۔ چند لمحے کھڑی یاور خان کی کسی ہدایت کا انتظار کرتی رہی۔ مگر ایسا نہ ہوا تو آہستہ سے باہر چلی گئی۔

اِس وقت پھر وہ آہستہ سے اُس کے بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گیا۔

"I hope I don't touch your wound."

شندی کو ہنسی آ گئی۔ وہ کل کے واقعے کے بعد خاصا محتاط ہو گیا تھا۔

"Don't you worry" آپ جب بھی بیٹھتے ہیں۔ میں اپنے زخم پر ہاتھ رکھ لیتی ہوں''۔

اور ــــ یاور خان کا جاندار قہقہہ بلند ہوا۔

پھر ــــ نظریں اُس کے سراپے پر گئیں۔

''تمہارے ساتھ یہ کپڑے بہت اچھے لگ رہے ہیں۔'' وہ تعریف کئے بنا نہ رہ سکا۔

''اوہ ہاں۔ تھینک یو ویری مچ۔ آپ نے اتنی زحمت اُٹھائی ...''

وہ ایک بار پھر ہنس دیا۔ دلآویزی سے۔

''میں واقعی مشکل میں پڑ گیا تھا۔ ہیلپ کے لئے اپنی لینڈ لیڈی کو بھی ساتھ



لے کر گیا تھا۔ مجھے کیا پتہ لڑکیاں کیسی چیزیں پسند کرتی ہیں۔ پھر کچھ انہوں نے مدد کی۔ کچھ میں نے بھی تجویز دی۔ ویسے یہ ڈریس اور رنگ میں نے پسند کئے ہیں...''

''اوہ ــــ آپ کا ٹیسٹ بہت اچھا ہے۔'' وہ توصیفی نظریں اپنے کپڑوں پر ڈالتے ہوئی بولی۔

''ہوں؟'' اُس کی گھنی خوبصورت بھوئیں اوپر اُٹھ گئیں۔

''سچ کہتی ہوں''۔

اچھا سنو۔ دو چار دن میں تمہارا ٹمپریچر نارمل ہو جائے گا۔ پھر میں تمہیں یہاں سے لے جاؤں گا...''

''کہاں؟'' وہ اَپ سیٹ سی نظر آنے لگی۔ یہاں تو پُرسکون تھا!

''کیوں یہیں رہنا ہے کیا؟'' وہ شرارت سے بولا۔

نہیں لیکن ... پتہ نہیں ...'' وہ اُلجھ سی گئی۔

وہ اُسے کہاں لیکر جانا چاہتا تھا؟ کیا اپنے گھر؟ وہاں اور کون ہو گا؟ کوئی اُسے ویلکم کرے گا بھی یا نہیں؟ وہ پہلے کبھی کسی کے گھر میں نہیں رہی تھی۔

''پلیز! پریشان مت ہو۔ میں تمہیں اپنی لینڈ لیڈی کی اینکسی میں لیکر جاؤں گا۔ وہ دونوں میاں بیوی میرے پیرنٹس کے پرانے اور بہت کلوز فرینڈز ہیں۔ اُن کے دونوں بچے باہر ہوتے ہیں۔ خود اکیلے ہیں یہاں۔ بہت اچھے لوگ ہیں۔ اُنہوں نے تو ابھی سے تمہارا انتظار شروع کر دیا ہے۔ تمہیں اُن کا پہاڑی گاؤں یقیناً پسند آئے گا...''

''کیا آپ مجھے میرے ماموں کے گھر نہیں لے جا سکتے؟'' اتنا عرصہ وہ مکمل طور پر قید و بند میں تھی ورنہ اتنے مصائب برداشت کرنے کے بجائے کبھی کی اُن کے گھر جا چکی ہوتی۔

وہ قدرے مسکرایا۔ پھر جیسے کچھ سوچنے لگا۔

''میں مختصراً تمہیں سب بتاتا ہوں۔ پھر تم خود فیصلہ کرلو۔ کہ کہاں جانا ہے۔
تمہارے فادر انکل عالمگیر میرے بابا کے دوست تھے۔ میرے پیرنٹس کراچی میں ہوتے ہیں۔ بابا کو اُن کی ڈیتھ کا پتہ چلا تو مجھے فون کیا، تم لوگوں کا ایڈریس دیا اور کہا کہ اُن کی جگہ میں حویلی جا کر تمہارے چچا جہانگیر حیدر سے تعزیت کرلوں، وہ وہیں ہوں گے۔

''مجھے اُنہی دنوں ضروری کام آ پڑا تھا اِس لئے فوراً نہ جا سکا۔ کچھ دن لگ ہی گئے۔ یہ سوچ کر کہ تمہارے چچا نہ ہوئے تو کسی اور سے تعزیت کر آؤں گا میں تمہاری حویلی چلا گیا۔ مگر وہاں کوئی بھی نظر نہیں آیا، سوائے گارڈز کے۔ میں نے اُن سے تمہارے چچا کے بارے میں دریافت کیا۔ تو وہ اندر سے ایک ملازم نواز کو بلا لائے۔ جب اُسے پتہ چلا کہ میں انکل عالمگیر کے دوست کا بیٹا ہوں۔ تو رازداری سے جلدی جلدی بتانے لگا۔ کہ تم بہت مصیبت میں ہو۔ تمہارے چچا نے ایک طرف سے تمہیں باقی دنیا سے کٹ آف کر رکھا ہے۔ دوسری طرف سے عجیب وغریب طریقوں سے تمہیں خوفزدہ کر رہا ہے۔ وہ کسی میٹنگ پر نہیں گیا۔ گھر پر ہی ہے۔ مسز علی کے ساتھ فون پر سکیمنگ کرتا رہتا ہے۔ کبھی مسز علی کی بہن کو بدروح بنا کر کوریڈور میں پھراتا ہے۔ کبھی خود اپنے قد وقامت کی مشابہت کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے انکل عالمگیر بن کر تمہیں جگہ جگہ خود کو دکھاتا ہے۔ تاکہ تم اس قدر خوفزدہ ہو جاؤ کہ اکیلے رہنے سے گھبرا کر اُن کے بیٹے سے شادی کرنے پر مجبور ہو جاؤ۔ دوسری طرف تمہارے ماموں نے مسز علی کو بھاری رقم دے کر تمہیں تھوڑا تھوڑا کر کے زہر دینے پر آمادہ کیا ہے۔ تاکہ تم ختم ہو تو تمہاری والدہ کی جائیداد کا کوئی اور قریبی وارث نہ ہوتے ہوئے تمہاری تمام جائیداد اُنہیں مل جائے۔'' اُس نے قدرے توقف کیا۔

''جس وقت میں تمہیں Poison کے بارے میں وارن کرنے آیا تھا''۔
وہ پھر کہنے لگا۔ ''اُس وقت میں کلیئر نہیں تھا۔ کہ کون تمہیں زہر دے رہا تھا؟ چچا،



ماموں یا مسز علی؟ کیونکہ نواز نے مجھے تھوڑی سی دیر میں بہت جلدی جلدی اور بہت ساری باتیں بتائی تھیں۔ سو میں ناموں میں کنفیوزڈ ہو رہا تھا۔ اِس لئے بس تمہیں اِتنا بتایا کہ تمہیں کوئی Poison دے رہا ہے۔ تاکہ تم احتیاط کرسکو۔ بعد میں میرے پوچھنے پر نواز سے کنفرم ہوا کہ یہ تمہارے ماموں کر رہے تھے۔ بہر حال—

یہ سب جان کر میں سخت پریشان ہوا۔ میں نے نواز سے کہا کہ وہ یہ سب تمہیں بتادے۔ مگر وہ تمہارے چچا سے ڈرتا تھا۔ پھر ظاہر ہے میں جانتے بوجھتے تمہیں موت کے منہ میں جاتے نہ دیکھ سکا۔ نواز کو اپنا سیل فون دیا تاکہ تمہارے بارے میں اور حویلی میں جو کچھ ہو رہا ہے مجھے اِنفارم کرتا رہے۔ تمہارے چچا نے بے شمار گارڈز ڈیوٹی پر لگائے تھے۔ وہ آپس میں بھی ایک دوسرے کو نہیں جانتے تھے۔

سو— پچھلی سے پچھلی رات جب نواز نے مجھے اطلاع دی۔ کہ کل وہ آ کر تمہارے نکاح کا فیصلہ کرنے والا ہے۔ تو میں بھی پرسوں صبح صبح گارڈز کی ڈیوٹی بدلنے کے ٹائم اُن میں شامل ہو گیا۔ موقعہ ملتے ہی تمہیں Slow Piosoning سے خبردار کیا۔ اور پھر وہیں رہ کر حالات کا جائزہ لینے لگا۔ پچھلی رات جب تم نے حویلی کے مین دروازے سے فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔ وہ بھی میں دیکھ رہا تھا۔ بعد میں جب چچا آ کر تمہیں پیٹ رہا تھا، تمہاری وہ چیخیں بھی میں سن رہا تھا۔

اُسی وقت نواز نے آ کر مجھے بتایا کہ تمہیں خبر کئے بغیر تمہارا چچا صبح ہی تمہارا نکاح اپنے بیٹے سے کروانے والا ہے۔ میں نے سوچا اگر تمہیں بھنک پڑ گئی ہو گی تو تم ضرور آج ہی رات دوبارہ نکلنے کی کوشش کرو گی۔ اور ظاہر ہے اب کے سامنے سے نہیں پچھلی طرف سے راستہ نکالو گی۔ سو میں گارڈز کی نظریں بچا کر وہاں آ کر کھڑا ہو گیا۔ اور خوش قسمتی سے تم وہیں آ گئیں ...

شندی جوں جوں بات سنتی جا رہی تھی۔ آنکھوں سے ڈھلکتے آنسو انگلیوں کی

پوروں سے پونچھتی جا رہی تھی۔ پھر ــــ مزید یارا نہ رہا۔ چہرہ بازو سے ڈھکتے ہوئے بے اختیار رو دی۔ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

چچا، ماموں ــــ سب مطلب کے نکلے۔ وہ بھری دنیا میں اکیلی رہ گئی تھی۔ کیا کرے گی؟ کہاں جائے گی؟

''روؤ نہیں پلیز!'' اُس کے خوبصورت چہرے پر گھر آئے بال پیچھے ہٹاتے ہوئے اُس نے نرمی سے کہا۔ ''سب ٹھیک ہو جائے گا''۔

پھر شندی روتی چلی گئی۔

''کم آن شاندانہ۔ تم یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ تم ایک ناپسندیدہ شخص کے ساتھ نکاح کرنے سے بچ گئیں۔ تمہیں زہر دیا جا رہا تھا وہ ٹل گیا...''

وہ ٹھیک کہتا تھا۔ دونوں صورتوں میں وہ موت کے منہ میں جانے سے بچ گئی تھی مگر ــــ

آگے کیا کرے گی؟ اکیلی کیسے رہے گی؟

''میں... میں... اکیلی کیسے رہوں گی''۔ وہ ہچکیوں کے درمیان بول پڑی۔

''تم اکیلی نہیں ہو گی۔ تمہاری اینکسی اور میرے گھر میں چند قدم کا ہی فاصلہ ہے۔ میں تمہارے لئے کسی آیا کا بھی بندوبست کر دوں گا۔ چوکیدار بھی ہو گا۔ اور پھر ــــ میں بھی تو ہوں گا۔''

اُس نے آنسو پونچھ لئے۔ ایک گونہ تسلی ہوئی۔ سرخ بھیگی بھیگی آنکھوں سے اُسے دیکھا۔

''آپ... کتنے اچھے ہیں''۔

وہ مسکرا دیا۔ دھیرے سے۔

''تم بھی بہت اچھی ہو۔'' اُس نے ہولے سے اُس کا گال تھپتھپایا۔

پھر اُٹھا۔ کھڑکی کے قریبی چیسٹ پر رکھے جوس کے ٹن میں سے گلاس میں جوس ڈالا۔



پھر اُس کے پاس آ کھڑا ہوا۔

اُس کے بیڈ کا سرہانا اوپر کیا۔ اُس کی پشت تکیوں سے ٹکائی اور گلاس لا کر اُسے تھما دیا۔

''So nice of you, thank you.'' انگلیوں کی پوروں سے گال خشک کرتے ہوئے اُس نے گلاس ہونٹوں سے لگا لیا۔

''دیکھو کتنی تیز بارش ہو رہی ہے باہر''۔ یاور خان نے اُس کا دھیان کھڑکی کی طرف مبذول کرایا۔

واقعی باہر تاریکیوں میں جل تھل ہو رہی تھی۔ کچھ دیر قبل بادل بھی تو گھر آئے تھے!

''کتنا اندھیرا ہے باہر''۔ شندی اب سنبھل چکی تھی۔ آہستہ سے بولی۔

''ہاں''۔ دو قدم واپس چل کر وہ کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔

جنگل، گھپ اندھیرا اور ــــ تیز بارش! اُسے ساؤتھ ایسٹرن ایشیا کے جنگل یاد آ گئے۔ سیاہ تاریک راتوں میں موسلا دھار بارشوں میں بھیگتے جنگل!

''جنگل کے اندھیروں میں زبردست بارش ہو رہی ہے۔'' کہتے کہتے وہ واپس مڑا۔

''اچھا ہے جنگل کے درختوں کو ڈر نہیں لگتا ورنہ...'' وہ سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔

''ورنہ؟''

وہ خوبصورتی سے ہنس دی۔

''مر جاتے سب ڈر کے مارے''۔

یاور خان کا جاندار قہقہہ بلند ہوا۔

''اِس کا مطلب ہے باہر کے اندھیرے اور بارش سے تمہیں ڈر لگ رہا ہے۔ بہتر ہے میں پردے بند کر دوں''۔ اُسے یقین تھا ایسا ہی تھا۔

کھڑکی کی طرف بڑھا ہی تھا کہ بہت ساری بجلی چمکی۔ یہاں سے وہاں تک پہاڑیوں کے جنگلوں کو روشن کرگئی اور پھر ___ زور کی کڑک ہوئی۔

''اوہ''۔ شندی سہمی سی نظر آنے لگی۔

یاور خان نے پردے برابر کردیئے۔ واپس اُس کے قریب آیا۔

''اب چلوں گا میڈم۔ ویسے تمہیں ڈر تو نہیں لگے گا نا؟''

''لگے گا تو۔'' اُس نے صاف بات کی۔

''پھر؟''

''کیا ہوسکتا ہے''۔ اُس نے خوبصورتی سے کندھے اچکائے۔ ''ہوسکتا ہے رات تک بارش رک جائے''۔

''ہاں۔ I hope so۔ کیونکہ اب یہ بھی پریشانی لگی رہے گی۔ کہ مادام شاندانہ کو ڈر لگ رہا ہوگا۔''

اُس کی بات پر وہ بے ساختہ ہنس دی۔

''آپ واقعی بہت اچھے ہیں۔'' پاپا کے دوست کا بیٹا تھا۔ اُسے اپنا سا لگنے لگا تھا۔

"Are you sure?"

"Yes,I'm damn sure."

دونوں ہی خوشگواری سے ہنس دیئے۔

معاً دروازہ کھلا اور ___ ڈاکٹر نادیہ اندر آ گئی۔ بیڈ کے سرہانے سے وہ شندی کو نظر نہیں آ رہی تھی۔

''ڈاکٹر صاحب! میرا خیال ہے آج گھر جانے کا ارادہ نہیں ہے''۔ وہیں دروازے کے پاس کھڑے کھڑے وہ جیسے بہت ضبط سے بولی۔ مگر طنز کا عنصر پھر بھی نمایاں تھا۔

یاور خان نے ڈاکٹر نادیہ کو کوئی جواب نہیں دیا۔



''او کے۔ چلتا ہوں۔ نرس سے کہہ دوں گا۔ رات کو بھی بارش رہی تو تمہارا خیال رکھے گی۔'' اُس نے شندی سے کہا۔

''تھینک یو سوچ۔ ویسے آپ فکر مت کریں۔ میں نرس کے بغیر بھی گزارا کر لوں گی۔''

''گڈ نائیٹ''۔ خوشگواری سے مسکراتا وہ ڈاکٹر نادیہ کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔

ڈاکٹر نادیہ کا گھر یاور خان کے راستے میں پڑتا تھا۔ نادیہ اکثر اُس سے لفٹ لیتی تھی۔ اِس وقت بھی دونوں اکٹھے گھر جا رہے تھے۔

ڈاکٹر نادیہ چند ماہ قبل ہی اِس ہوسپٹل میں آئی تھی۔ جلدی ہی یاور خان کی مسحور کن شخصیت اور بے پناہ قابلیت سے متاثر ہوکر اُس میں دلچسپی لینے لگی تھی۔

شروع میں یاور خان اُسے یوں ہی ایک گلیمر گرل قسم کی چیز سمجھ کر ٹالتا رہا۔ وہ اُس کے ٹائیپ کی نہیں تھی۔ شوخ ادائیں، کھنکتے قہقہے، ہر شخص سے بے باکی کی حد تک بے تکلفی۔ مگر ___

وہ اُسے Avoid بھی نہیں کرسکتا تھا۔ وہ اُس کی کولیگ تھی، اُس کے آپریشن ٹیم میں تھی، تقریباً روزانہ کا ساتھ تھا۔

وہ اُس کے ساتھ مریض اور اُن کے کیس ڈسکس کرتا تھا، ہم عمر اور ہم عصر ہونے کے ناطے گپ شپ بھی کرتا تھا۔ لیکن ___ بات جب نادیہ کے من کے تقاضوں پر آتی تو یاور خان اَپ سیٹ سا ہو جاتا۔ وہ اُس کا دل بھی توڑنا نہیں چاہتا تھا پر ___ ذہنی طور پر خود کو آمادہ بھی نہیں کرپا رہا تھا۔

اور تو جو تھا سو تھا۔ مگر وہ مزاج کی بہت تیز تھی۔ کسی نے ذرا مرضی کے خلاف بات کی، فوراً آتش پا ہوجاتی تھی۔ بدکلامی پر اُتر آتی تھی۔ دنوں وہ بندہ اُس کے عتاب کا شکار رہتا تھا۔ عفوودرگزر نام کی کوئی چیز اُس کی کتاب میں نہیں تھی!

اور ___ یہی شاید اصل وجہ تھی۔ جو یاور خان کے آگے بڑھنے میں رکاوٹ بن

رہی تھی۔

پھر بھی ـــــ اِس کے باوجود ـــــ

جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ اُس کی ذہنی مزاحمت کم پڑتی گئی۔ یا پھر دوسرے لفظوں میں اُس نے نادیہ کی شوخ اداؤں اور نقرئی قہقہوں کے آگے ہتھیار ڈال ہی دیئے۔ اُس کی چھیڑ چھاڑ اور مست آنکھوں کی دعوت قبول کر ہی لی!

''بڑی ہنسی آرہی تھی دونوں کو''۔

ڈاکٹر نادیہ کی چبھتی آواز ابھری تو اُس کی محویت ٹوٹی۔

''کیا مطلب؟''

''تم اپنی پیشنٹ میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی نہیں لے رہے؟''

''میری پیشنٹ ہے نا''۔ حسبِ عادت اُس نے اُسے چھیڑا۔

''اور بارش سے کیا اُسے ڈر لگتا ہے کہ رات کو بارش رہی تو نرس اُس کا خیال رکھے گی۔'' اُس کی اَن سنی کرتے ہوئے اُس نے یاور خان کی کچھ دیر قبل کی بات دہرائی۔

وہ زور سے ہنس دیا۔

''اُسے واقعی ڈر لگ رہا تھا۔'' لمحہ بھر کے توقف کے بعد وہ سنجیدگی سے بولا۔

''بچی ہے؟'' وہ غصے سے بولی۔

''نہیں ـــــ ذرا سی بڑی ہے''۔ اُس نے شرارت سے کہا۔

اور ـــــ وہ کاٹ کھانے کر دوڑی۔

''میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں''۔

''اوہ''۔ وہ بھی سنجیدہ ہو گیا۔ ''میں جو کچھ کر رہا ہوں۔ انسانی ہمدردی کے تحت کر رہا ہوں۔''

''بس بس''۔ وہ اب بھی بپھری ہوئی تھی۔

ہر سُو اندھیرا چھا گیا تھا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں وہ پتلی سی وائینڈنگ سڑک پر



نظریں جمائے احتیاط سے آگے بڑھ رہا تھا۔

''میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ میں اِسے روڈ سائیڈ سے اُٹھا کر لایا تھا۔'' اُس نے کسی کو نہیں بتایا تھا کہ وہ اُسے جانتا تھا۔ ورنہ کئی سوال منہ کھولتے۔ کون تھی؟ کس نے مارا تھا؟ کیوں مارا تھا؟ یہ سوال اُس کی بدنامی کا باعث بن سکتے تھے۔ ساتھ ہی اُس کے دشمنوں کو بھی اُس کے اِس ہوسپٹل میں ہونے کی خبر کا اندیشہ تھا۔ سو یہی کہا کہ کسی نے مار پیٹ کر سڑک کے کنارے ڈال دیا تھا۔ اور وہ انسانی ہمدردی اور ایک ڈاکٹر ہونے کے ناطے اُسے ہوسپٹل لے آیا تھا۔ ''اب اُس کی دیکھ بھال کرنا میرا ہی فرض بنتا ہے نا''۔

''دیکھ بھال کے لئے کیا نرس نہیں ہے؟ ضروری ہے کہ تم ہی منڈلاتے رہو اُس کے بیڈ کے اِردگرد۔''

اُس کی بات پر ایک بار پھر اُس کا زوردار قہقہہ بلند ہوا۔

''شٹ اپ''۔ وہ تندہی سے بولی۔

''یہ ایک میڈیکو لیگل کیس ہے؟'' وہ اب بھی غصے سے کھول رہی تھی۔

''آف کورس ہے''۔

''تو سیدھا سیدھا پولیس کو انفارم کیوں نہیں کرتے؟''

وہ ایسا نہیں چاہتی''۔ وہ مختصراً بولا۔

''بہت اونچی چیز ہے نا''۔ وہ حقارت سے بولی۔ پھر جیسے اُسے خیال آیا۔

''اور... یہ تم نے اُسے V.V.I.P.Room میں کیوں رکھا ہے؟''

''میں نے نہیں رکھا۔ اسکی اپنی خواہش تھی۔''

ایسا ہی تھا۔ مگر نادیہ کو یقین نہیں آیا۔ قہر و غضب اور بڑھ گیا۔

''اب بکواس نہیں کرو''۔ وہ آپے سے باہر ہونے لگی۔

وہ منہ پھٹ تھی وہ جانتا تھا مگر ـــــ تذلیل کی حد تک جانا اُسے بھی گوارا نہیں تھا۔ پھر بھی ـــــ

"Control your self, please!" وہ بڑے ضبط سے بولا۔

"Oh shut up." "اب ٹھیک ٹھاک ہے۔ کل ہی اِسے چلتا کرو"۔

"ٹھیک ٹھاک بھی نہیں ہے۔ اور کل ہی اِسے چلتا بھی نہیں کر سکتا۔" وہ بھی Firmly بولا۔

نادیہ کا گھر قریب آ گیا تھا۔ بائیں جانب مڑتے ہوئے وہ اُس کے گھر کے پاس آنے لگا۔

"بس یہیں روک دو۔ میں چلی جاؤں گی۔" وہ چند میٹر پہلے ہی بولی۔

وہ اَن سنی کرتے ہوئے گاڑی گیٹ تک لے گیا۔ موڈ اُس کا بھی خراب تھا۔ پر کرٹسی اپنی جگہ تھی!

گھر کے لئے چلا۔ تو ذہن بوجھ سا لئے تھا۔

کیسی محبت تھی نادیہ کی؟ اِس قدر بدزبانی! یہی باتیں وہ نرمی اور خوش گفتاری سے بھی کر سکتی تھی۔ تب شاید اُس پر اثر بھی زیادہ پڑتا۔ اگر وہ بھی اِسی لب ولہجے میں بات کرنا شروع کر دیتا تو؟ پھر شاید گالی گلوچ پر اتر آتی!

چند روز قبل بھی خاصی تلخی ہوئی تھی۔ نادیہ نے باہر ڈنر پر جانے کو کہا تھا۔ اور عین اُس وقت یاور خان کو ہوسپٹل سے کال آ گئی تھی۔ صبح جس پیشنٹ کا اُس نے آپریشن کیا تھا، اُس کو پرابلم ہو گئی تھی۔ اپنے مریض کو دیکھنے اُسے بہر حال جانا تھا۔ مریض دیکھنے کے بعد جب اُس نے سیل فون پر نادیہ کو اپنے دیر ہونے کا سبب بتایا۔ تو بجائے فراخدلی سے معاف کرنے کے وہ برس پڑی اُس پر۔ جواب میں اُس نے صرف فون بند کر دیا تھا۔ اُس کے فون بند کر دینے پر بھی وہ دو دن موڈ آف کئے رہی۔ تب بھی یاور خان نے ہی بات کرنے میں پہل کی تھی۔

قریباً ڈیڑھ ماہ قبل بھی اُس نے خوفناک لڑائی کی تھی اُس سے۔ تب بھی قصور نادیہ کا ہی تھا۔ ریسٹورانٹ میں ویٹر آرڈر لینے آیا۔ تو وہ دونوں کے لئے Hot & Sour soup منگوانے لگی۔ اُس نے کہا کہ وہ مرچیں نہیں کھا سکتا۔ تو وہ اصرار کرنے لگی۔ کہ



اُسے وہی لینا پڑے گا جو وہ لے رہی تھی۔ ورنہ وہ سمجھے گی کہ وہ اُس کی پرواہ نہیں کرتا۔ عجیب احمقانہ ضد تھی۔ اور جب وہ ایسا نہ کر سکا تو وہ سب چھوڑ چھاڑ ریسٹورانٹ سے باہر نکل آئی۔ ریسٹورانٹ میں موجود لوگوں کے سامنے اُسے سخت خفت اُٹھانا پڑی تھی۔ اور واپسی پر سارا راستہ جو وہ اُس کے ساتھ لڑتی آئی تھی وہ الگ۔ دنوں ناراضگی رہی تھی دونوں طرف پھر اُس کی ذہنی کوفت دیکھتے ہوئے ڈاکٹر جواد نے صلح کرا دی تھی دونوں کے بیچ۔

اور تو اور ــــ آج صبح وہ اُسے خاص طور سے شاندانہ سے ملوانے اُس کے کمرے میں لے گیا تھا تو اس پر بھی برا مان گئی تھی۔ اُس کے 'ہیلو' کا جواب بہت روکھے پن سے دیا تھا۔ اور باہر نکلی تھی تو اُس سے خاصی بحث کی تھی کہ کیا وہ اتنی ہی اہم تھی کہ وہ اُسے اُس سے ملوانے لے گیا تھا۔ بہتیرا کہا اُس نے کہ خود نادیہ چونکہ اُس کے لئے اہم تھی اس لئے اپنی پیشنٹ سے تعارف کروانے لے گیا تھا مگر ــــ وہ صبح سے لے کر اب تک اُسی بات کو لئے بیٹھی تھی۔ جتنا وہ Violence سے دور بھاگتا تھا۔ اتنا ہی وہ لڑنے جھگڑنے کو تیار رہتی تھی!

گہری سانس لیتے ہوئے اُس نے گاڑی دائیں جانب پرائیویٹ روڈ پر موڑ دی۔

ہمیشہ کی طرح غیر ارادی طور پر اُس کا ہاتھ بڑھا اور ــــ شیشہ نیچے کر دیا۔

بستی، کھیتیوں اور باغوں میں سے ہوتے بارش کے بھیگے جھونکے اُسے چھو چھو کر گزرنے لگے۔ وہ ذہن سے ہر بات جھٹکتے ہوئے دھیرے دھیرے پہاڑی پر آگے بڑھنے لگا۔

دور اوپر سامنے ہی انکل ذوالفقار کا گھر تھا۔ اُن کے پیچھے دائیں طرف انہوں نے اپنے بچوں کے لئے تین تین بیڈ رومز کے دو مکان بنوائے تھے۔ اُن میں سے ایک میں یاور خان کرائے پر رہتا تھا۔ انکل کے مین گھر کے اوپر بالکل ہل ٹاپ پر اُن کی دو بیڈ رومز کی اینکسی تھی۔ اور ــــ

پہاڑی کے پیچھے ڈھلان اور ڈھلان سے نیچے ندی کنارے کھیتوں، پھولوں ، پھلوں سے لدا اُن کا چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اینکسی اور یاور خان کے گھر کے اُس طرف پچھلی ڈھلان پر بنے انکل کے مزارعوں کے چھوٹے موٹے ، کچے پکے گھروندے تھے۔

انکل کے اور اُس کے گھر میں روشن بتیاں جگمگ جگمگ کر رہی تھیں۔

تھکا ہارا جب بھی وہ اِس سڑک پر ہو لیتا۔ وادی بھر کی خوشبوئیں لئے شبنمی ریشمی شام اُس کا استقبال کرتی۔

وہ چاہتا تو اُسے ہوسپٹل میں بھی رہنے کے لئے فلیٹ مل سکتا تھا۔ مگر جب امی نے کراچی سے آنٹی نور جہاں کو اُس کی اُن کے علاقے میں تعیناتی کا بتایا۔ تو انہوں نے اُسے اپنے ہی یہاں ٹھہرانے پر زور دیا۔ پھر جب اُس نے جگہ دیکھی تو قدرتی حسن سے مالا مال اِس وادی نے خود بخود اُس کے قدم روک لئے۔

بہت خوش تھا وہ یہاں۔ امریکہ جیسی مشینی دنیا میں کسی روبوٹ کی طرح زندگی گزارنے کے بعد وہ اِس بستی میں آیا۔ تو جسم کے ساتھ ساتھ جیسے روح تک آسودہ ہوگئی۔ منہ اندھیرے جب وہ اپنے گھر سے پگڈنڈی پر نیچے اُترتے ہوئے ندی کنارے سیب اور خوبانی کے باغات کے ساتھ ساتھ چلتا واک کرتا۔ تو سیب اور خوبانی کے شگوفے ، ندی کی سرمدی موسیقی ، اور ہوا کے دوش پر دور پار سے آتیں قدیم جنگلوں کی خوشبوئیں ، اُس سے عجیب پُراسراری سرگوشیاں کرتیں!

واپسی پر ڈھلان کی پگڈنڈی چڑھتا۔ تو یہاں وہاں بکھرے مزارعوں کے گھروں میں سے صبح کی پکوان کے اُٹھتے دھوئیں۔ بہت پُرفریب لگتے۔ اِدھر اُدھر چرتی بھیڑ بکریاں بہت معصوم لگتیں ، رختِ سفر باندھتیں بندروں کی ٹولیاں بہت شریر لگتیں!

یخ بستہ شام میں باہر نکلتا۔ تو شبنمی ہوائیں چھیڑ خانیاں کرتیں ، پھولوں باغوں جھرنوں کی خوشبوئیں مستی جگاتیں اور ___ چرندوں پرندوں کی بولیوں میں قدرت



بولتی نظر آتی!

خوابوں کا دیس تھی یہ پہاڑی بستی! لازوال حسن تھا اِس وادی کا!

احتیاط سے آگے بڑھتے ہوئے اُس نے پہلا موڑ کاٹا تو ___ ڈھلان پر بکھرے مزارعوں کے گھروندوں نے اپنے جلو میں لئے جھلمل جھلمل روشنیوں کے پٹ وا کر دیئے۔

ایک گہری سانس میں تمام سحر سمیٹتے ہوئے وہ سحر زدہ سا دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگا۔

آخری موڑ کاٹا ___ تو سحر ٹوٹا۔ سامنے ہی چند گز پر گیٹ کھولے اُس کا چوکیدار میوہ خان اُس کا منتظر کھڑا تھا۔

اُس نے گاڑی پورچ میں کھڑی کی اور سیدھا اوپر اپنے بیڈروم میں آ گیا۔

انگیٹھی میں لکڑیاں جل رہی تھیں۔ کوزی کمرہ اچھا لگ رہا تھا۔

واش روم جا کر اُس نے ہاتھ منہ دھوئے ، کپڑے تبدیل کئے اور اپنے نرم وگرم بستر میں گھستے ہوئے ٹی وی آن کر لی۔

تبھی حسبِ معمول حمید ، اُس کا کک ، اُس کے لئے کافی لے آیا۔

''تھینک یو'' ۔ وہ خوش ہو کر بولا۔

اِس وقت گرم سڑونگ کوفی پی لیتا تھا۔ تو جیسے ساری تھکن جاتی رہتی تھی۔

وہ مزیدار کوفی کے گھونٹ حلق سے اتارنے لگا۔ ساتھ میں ٹی وی پر بھی نظریں جمائے تھا مگر ___ بھلانے کی کوشش کے باوجود نادیہ کی کڑوی کسیلی باتیں ذہن میں در آتیں۔ اور وہ پریشان ہو جاتا۔

معاً ___ دروازے پر دستک ہوئی۔

''ڈاکٹر صاحب۔ میں ہوں۔'' یہ میوہ خان تھا۔ یاور خان کا فیورٹ!

چالیس سالہ میوہ خان بہت ہی سادہ لوح اور مخلص تھا۔ اِسی بستی کا باسی تھا۔ یاور خان کے گھر کا ہر کام خوشی خوشی کرتا رہتا تھا۔ ڈرائیونگ ، باغبانی ،

چوکیداری سب کچھ۔ اپنے بھانجے حمید کو بھی وہ ہی یاور خان کے یہاں کھانا پکانے لایا تھا۔ میوہ خان نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ بقول اُس کے پرائی لڑکی آ کر اُسے اپنی ماں سے جدا کر دیتی اور یہ اُسے کسی طور منظور نہیں تھا۔ ماں ہی اُس کی دنیا تھی اور ماں ہی اُس کی جنت تھی۔ یہ تلخ تجربہ اُس کے اپنے گھر ہی میں ہوا تھا۔ اُس کے بڑے بھائی کو بیوی الگ کر کے دوسرے گاؤں لے گئی تھی۔ اور بقول میوہ خان اُس کی ماں رو رو کر اندھی ہونے کو تھی۔

پچھلے دنوں میوہ خان کی ماں کو بخار ہو گیا تھا۔ یاور خان کو پتہ چلا تو اُسے دیکھنے چلا گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ میوہ خان چھکوں پھکوں رو رہا ہے۔

''میوہ خان! حوصلہ کرو بھئی۔ بخار ہے اُتر جائے گا۔'' یاور خان کو ہنسی بھی آ رہی تھی۔

''صاحب۔ اگر ماں کو کچھ ہو گیا۔ تو میں بھی زہر کھا لوں گا...''

''او تُو زہر نہ کھا۔ بس شادی کر لے۔ میں خود بخود ٹھیک ہو جاؤں گی۔'' ماں نے میوہ خان کو ڈانٹا۔ پھر یاور خان کی طرف دیکھا۔

''ڈاکٹر صاحب۔ مجھے کوئی بیماری نہیں ہے۔ بس اِس کو نصیحت کریں کہ میری زندگی میں شادی کر لے۔ ورنہ یہ ارمان میں دل میں ہی لے کر چلی جاؤں گی۔ اکیلا بیٹھا روتا رہے پھر...''

''خدا نہ کرے''۔ میوہ خان نے ماں کے منہ پر کس کر ہاتھ رکھا۔

''میوہ خان۔ بس اب سنجیدہ ہو جاؤ۔ شادی کر لو۔ ماں ٹھیک کہتی ہیں''۔ یاور خان نے بھی اُسے سمجھایا۔

''ٹھیک ہے صاحِب''۔ وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولا تھا۔ ''بس میری ماں ٹھیک ہو جائے۔''

''ابھی ٹھیک ہو جاتی ہیں تم فکر مت کرو''۔

اُس کی ماں کو ٹھنڈ لگ گئی تھی۔ یاور خان نے دوائیاں دیں۔ اور گھر واپس



آ گیا۔ صبح تک وہ واقعی ٹھیک ٹھاک تھی!

میوہ خان بہت خاص چیز تھا۔ بے حد مزے کی گپ شپ کرتا تھا، اور ہر ایک کی ragging کرتا تھا۔ کبھی کبھی یاور خان کے کمرے میں بھی آ جاتا تھا۔ بلکہ خود یاور خان نے ہی اُسے اجازت دی تھی کہ وہ اُس کے پاس آیا کرے۔ اپنے ساتھ وہ پوری بستی کی خبریں لاتا تھا۔ اور یوں یاور خان اُن کے رہن سہن، رسم ورواج، کس کی منگنی ہوئی، کس کے یہاں بچہ پیدا ہوا، کون کیا بیمار تھا، ہر بات سے باخبر رہتا تھا۔ یاور خان حتی الامکان اُن کی مدد کرتا تھا۔ اُن کا علاج کرتا تھا۔ اور اُن کے دکھ سکھ بانٹتا تھا!

''آؤ میوہ خان۔'' وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔

میوہ خان اندر آ گیا۔

''بیٹھو۔ اِس وقت واقعی مجھے تمہاری ضرورت تھی۔'' اُس نے کوفی کا خالی کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھا، ساتھ ہی انٹرکوم پر اُس کے لئے کچن سے چائے منگوائی۔

''صاحِب۔ میرا گُردہ بھی حاضر ہے۔ بتائیں میری ضرورت کیسے پیش آئی؟'' اُس کے قریب نیچے قالین پر بیٹھتے ہوئے وہ اپنے دیہاتی لب ولہجے میں بولا۔

اور — یاور خان اپنے حلق سے اُبلتے کئی قہقہے پی گیا۔

'میرا سر بھی حاضر ہے'۔ تو سنا تھا۔ وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ شاید یہ نیا محاورہ بنا تھا۔ یا پھر میوہ خان کی اپنی ایجاد تھی کہ سر کی جگہ گردے نے لے لی تھی۔

بہر حال —

''گپ شپ کے لئے اور کیا''۔ اُس نے کہا۔

''اچھا اچھا''۔ وہ مزید تسلی سے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

حمید چائے لا کر جا چکا تو میوہ خان نے گردن اٹھا کر دور تک دیکھا۔ کہ وہ سن تو نہیں رہا تھا۔

"صاحب ۔ میں بھی ایک ضروری ت سے آیا تھا آپ کے پاس۔ گرم چائے کی زوردار چسکی لیتا میوہ خان گویا ہوا۔ اُس کے لب و لہجے میں بہت راز داری تھی۔

"بولو۔" یاور خان کروٹ اُس کی طرف لیتے ہوئے بولا۔

صاحب ۔ اُس دن ماں نے کہا تھا نا کہ میں شادی کرلوں ورنہ وہ یہ ارمان دل میں لیکر چلی جائے گی خدانخواستہ ...."

"ہاں کہا تو تھا"۔ یاور خان کو دل ہی دل میں ہنسی آئی۔ وہ ضرور کوئی خاص شگوفہ چھوڑنے والا تھا۔

"بس اُسی وقت میں نے بھی دل میں قسم کھالی تھی کہ خدا میری ماں کو ٹھیک کرے۔ پھر میں ہر حال میں شادی کروں گا ..."

"اوہ"۔ یاور خان Excited نظر آنے لگا۔

"تو بس صاحب۔ میں نے لڑکی پسند کرلی ہے"۔

یہ ہوئی نا بات"۔

"اب پوچھیں کہ کس طرح پسند کی ہے؟"

"کس طرح پسند کی ہے؟" یاور خان اُس کے سٹائل کا عادی تھا، بالکل اُسی طرح بولا۔

"صاحب۔ دو چار روز پہلے حمید نے بتایا کہ کچن میں آٹا اور چینی ختم ہے۔ لانا ضروری ہے۔ وہ جانے لگا۔ تو میں بھی ساتھ چلا گیا ..."

"پھر۔ گھر خالی چھوڑ کر گئے تھے؟" یاور خان نے بیچ میں ہی ٹوک دیا۔

کہ حمید جب بھی نیچے پاس کے گاؤں میں کوئی خریداری کرنے جاتا، میوہ خان کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے ساتھ چل پڑتا۔ جبکہ یاور خان نے سختی سے منع کیا تھا کہ گھر خالی نہ چھوڑے۔

"نہیں صاحب ..." اُس نے یہ لمبی زبان نکالی۔ اُس کے منہ سے بات نکل



گئی تھی ورنہ اُس نے تو حمید کو بھی منع کیا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کو پتہ نہ چلے۔

"تو کس پر چھوڑ کر گئے تھے"۔

اور___ میوہ خان نے حسبِ معمول انگلی سے اوپر کی طرف اشارہ کیا۔

"اللہ پر"۔

اور___ یاور خان سے اس وقت پھر کچھ بن نہ پڑا۔

"اچھا۔ آگے سناؤ"۔

"ہاں۔" وہ یوں گویا ہوا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ "تو صاحب! بازار سے پہلے جب ہم گاؤں میں سے گزر رہے تھے۔ حمید آگے اور میں پیچھے تھا۔ تو اچانک ایک بڑا سرخ گلاب میرے سر پر آ کر گرا۔ میں نے جھک کر اٹھالیا۔ اور اُس رخ دیکھا جہاں سے گلاب آیا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ سیاہ چشمہ لگائے ایک پکی عمر کی لڑکی گھر کی دیوار پر سے مجھے مسکراتے ہوئے دیکھ رہی ہے۔ میں گھبرا گیا۔ گلاب اُس نے یقیناً حمید پر پھینکا ہوگا جو غلطی سے مجھے آ کر لگا۔ لیکن میں حیران رہ گیا کہ اُس نے اشارے سے مجھے بتایا کہ گلاب میرے لئے ہی تھا۔ میں نے شرما کر چہرہ کوٹ میں چھپالیا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا ..." اُس نے قدرے توقف کیا۔

"پھر؟" یاور خان اپنی ہنسی بمشکل روکے تھا۔

"اب اگلے دن کیا دیکھتا ہوں کہ میں یہاں بنگلے میں باہر کیاری میں گوڈی کر رہا تھا کہ اُس کی چھوٹی بہن مجھ سے ملنے آ گئی۔ وہ بڑی بہن کا پیغام لے کر آئی تھی۔ کہ اُس نے مجھے مہینہ بھر پہلے فلاں فلاں کی شادی میں دیکھا تھا اور اُسے پسند آ گیا تھا۔ اب وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے ..."

"واؤ"۔ یاور خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"خیر___ اُسی گاؤں میں میری پھوپھی کی بیٹی بیاہی ہے۔ ہماری آپس میں اچھی گپ شپ ہے۔ میں نے اُس سے کہا کہ تحقیق کرے۔ میں نے کہا کہ لڑکی

بہت فیشنی لگتی ہے۔ کالا چشمہ لگاتی ہے۔ لیکن خیر ہے اب جبکہ میں اُس کو پسند آ ہی
گیا ہوں تو مجھے منظور ہے۔ دو دن بعد پھوپھی زاد بہن نے مجھے بلا لیا۔ اُس نے
ساری تفتیش کر لی تھی۔ بولی۔ لڑکی ایک آنکھ سے چُوچی ہے۔ اِس لئے کہیں
آتے جاتے کالا چشمہ لگالیتی ہے۔ زبان میں بھی تھوڑی سی لکنت ہے اور سنتی بھی
ذرا اونچا ہے۔ اِسی لئے اب تک شادی بھی نہیں ہوئی۔ اب آگے تمہاری مرضی
...''

''پھر۔۔۔ تم نے کیا کہا؟''

''صاحِب۔ ذرا نسوار سونگھ لوں؟''

''سونگھ لو۔'' کہ بڑی مشکل سے تو اُس نے اُس کی منہ والی نسوار چھڑوائی
تھی۔ اب یہ بھی سونگھنے نہ دیتا تو میوہ خان ت مر جاتا۔

اُس نے جیب سے خوشبودار نسوار کی چھوٹی سی ڈبیہ نکالی۔ ذرا ذرا سی دونوں
نتھنوں میں سونگھی۔ ڈبیہ بند کر کے واپس جیب میں رکھی۔

''میں نے کہا کہ بس مجھے یہی لڑکی چاہئے۔ نہ ٹھیک سے سنے گی، نہ ٹھیک سے
بولے گی۔ نہ ماں سے جھگڑا ہوگا، نہ مجھ کو ماں سے جدا کرے گی۔''

''یار تم تو بہت عقلمند نکلے۔ میں خواہ مخواہ تمہیں سادہ سا سمجھتا رہا۔'' یاور خان
بولا۔

''اور پھر صاحِب۔ ثواب کا کام بھی ہے۔ تیس سے عمر اوپر ہے کوئی اور اُس
سے شادی بھی نہیں کر رہا''۔

یاور خان کو اُس کے خیالات اچھے لگے۔ پھر بھی۔۔۔

''یہ کہو۔ کہ گلاب کا کمال ہے سب''۔ یاور خان نے اُسے چھیڑا۔

وہ شرما کر سرخ ہو گیا۔

''سچ بتاؤں صاحِب۔'' وہ قدرے توقف کے بعد بولا۔

''ہاں۔''



''آپ کی بات ٹھیک ہے۔ ساری بات گلاب کی ہے''۔

یاور خان نے ہاتھ ملانے کو بڑھایا۔ میوہ خان نے بھی گرمجوشی سے ہاتھ
ملایا۔

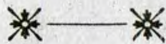
اور۔۔۔ دونوں ہی بشاشت سے ہنس دیئے۔

دیر تک دونوں ہنستے مسکراتے گپ شپ کرتے رہے۔

نو بجے حمید نے آ کر ٹیبل پر ڈنر لگ جانے کی اطلاع دی۔

''ماموں تُو بھی آ۔ کھانا تیار ہے''۔ اُس نے میوہ خان سے کہا۔

میوہ خان اُٹھ کر حمید کے ساتھ چلایا۔ اور یاور خان ہاتھ دھونے واش روم
چلا گیا۔



ہوسپٹل میں ایڈمٹ ہوئے آج شندی کا چھٹا دن تھا۔ وہ اب بہت بہتر تھی۔ ٹمپریچر بھی نارمل ہو چکا تھا۔ کھانسی بھی بس تقریباً ختم تھی۔

ناشتے کے بعد اُس نے مسٹرڈ رنگ کے پلین کپڑے اور میچ کرتی پھولدار شال لی۔ بالوں پر برش کیا۔ اور تیار ہو کر کھڑکی کے دائیں لگے صوفے پر آ بیٹھی۔

دس بھی کے بج چکے تھے۔ یاور خان ابھی تک راؤنڈ پر نہیں آیا تھا۔ قریبی میز پر سے میگزین اٹھاتے ہوئے وہ اوراق پلٹنے لگی مگر کچھ ___

الجھی الجھی سی تھی، بے کل سی تھی!

پورے میگزین کے تمام صفحوں پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد اُس نے اُسے واپس میز پر رکھ دیا۔



اٹھتے ہوئے کھڑکی کے پاس کھڑی ہوگئی۔

سامنے کے جنگل میں بگلہ سے سفید بادل تیر رہے تھے۔ نیچے ہوسپٹل کے احاطے میں گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ سائیڈ واکس پر لوگ چل پھر رہے تھے۔ کچھ ٹولیوں میں لانز میں بیٹھے تھے۔ گاڑیوں میں، سائیڈ واکس پر اور لان میں بیٹھے لوگ۔ شاید مریضوں کے لواحقین تھے یا پھر ساتھ میں کچھ مریض بھی تھے۔ بہر حال___

دروازے پر دستک سے اُس کی محویت ٹوٹی۔ مڑ کر دیکھا۔

سسٹر نرگس تھی۔ اِن چند دنوں میں ہی وہ اُس کی دوست بن گئی تھی۔ بقول نرگس کے وہ اُن کی سب سے پیاری اور خوش اخلاق پیشنٹ تھی۔

''سسٹر۔ ڈاکٹر خان نہیں آئے؟'' اسے دیکھتے ہی وہ بول اٹھی۔ صبح سے وہ تیسری بار یاور خان کا پوچھ رہی تھی۔

وہ مسکرادی۔

''آ جائیں گے۔ آپ فکر مت کریں۔ کوئی ایمرجنسی ہوگئی ہوگی''۔ وہ تسلی آمیز لہجے میں بولی۔

''اوہ''___

سسٹر نے واش روم کے قریب والی الماری کھول لی۔

''ساتھ والے کمرے میں کمبل اور تکیہ چاہئے''۔ وہ الماری میں سے فالتو کمبل اور تکیہ اٹھاتے ہوئے بولی۔ ''یہ میں لیکر جا رہی ہوں''۔

''لے جائیں۔ ویسے ہی پڑے ہیں''۔

''اور... آپ ٹھیک ٹھاک تو ہیں نا''۔ وہ کمبل اور تکیہ اُس کے بیڈ کے پاؤں کی طرف رکھ کر مسکراتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ سسٹر میرے سٹچز کب کھلیں گے؟'' وہ جیسے جلد سے جلد سٹچز سے نجات حاصل کرنا چاہتی تھی۔

''یہ تو ڈاکٹر خان ہی بتائیں گے''۔

''وہ آئیں گے تو بتائیں گے نا''۔ شندی کے لہجے میں جھنجلاہٹ سی تھی۔

نرگس مسکرا دی۔

''ویسے... ڈاکٹر خان آپ کا بہت خیال رکھتے ہیں...''

''ہوں''۔ وہ مانتی تھی۔

''میں نے پہلی بار ڈاکٹر خان کو کسی پیشنٹ کے ساتھ ایسے فری ہو کر باتیں کرتے دیکھا ہے ورنہ تو...'' وہ بات ادھوری چھوڑ کر مسکرا دی۔

''ورنہ تو؟'' شندی نے دلچسپی سے پوچھا۔

''ڈاکٹر خان بہت سوبر قسم کے ہیں۔ سٹاف کی تو جان نکلتی ہے اُن سے۔ ڈیوٹی میں کوتاہی بالکل برداشت نہیں کر سکتے۔ خود بھی کام کرتے ہیں، دوسروں سے بھی کام لینا جانتے ہیں۔ رات کو بے شک کوئی اور سرجن آن کال ہو، اپنے مریض کے لئے ڈاکٹر خان کہتے ہیں اُنہیں خود بلایا جائے، رات کا چاہے کوئی بھی پہر ہو...''

''اچھا...'' وہ امپریس سی نظر آ رہی تھی۔

''لیکن ہیں بہت اچھے دل کے۔ سب کا خیال بھی بہت رکھتے ہیں''۔

''خیال بھی رکھتے ہیں۔ پھر بھی سٹاف کی جان نکلتی ہے''۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

نرگس خوشگواری سے ہنس دی۔

''بہت، بہت، بہت سٹرکٹ ہیں ڈاکٹر خان۔'' وہ ہنستے ہنستے ہی بولی۔ ''اور اب میں چلتی ہوں۔ ورنہ بیکار کھڑے دیکھ لیا تو شامت آ جائے گی میری''۔

کمبل تکیہ اٹھاتے ہوئے وہ واقعی چلدی۔ اور شندی دیر تک یاور خان کے بارے میں سوچتی رہی۔

اُس کے ساتھ وہ واقعی اچھی گپ شپ کرتا تھا۔ مگر ___ انداز میں اتھارٹی



ور آنکھوں میں کمانڈ اپنی جگہ تھا!

اور پھر ___ ڈیوٹی تو ڈیوٹی ہوتی ہے۔ سٹرکٹ تو ہونا چاہیئے۔ انسانی زندگیوں کا معاملہ ہوتا ہے!

ویسے ___ اُس کی باتیں بہت اچھی ہوتی تھیں۔ مختصر، ذومعنی اور دلچسپ!

اُس نے گہری سی سانس لی۔ سامنے وال کلاک پر نگاہ کی۔ گیارہ بج چکے تھے۔ وہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔

وہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ آئی۔ چیسٹ پر رکھے کیتل میں ایک کپ پانی ڈالا۔ اور ابالنے کو رکھ دیا۔

کپ میں کوفی اچھی طرح پھینٹی اور دودھ اور چینی ملاتے ہوئے اوپر سے کھولتا ہوا پانی ڈال دیا۔

کپ میں چمچ چلاتی وہ صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔

کوفی کی سحر انگیز خوشبو من میں اتارتی وہ گھونٹ گھونٹ کر کے پینے لگی۔

حویلی میں اتنا عرصہ کسی نے اُسے کوفی کو پوچھا تک نہیں تھا۔ کتنا اُس کا دل کرتا تھا بسا اوقات!

دوسرے ہی لمحے اُس نے خیال جھٹکا۔ اُسے اُن منحوس گھڑیوں کو یاد نہیں کرنا چاہیئے تھا!

بارہ بجتے ہی لنچ آ گیا۔ یہاں پر کھانا بہت early سرو ہوتا تھا۔ وہ بھی پڑا ہی رہنے دیتی تھی۔ اتنی جلدی تھوڑی دل کرتا تھا کھانے کو۔

اُسی وقت سسٹر نرگس بھی آ گئی۔ بریک پر جانے سے پہلے وہ ضرور اُسے جھانک لیتی تھی۔

''آج شام کو بھی میری ڈیوٹی لگ گئی ہے۔'' اُس کا حال احوال پوچھنے کے بعد وہ گویا ہوئی۔

''کیوں؟''

"سسٹر نادرہ نہیں آرہی۔ کوئی ضروری کام پڑ گیا ہے"۔

"اوہ۔"

"کھانا پھر نہیں کھایا؟" نرگس کی نظر ٹرالی پر پڑی۔

"دل نہیں کر رہا"۔

"ٹھیک ہے۔ میں بریک کے بعد گرم کر کے لا دوں گی"۔ وہ اکثر اُس کا کھانا گرم کر دیتی تھی۔

"you are so sweet sister." وہ ممنون سی بولی۔

"ویسے کسی دن ڈاکٹر خان نے دیکھ لیا نا۔ تو میری خیر نہیں"۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "اچھا___ چلوں اب"۔

"تھینک یو سسٹر"۔ شندی نے کہا۔

اور___ سسٹر نرگس دروازے کی طرف بڑھی۔

شام کے چھ بج چکے تھے۔ شندی کھڑکی میں کھڑی اُس پار دیکھ رہی تھی۔

نم بوجھل گھٹائیں آج پھر جنگل کو نظروں سے اوجھل کئے تھیں۔ تاریکیاں وقت سے پہلے گھر آئی تھیں۔ جھلمل جھلمل کرتی روشنیاں البتہ راستوں کا تعین کر رہی تھیں۔

دروازے پر دستک کے ساتھ ہی وہ پلٹی۔

یاور خان تھا۔ اوور کوٹ کا کالر اوپر کئے، دونوں جیبوں میں ہاتھ دیئے اندر داخل ہوا تھا۔

جانے کیوں؟ اُس کا دل یکبارگی دھڑکا، آنکھوں میں دیپ سے جل اُٹھے۔

"ہیلو میم صاحب۔" وہ پاس آ گیا۔

"ہائے"۔ اُس کی لمبی خمیدہ پلکیں اُس کی خوبصورت آنکھوں پر سائباں بنا گئیں۔



"کیسی طبیعت ہے؟" وہ اُس کی جھکی پلکوں کو دیکھنے لگا۔

"I'm fine." اُس نے خود کو سنبھالا۔

"Good۔ بیٹھو"۔

وہ کھڑکی کے قریب صوفے پر بیٹھ گئی۔

یاور خان بھی دیوار کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

تبھی___ نرگس اُس کا فائیل لئے اندر آ گئی۔ یاور خان نے مانگی تھی اُس کی فائیل۔ اُس نے اُسے پکڑا دی۔

"صبح سے آپ کے لئے پریشان ہو رہی تھیں۔ بار بار آپ کا پوچھ رہی تھیں"۔ نرگس نے یاور خان کو بتایا۔

کھلے فائیل پر سے نظریں اٹھاتے ہوئے اُس نے شندی کی طرف دیکھا۔

بلش ہوتی وہ اپنے ناخنوں سے کھیل رہی تھی۔

آج کچھ بدلی بدلی سی لگ رہی تھی۔ وہ ہولے سے مسکرا دیا۔

سسٹر کو چند ہدایات دیں، فائیل پکڑائی، اور تھکی تھکی ٹانگیں سیدھی پھیلا دیں۔

نرگس سمجھ گئی اُس کا ارادہ بیٹھنے کا تھا۔ مؤدب طریق سے باہر نکل گئی۔

"کتنی بار پوچھا تھا میرا، ہاں؟" چپ چپ سی شندی پر نظریں جمائے وہ شرارت سے بولا۔

اُس نے جھکی پلکیں اوپر اٹھائیں۔ خود کو سنبھالا۔ گو حسین چہرے پر اب بھی قوس وقزح کے سارے رنگ موجود تھے۔

"یاد نہیں"۔ وہ صاف مکر گئی۔

وہ دلآویزی سے مسکرایا۔

"پریشان تو ہوئی تھیں نا؟" وہ اُسے چھیڑ رہا تھا۔

"یاد نہیں"۔ اُس نے پھر دہرایا۔

وہ خوشگواری سے ہنس دیا۔
''اچھا کوفی پیتے ہیں۔ پھر تمہیں یاد آ جائے گا سب''۔ سامنے چیسٹ پر کوفی کاٹن دیکھ کر اُسے اچانک کوفی کی طلب ہوئی۔ اُٹھنے لگا۔
''پلیز! آپ بیٹھیں۔ میں بناتی ہوں''۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
''آتی بھی ہے، بنانا یا...''
پتہ نہیں اتنے سارے ملازموں، ماماؤں میں اُس نے کبھی کوئی کام اپنے ہاتھ سے کیا بھی تھا یا نہیں؟
''کوفی بنا لیتی ہوں''۔ وہ مسکرا دی۔ ''لنڈن میں اکیلی تھی، تو کوفی بنانا سیکھ لیا تھا''۔
شندی نے کیتل میں پانی ڈال کر اُبالنے کے لئے رکھ دیا۔
''میرے لئے بلیک کوفی۔ اینڈ نو شوگر''۔ اُس نے بتانا ضروری سمجھا۔
''مجھے اندازہ تھا''۔
''کیسے؟''
''پتہ نہیں''۔
''یاد نہیں، پتہ نہیں ___ کبھی ہاں بھی کہہ دیا کرو۔'' وہ اُسے کام کرتے دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔
وہ بے ساختہ ہنس دی۔
تبھی ___ ہاتھ میں نوٹ بک لئے اُس دن والا اِنٹرنی آ گیا۔ یہ ایک سکول سٹوڈنٹ تھا، اِنٹرن شپ کر رہا تھا یہاں، مریضوں کی شکایات نوٹ کرتا تھا۔ پچّہ پاس!
''میڈم اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟'' اُس نے خوش خلقی سے پوچھا۔
''اچھی ہوں، تھینک یو''۔
یاور خان اس دوران کھڑکی سے اُس پار دیکھنے لگا تھا۔



''میڈم۔ کوئی کمپلینٹ تو نہیں؟'' اُس نے حسبِ سابق پوچھا۔
''اُم م م۔'' وہ جیسے کچھ سوچنے لگی۔ ''ہے۔ آج ڈائیٹیشنر نے میرا لنچ کسی اور روم میں اور اُس روم کا لنچ مجھے بھیج دیا تھا...''
انٹرنی جلدی جلدی اپنی نوٹ بک میں لکھنے لگا۔
باہر دیکھتے دیکھتے ہی یاور خان کے کان کھڑے ہوئے۔
''اور؟'' سٹوڈنٹ نے پوچھا۔
''اور یہ کہ... باہر کاؤنٹر پر نرسیں رات کو زور زور سے بول کر سونے نہیں دیتیں...''
''اور؟'' انٹرنی کو جیسے اچھا لگ رہا تھا۔ آج تو خاصی شکایتیں تھیں!
''اور... اور یہ کہ آج ڈاکٹر خان نے اپنا صبح کا راؤنڈ نہیں لیا''۔
اور ___ یاور خان کا جاندار قہقہہ بلند ہوا۔
سٹوڈنٹ سمجھ گیا بات میں کچھ گڑبڑ تھی۔ وہ بھی مسکرا دیا۔ پھر آخری بات نوٹ کئے بغیر ہی خدا حافظ کہتا باہر نکل گیا۔
اور ___ شندی آرام سے کیتل کی طرف متوجہ ہوگئی۔
''Shandana you are naughty.'' یاور خان بولا۔
اور ___ کیتل کی طرف ہی رخ کئے وہ چپکے سے مسکرا دی۔
پانی ابل چکا تھا۔ وہ کپس میں ڈالنے لگی۔
''آپ... یہاں اِس طرح بیٹھے ہیں۔ کوئی اعتراض تو نہیں کرے گا۔ کہ آپ پیشنٹ کے کمرے میں بیٹھے ہیں''۔ اُسے ویسے ہی خیال آ گیا۔
''نہیں ___ اِس وقت میں تمہارا وِزِٹر بن کر آتا ہوں''۔
''اوہ... بائے داوے... آج آپ صبح ڈاکٹر بن کر کیوں نہیں آئے؟''
ایک بار پھر اُس کا خوشگوار قہقہہ بلند ہوا۔ آخر اُس نے پوچھ ہی لیا تھا!
''ایک ایمرجنسی کیس آ گیا تھا۔ خاصا کومپلیکیٹڈ کیس تھا۔ چار بجے تک میں

آپریشن تھیٹر میں رہا۔ اُس کے بعد آفس گیا۔ اب چھ بجے چھٹی ہوئی ہے، تو تمہارے سامنے ہوں''۔ اُس نے تفصیل سے بتایا۔

''اور... اگر وہ... ڈاکٹر نادیہ آ گئیں؟'' وہ کپ میں چمچ چلاتے ہوئے بولی۔

اُسے ہنسی آ گئی۔

''اُس سے میں ڈرتا ہوں کیا؟''

شاید... کچھ کچھ''۔ اُس کا کپ اُسے تھماتے ہوئے اُس نے بھی اُسے چھیڑا۔

پہلی ملاقات میں نادیہ نے اُس کی 'ہیلو' کا جواب لاپروائی سے دیا تھا۔ جیسے وہ اتنی اہم نہ تھی کہ یاور خان اُس سے اُس کا تعارف کرواتا۔ دوسری بار گو وہ اُس کو دیکھ نہیں پائی تھی۔ مگر اُس کی بات میں طنز صاف محسوس کیا تھا۔ اور یہ بھی کہ وہ شندی ہی کی وجہ سے ایسا کر رہی تھی۔

وہ خاصی دلچسپ باتیں کرتی تھی۔ ایک بار پھر وہ دلآویزی سے ہنسا۔

''نہیں۔ کچھ کچھ بھی نہیں''۔

''ایک بات کہوں؟'' اپنا کپ لیکر وہ صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔

''ہاں۔ کہو''۔

''اُن کو میں اچھی نہیں لگتی''۔

اچھی ابزرویشن تھی اُس کی!

وہ دھیرے سے مسکرایا۔

''تمہیں کیسی لگتی ہے؟''

شندی نے خوبصورتی سے کندھے اچکائے۔

''وہ ایک ڈاکٹر ہیں اور میں ایک پیشنٹ۔ بس!''

''ہوں...''



''اُن کو میں کیوں اچھی نہیں لگتی؟'' قدرے توقف کے بعد وہ پھر بولی۔ جانے کیا جاننا چاہتی تھی وہ؟

''اُم م م___ پوائنٹ ہے۔ تم کیوں اُسے اچھی نہیں لگتیں۔ سوچنا پڑے گا...''

''وہ آپ کو Like کرتی ہیں؟'' اُس نے اچانک پوچھا۔

وہ مسکرا دیا۔ سوال خاصا ذاتی تھا۔ لیکن پتہ نہیں کیوں اُسے اچھا لگا۔

''تمہارا کیا خیال ہے؟''

''I'm sure about it.'' وہ وثوق سے بولی۔

اُس کی گھنی پرکشش بھوئیں اوپر اُٹھ گئیں۔

''آپ بھی اُن میں Interested ہیں؟''

یاور خان چونک کر اُسے دیکھنے لگا۔

گوڈ! خود اُس کی بہت خوبصورت آنکھوں میں اُس کے لئے دلچسپی بہت واضح تھی!

جب وہ کمرے میں داخل ہوا تھا تو اُس کی آنکھوں میں دیپ سے جل اٹھے تھے۔ جب اُس نے اُسے 'ہیلو' کہا تھا تو جواب دیتے ہوئے اُس کی لمبی خمیدہ پلکیں اُس کی خوبصورت آنکھوں پر سائباں بنا گئی تھیں۔ جب سسٹر نے اُسے بتایا تھا کہ وہ بار بار اُس کا پوچھ رہی تھی۔ تو بلش ہوتی۔ وہ اپنے ناخنوں سے کھیلنے لگی تھی۔ اُس وقت بھی اُس نے محسوس کیا تھا آج وہ کچھ بدلی بدلی سے لگ رہی تھی۔

بہر حال___

''چھوڑو، کام کی بات کرتے ہیں۔'' وہ بات کا رخ بدلنے کی خاطر بولا۔'' کل صبح تمہارے سٹچز کھل جائیں گے۔ بارہ بجے تک میں تمہیں یہاں سے لے جاؤں گا۔ you are perfectly fine now. دوائیاں تم گھر پر بھی لے سکتی ہو''۔ اُس نے خالی کپ میز پر رکھا۔

وہ سمجھ گئی وہ بات کو ٹال گیا تھا۔ شندی نے بھی کمال ضبط سے اپنی

feelings پر قابو پالیا۔ کھڑکی کی طرف دیکھنے لگی۔

باہر پھر آسمان میں آتش بازیاں ہونے لگی تھیں۔ بجلیاں کڑک گرج رہی تھیں۔ اور موٹی موٹی بوندیں پڑنے لگی تھیں۔

''یہاں بہت frequently بارش ہوتی ہے''۔ شندی نے بھی بات بدل لی۔

''رات ڈر تو نہیں لگے گا؟''

''لگے گا تو''۔ وہ بالکل دو چار روز پہلے کی طرح یوں بولی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

''پھر؟'' وہ بھی پہلے ہی کی طرح بولا۔

''کیا ہو سکتا ہے''۔ وہ مسکرائی۔

''میں سسٹر سے کہوں گا وہ رات کو تمہارا خیال رکھے گی''۔

''نہیں۔ میں کچھ کر لوں گی''۔

''کیا کرو گی؟''

''جو اُس رات کیا تھا۔'' وہ خوبصورتی سے مسکرائی۔

''اُس رات کیا کیا تھا؟'' شندی کے ساتھ چھوٹی چھوٹی باتیں کر کے اُسے ڈھیر ساری خوشی کا احساس ہوتا تھا۔

''آپ ہنسیں گے تو نہیں؟''

''نہیں ہنسوں گا''۔

''پرومس؟''

''پرومس۔''

''میں نے لائیٹ آن رکھی تھی۔ اور کمبل میں سر تک چھپا لیا تھا۔ پھر تکیے چمٹا کر آنکھیں زور سے بند کر لی تھیں...''

پتہ نہیں کیوں؟ اُسے اُس پر ترس سا آیا۔ ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے شفقت



سے اُس کا ہاتھ سہلایا۔

''بس آج کی رات اور۔ کل انشاء اللہ تم گھر پر ہو گی۔ انکل ذوالفقار کا گھر تمہاری ایجنسی کے بالکل دامن میں ہے۔ اور میرا گھر تمہارے بالکل قریب۔ چوکیدار نے آج سے ہی تمہارے یہاں ڈیوٹی شروع کر دی ہے۔ اور ماما الفت کل شام کو ٹرین سے پہنچنے والی ہیں...''

''ماما الفت آ رہی ہیں؟'' مارے خوشی کے اُس کی بہت حسین آنکھیں نم ہو گئیں۔ ''اُن کا پتہ آپ نے کیسے لگایا؟'' آنسو لڑھک کر اُس کے گالوں پر آ رہے۔

یاور خان نے اپنی انگلیوں کی پوروں سے اُس کے آنسو خشک کیے۔

''میں نے سب کا پتہ لگا لیا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے میں فارغ بیٹھا ہوں۔ اکرم بابا کا بھی پتہ چلا لیا ہے۔ وہ اپنے گھر پر ہی ہوتے ہیں۔ نواز مجھے سب بتاتا رہتا ہے۔ مسز علی تو تمہارے چچا کے حویلی پہنچنے سے قبل ہی کہیں غائب ہو گئی تھی۔ تمہارے چچا کسی گارڈ کے ساتھ تمہارے فرار پر بہت پریشان ہیں۔ نواز کو بھی نوکری سے نکال دیا ہے۔ تمام گارڈز کی بھی چھٹی کر دی گئی ہے۔ نئے دو گارڈز رکھ لئے گئے ہیں۔ اور کوئی نہیں ہے اب حویلی میں۔ میں نے تمہارے بارے میں سب انکل ذوالفقار کو بتا دیا ہے۔ وہ سپریم کورٹ کے جج رہے ہیں۔ تمام قانونی باریکیوں سے واقف ہیں۔ خاصی تسلی دی ہے مجھے اِس سلسلے میں۔ سو۔۔۔ تم بے فکر ہو جاؤ۔ اپنے سب دُکھ سب پریشانیاں مجھے دیدو۔ تم بس خوش رہا کرو۔ ہنستی رہا کرو۔ تمہیں پتہ ہے تم ہنستی ہو تو کتنی اچھی لگتی ہو...''

شندی کو روتے میں ہنسی آ گئی۔

دھوپ چھاؤں کا یہ امتزاج بہت حسین تھا۔ اُس نے شرارت سے آنکھیں جھپکیں۔

''لڑکی تم تو بہت خوبصورت ہو۔ کیا بنے گا؟''

وہ مزید ہنس دی۔

اور ـــــ وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ کھڑکی کے پردے بند کر دیئے۔

''پردے بند ہی رکھو تو اچھا ہے۔ اتنی خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر کسی کا دل بے ایمان ہو گیا تو؟''

اب کے وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

''اور یہ جلترنگ بھی کسی اور کے سامنے مت بجانا۔'' اُس کا اشارہ اُس کی مترنم ہنسی کی طرف تھا۔

''آپ کے سامنے خیر ہے؟'' وہ یوں ہی بولی۔ مگر ـــــ

جانے کیوں؟ یاور خان چونک سا گیا۔

''آں ـــــ ہاں۔'' وہ خوشگواری سے ہنس دیا۔

شندی بھی اُس کی بے سروپا باتوں پر دیر تک ہنستی رہی۔

''اب چلوں گا میم شاندانہ''۔ وہ سنجیدہ ہو گیا۔ ''کل تیار رہنا۔ گھر چلیں گے، ہاں۔''

''جی۔''

"Take care of your self." اُس نے اپنائیت سے اُس کا گال تھپتھپایا۔ ''Good night'' اُس نے مزید کہا۔ اور ـــــ

قدم دروازے کی طرف بڑھا دیئے۔

''گڈ نائیٹ''۔ شندی آہستہ سے بولی۔

باہر نکلتے ہوئے وہ نرسز کاؤنٹر پر آ گیا، سسٹر نرگس کو کل شندی کا ڈسچارج سلپ تیار رکھنے کو کہا اور ـــــ

لفٹ سے نیچے آ کر گاڑی میں بیٹھتے ہوئے گیٹ سے باہر نکل گیا۔

شہر سے مضافات میں آیا ہی تھا کہ برف کے Flakes گرنا شروع ہوئے۔ دائیں بائیں پہاڑیوں کے بیچ پتلی چکردار سڑک پر وہ احتیاط سے



ڈرائیو کرتا آگے بڑھ رہا تھا۔

بائیں جانب نادیہ کے گھر کو راستہ جاتا تھا۔ اُس نے ایک نظر اُس طرف ڈالی اور آگے نکل گیا۔

آج بھی نادیہ نے اُسے گھر ڈراپ کرنے کو فون یا کوئی میسج نہیں دیا تھا۔ شاندانہ کی وجہ سے جو دونوں میں تکرار ہوئی تھی۔ اُس کے بعد سے نادیہ پھر اُس سے بات نہیں کر رہی تھی۔ شاید وہ Expect کر رہی تھی کہ حسبِ معمول وہ اُسے فون کرے گا، منائے گا۔ مگر اِس بار اُس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ معمولی سی بات پر اُسے 'شٹ اپ' اور 'بکواس نہیں کرو' کہنے کا حق وہ اُسے نہیں دے سکتا تھا۔ آج آپریشن تھیٹر میں وہ پھر اُسے Ignore کر رہی تھی۔ مگر اُس نے بھی کوئی پرواہ نہیں کی تھی۔ مگر Tense ضرور تھا۔ مگر ـــــ

شام کو شندی سے ملا۔ تو ساری کوفت جاتی رہی۔

کتنی ڈیسنٹ تھی۔ کتنی پیاری باتیں کرتی تھی۔ کوالٹی لائف کی عادی ہونے کے باوجود کتنی modest سی تھی!

'آپ بھی اُن میں Interested ہیں؟' شندی نے اُس سے نادیہ کے بارے میں پوچھا تھا۔

یاور خان چونک کر اُسے دیکھنے لگا تھا۔ اُس کی بہت خوبصورت آنکھوں میں اپنے لئے دلچسپی دیکھ کر جانے کیوں وہ گلٹی سا محسوس کرنے لگا تھا۔

'چھوڑو، کام کی بات کرتے ہیں'۔ وہ بات کو ٹال گیا تھا مگر ـــــ

وہ صاف سمجھ گئی تھی۔ کہ وہ نادیہ میں Interested تھا۔ کتنے ضبط سے اُس نے اپنی feelings پر قابو پانے کی کوشش کی تھی۔ اُس وقت پتہ نہیں کیوں اُسے اپنا آپ بہت بے حس سا لگا تھا!

اُس کے بعد ـــــ وہ بالکل یوں بول رہی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

اتنی سی عمر میں کتنے ٹھنڈے مزاج کی، اور باوقار سی تھی!

دائیں جانب گھر کی طرف جانے والی سڑک پر گاڑی موڑ لی۔ تو شیشہ ذرا سا کھول دیا۔

حسبِ معمول باغوں، دریاؤں اور جنگلوں سے آتی خوشبوؤں نے اُسے موہ لیا۔ برف خاصی تیز پڑنے لگی تھی۔ اُس نے شیشہ دوبارہ بند کیا۔ اور موسم کے سحر سے مسحور دھیرے دھیرے اوپر بڑھنے لگا۔

ڈنر پر آج حمید نے وجیٹیبل سوپ اور چکن منچورین کے ساتھ چاول بنائے تھے۔ یہ سب وہ یاور خان کے کہنے پر انکل ذوالفقار کی بیگم، آنٹی نور جہاں سے سیکھتا رہتا تھا۔

کھانے کے بعد وہ اوپر اپنے بیڈروم میں آیا۔ رین کوٹ پہنا، ہڈ سر پر درست کیا، اور جیبوں میں ہاتھ دیتے ہوئے بالکنی میں آ کھڑا ہوا۔

برفباری اب بھی جاری تھی۔ کیا بستی کی چھتیں، کیا قد آور درخت، کیا کھائی کیا ڈھلان، سبھی برف سے ڈھک گئے تھے۔ ایسے میں اوپر تلے بکھرے مدھم سے روشن گھروندے کسی ماہر فنکار کا شاہکار لگ رہے تھے۔

یہاں قدرت اپنے سحر و افسوں کے سارے رنگ لئے تھی!

کچھ دیر وہ وہیں کھڑا اطراف پر نظریں جمائے رہا۔

پھر ___ اندر آ گیا۔ کپڑے تبدیل کئے، نائیٹ سوٹ پہنا، اور نرم و گداز بستر میں پشت تکیوں سے ٹکاتے ہوئے ٹی وی دیکھنے لگا۔ نیوز سنتے سنتے ہی اُس نے حسبِ معمول ہوسپٹل فون کیا۔ آج جس مریض کا آپریشن کیا تھا، اُس کا حال دریافت کیا، اپنی تسلی کی۔ پھر ٹی وی اور لائیٹ آف کی اور بستر میں لیٹتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

تبھی اُسے نادیہ کا خیال آ گیا۔ کر لے اُس سے بات؟ کچھ قصور اُس کا بھی تو ہوگا۔ تلخی بڑھانے سے فائدہ؟ ہاتھ بڑھاتے ہوئے اُس نے ریسیور اٹھا لیا۔

لیکن ___ بجائے صلح کرنے کے وہ الٹی پڑ گئی تو؟ رات بھی پریشانی میں



گزرے گی۔ اُس نے ارادہ بدل دیا۔ ریسیور واپس کریڈل پر رکھ دیا۔

’میں نے لائیٹ آن رکھی تھی۔ اور کمبل میں سر تک چھپا لیا تھا۔ پھر تکیہ چمٹا کر آنکھیں زور سے بند کر لی تھیں۔‘

جانے کہاں سے شندی کی بات اُس کے کانوں میں گونجی۔

غیر ارادی طور پر ایک بار پھر اُس کا ہاتھ بڑھا۔ ریسیور اٹھایا۔ اور شندی کے کمرے کا نمبر ڈائیل کر دیا۔

''Who is this?'' شندی کی سہمی سہمی سی آواز آئی۔ کہ رات کے گیارہ بجے اُسے کون فون کر سکتا تھا؟

''This is Yaawar speaking.'' اُس کا ڈر دور کرنے کو وہ خوشگواری سے بولا۔

''اوہ''۔ نجات کے ساتھ ساتھ اُس کی آواز میں خوشی کا عنصر بھی تھا۔

''بارش اب بھی ہو رہی ہے؟'' اُس نے پوچھا۔

''ہاں''۔

''تمہیں ڈر تو نہیں لگ رہا؟''

''نہیں''۔ وہ مسکرا دی۔

''بڑی بولڈ ہو گئی ہو''۔

وہ مسکرا دی۔ چپکے سے۔

''سسٹر آتی رہتی ہے؟'' اُس نے مزید پوچھا۔

''ابھی ابھی ہو کر گئی ہے''۔

''اِسی لئے ڈر نہیں لگ رہا۔ میں سمجھا واقعی بولڈ ہو گئی ہو''۔

''مجھے صرف آسمان گرجنے سے ڈر لگتا ہے''۔ وہ سادگی سے بولی۔

''اِس وقت تو نہیں گرج رہا؟'' اُس کے لہجے میں شرارت تھی۔

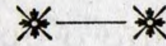
''نہیں''۔ وہ خوبصورتی سے ہنس دی۔

"اوکے۔بس یہی پتہ کرنا تھا"۔

"تھینک یو سو مچ۔"

"گڈ نائیٹ۔" یاور خان نے کہا اور فون بند کر دیا۔

پتہ نہیں کیوں؟ اُسے گہرے سکون کا احساس ہوا۔ایک بار پھر آنکھیں بند کیں۔اور دھیرے دھیرے نیند کی وادی میں اُترنے لگا۔





دوپہر کا ایک بج رہا تھا جب یاور خان شندی کو انکل ذوالفقار کی اینکسی میں لے آیا۔ چوکیدار اُس کا مختصر سا سامان اندر لایا۔ یاور خان نے اُسے اینکسی اندر سے دکھائی۔ دو بیڈ رومز، لونگ روم، جدید طرز پر بنا پیارا سا کچن اور مین روڈ کے رخ کھلتا ٹیرس!

وہ ٹیرس پر سے سامنے دیکھنے لگی۔ اینکسی کے بالکل نیچے انکل ذوالفقار کا گھر تھا۔ ان کے بائیں قدرے اوپر یاور خان مقیم تھا۔ سب سے اوپر ٹاپ پر اینکسی تھی۔ سبھی گھروں کے ٹیرس نیچے بل کھاتی مین روڈ کے رخ پر تھے۔ تمام بیڈ رومز کی بالکنیاں پیچھے بستی کی طرف ڈھلانوں، کھیتیوں اور باغوں کے رخ کھلتی تھیں۔ اور گہری سبز ہریالیوں میں سے جھانکتیں گھروں کی سرخ کھپریل کی

ڈھلانی چھتیں بہت دلکش لگ رہی تھیں!

"Every thing is so enchanting here." وہ مبہوت سی بولی۔

"میں نے کہا تھا نا تم سے کہ تمہیں یہ جگہ پسند آئے گی"۔

"لیکن ... میں ... کب تک یہاں رہوں گی؟ ... آگے کیا کروں گی؟"

کتنے مسائل تھے اُس کے آگے۔ زبان پر آ ہی گئے۔

"پلیز! اِس سے آگے ایک لفظ بھی نہیں۔ تم کب تک یہاں رہوگی؟ آگے کیا کروگی؟ یہ سوچنا میرا کام ہے۔ تمہارا نہیں"۔

"مگر ..."

"تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں؟"

شندی نے اُس کی طرف دیکھا۔

خلوص ہی خلوص تھا اُس کی آنکھوں میں!

"آپ ... بہت اچھے ہیں۔" کہتے کہتے اُس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

آج سے اُس کی زندگی کا ایک نیا سفر شروع ہوا تھا۔ انجانے راستوں سے ناآشنا___ گھبرانا تو تھا ہی اُس نے!

"آؤ تمہیں بالکنی سے پچھلی سائیڈ دکھاؤں۔" وہ اُس کی پریشانی سمجھ رہا تھا۔

اُس کا دھیان بٹانے کو اُسے ہاتھ سے پکڑ کر اندر لاتے ہوئے ماسٹر بیڈ میں سے گزار کر بالکنی میں لے آیا۔

دائیں بائیں اور سامنے دور تک پھیلی ڈھلان پر ٹین کی چھتوں والے گھروندے، چھوٹی چھوٹی ہری ہری ٹیریسڈ کھیتیاں، پرلی طرف بہتی ندی، ندی کنارے دور تاحدِ نگاہ سیب اور خوبانی کے باغ، اور___ بالکل پاس ایک جھاڑی اپنی ٹہنیوں پر سرخی مائل کاسنی پھولوں کے چھوٹے چھوٹے لالٹین روشن کئے اُنہیں تک رہی تھی!



وہ مسحور سی ہوگئی۔

"یوں لگتا ہے جنت زمین پر اُتر آئی ہے"۔ وہ کہے بنا نہ رہ سکی۔

"اور تم نے اِس جنت کی ناشکری کی نا تو ..." اُس نے زور سے اُس کا کان پکڑا۔

"نہیں کروں گی۔ بالکل نہیں کروں گی پلیز!" اُسے تکلیف ہونے لگی تھی۔

اور___ اُس نے اُسکا کان چھوڑ دیا۔

"اچھا میں اب جاتا ہوں۔ تمہارے لئے کھانا بھجواتا ہوں۔ پھر تم ریسٹ کر لینا۔ رات آٹھ بجے آنٹی اور انکل نے ہم دونوں کو ڈنر پر بلایا ہے۔ وہاں جائیں گے۔ اور___ وہاں سے میں سیدھا سٹی جا کر ریلوے سٹیشن سے تمہاری ماما کو لیکر آؤں گا"۔

"وہ ... آپ کا ڈرائیور لینے نہیں جا سکتا؟" اُس کے اتنے سارے احسانوں کے بعد اب تو اُسے شرمندگی سی ہونے لگی تھی۔

اور___ میوہ خان کا خیال آتے ہی وہ زور سے ہنس دیا۔

"میرا ڈرائیور تمہاری ماما کی جگہ کسی اور کو اُٹھا لائے گا۔"

وہ بھی ہنس دی۔

"رات آٹھ بجے تیار رہنا، ہاں۔"

"جی"۔

وہ ہولے سے مسکرادیا۔ کل سے وہ واقعی کچھ بدلی بدلی سی تھی۔ جھکی جھکی پلکیں لئے کچھ مؤدب طریق سے 'جی' کہتی وہ اُسے بہت اچھی لگی!

"او کے۔"

وہ بالکنی سے بیڈ روم میں اور پھر مختصر سے کوریڈور میں سے ہوتا پچھلے دروازے سے اینکسی سے باہر آ گیا۔ وہ بھی ساتھ ساتھ تھی۔ چند قدم آگے جا کر وہ ڈھلان اترتے ہوئے اپنے کچن کے گرد گھومتا نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

شندی واپس پلٹی۔ کوریڈور کے دائیں طرف کچن تھا۔ سامنے لِونگ روم تھا۔
لِونگ روم میں دائیں طرف دونوں بیڈ رومز کے دروازے کھلتے تھے۔ بائیں
جانب مین دروازہ تھا، جو باہر ٹیرس میں کھلتا تھا۔ جدید طرز پر بنی آرام دہ
اینکسی فلی فرنشڈ تھی۔ اُسے حیرت بھی ہوئی، دونوں بیڈ رومز میں چوڑے آرام دہ
بیڈز پر صاف ستھرے بستر بھی لگے تھے۔ کچن میں کچھ ضروری برتن اور چائے
وغیرہ کا سامان بھی رکھا تھا۔ یہ اہتمام بھی یقیناً یاور خان نے کیا تھا۔ بہر حال ___
اُس نے اپنا مختصر سا سامان اپنی اپنی جگہ پر رکھا۔ منہ ہاتھ دھوتے ہوئے
کپڑے تبدیل کیے۔ اور بستر میں لیٹ گئی۔ تھک گئی تھی، کمزوری ابھی بھی باقی
تھی۔ انگیٹھی میں جلتی لکڑیوں کی آگ نظروں کو بھلی لگ رہی تھی۔
تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ چوکیدار نور محمد نے کوریڈور کی طرف پچھلے
دروازے پر دستک دی۔ حمید اُسے شندی کے لئے کھانا دے گیا تھا۔
شندی نے دروازہ کھولا۔ نور محمد نے بہت ادب سے اُسے سلام کیا۔
''بی بی۔ ڈاکٹر صاحِب کے گھر سے کھانا آیا ہے''۔ وہ ٹرے ہاتھوں میں لئے
تھا۔

شندی اُس سے ٹرے لیکر لِونگ روم کے دائیں کونے میں لگی خوبصورت گول
ڈائیننگ ٹیبل پر آ گئی۔

یاور خان نے تو پوری دعوت کر دی تھی اُس کی۔ کئی کھانے، فروٹ وغیرہ۔
پاپا کے دوست کا بیٹا ہونے کے ناطے وہ اتنا کچھ کر رہا تھا۔ کہ وہ اُس کے
احسانوں تلے دبتی اب تو Embarrassed محسوس کرنے لگی تھی۔
کھانا کھاتی، فل لینتھ کھڑکیوں سے باہر جنت نظیر نظاروں پر نظریں جمائے
وہ اُسی کے ہی بارے میں سوچتی رہی۔
کھانے کے بعد وہ برتن سمیٹنے لگی۔
'اتنے سارے ملازم موجود ہیں۔ تم کیوں خواہ مخواہ خود کو جھنجٹ میں ڈالتی



ہو'۔ جانے کہاں سے پاپا کی بات اُس کے کانوں میں گونجی۔
ایک بار پاپا کی سٹڈی میں کوفی پینے کے بعد وہ برتن ٹرے میں رکھتے ہوئے
ٹرے اٹھا کر کوریڈور میں نکلنے لگی۔ تو پاپا نے یہی کہا تھا اُسے۔
اوہ پاپا۔ کہاں ہیں آج آپ؟ آپ کی لاڈلی بیٹی کتنی دربدر ہوئی ہے۔ اُس
کی حسین آنکھیں نم ہو گئیں۔
وہ برتن اٹھا کر کچن میں لے گئی۔ اپنی پلیٹ اور چمچ دھو لئے۔ پچھلے چند ماہ
لنڈن میں رہ کر اُس نے چھوٹے چھوٹے کام سیکھ لئے تھے۔ ورنہ حویلی میں تو
اُسے پانی کا گلاس تک بھرنے نہیں دیا جاتا تھا۔ آج پہلی بار اُس نے سوچا۔ اتنا
لاڈ پیار، اتنا ناز و نعم اچھا نہیں ہوتا۔ کل کا کیا پتہ راس آئے نہ آئے!

ماما الفت نے شندی کو گلے لگایا۔ تو اُسے لگا پاپا کی ڈیتھ آج ہی ہوئی تھی۔
اتنا تڑپ تڑپ کر روئی، اتنا چیخ چیخ کر روئی کہ اگلی پچھلی ساری کسر نکال دی۔ ماما
الفت تو صاحِب کے علاوہ اپنی بیگم صاحِبہ کو بھی یاد کر کر کے روتی رہیں۔ کیا وقت تھا
اور کیا دور تھا۔ سب ختم ہو گیا تھا۔
شندی کچھ حواسوں میں آئی۔ تو خیال آیا۔ ماما اتنی دور سے تھکی تھکائی آئی
تھیں۔ اُن کے لئے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرنا چاہئے تھا۔
آنسو پونچھتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ کچن میں گئی۔ دوپہر کا ڈھیر سارا کھانا
اب بھی پڑا تھا۔ گرم کرنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ پیچھے سے ماما آ گئیں۔
''اے بیٹی کیا کر رہی ہو؟'' وہ کچھ حیرت سے بولیں۔
''آپ کے لئے کھانا گرم کر رہی ہوں''۔
''ہٹو''۔ اُنہوں نے اُسے پرے کیا۔ ''کام کریں تمہارے دشمن۔ میرے کیا
ہاتھ ٹوٹ گئے ہیں کہ تم گرم کرو گی''۔
تبھی پچھلے دروازے پر دستک ہوئی۔ ماما سب چھوڑ چھاڑ اُس طرف لپکیں۔

شندی ساتھ آ گئی کہ ماما تو کسی سے بھی واقف نہیں تھیں۔

ماما نے دروازہ کھول دیا۔ میوہ خان ٹرے میں کھانا لئے کھڑا تھا۔

''چھوٹی بی بی۔ میں ہوں میوہ خان، ڈاکٹر صاحب کا ملازم خاص۔ آپ کی ماما کے لئے کھانا لایا ہوں۔'' وہ نظریں نیچی کئے بولا۔

وہ واقعی بہت خاص تھا۔ سرخ اونی ٹوپی، گہرا سبز پاؤں تک لمبا کوٹ، بلیک لونگ شوز، دیہاتی لب ولہجہ اور ___ بے شمار سرمہ لئے آنکھیں اتنی نیچی کئے کہ سر بھی ساتھ جھک گیا تھا۔

شندی کو وہ بہت سیدھا سادا اور اچھا لگا۔

''بہت شکریہ میوہ خان۔ مگر یہاں تو دوپہر کا بھی سارا کھانا اُسی طرح پڑا ہے۔

''کوئی بات نہیں۔ یہ بھی رکھ لیں۔ ورنہ ڈاکٹر صاحب ناراض ہو جائیں گے''۔ اُس نے ٹرے آگے بڑھائی۔ نظریں پہلے سے بھی نیچے چلی گئیں۔

ماما نے ٹرے لے لی۔ دروازہ بند کیا۔ اور دونوں واپس آ گئیں۔

ماما نے کچن میں ہی کھانا کھایا۔ اپنے لئے ایک کپ چائے بنائی۔ اور شندی کے کمرے میں آتے ہوئے جیسے مدتوں بعد اپنے گودوں پالی شندی کے ساتھ پاؤں کی طرف بستر میں بیٹھ گئیں۔

شندی نے نم آنکھوں اور گلوگیر آواز میں اُنہیں سب بتا دیا۔ کیسے انکل جہانگیر نے اُسے حویلی میں بند کر رکھا تھا، کیسے طرح طرح سے ڈراتا تھا، کیسے سرفراز سے اُس کے نکاح کا منصوبہ بنایا تھا، کیسے وہ وہاں سے نکل بھاگی تھی، اور کیسے ڈاکٹر یاور خان نے اُسے وہاں سے نکلنے میں اُس کی مدد کی تھی۔

شندی نے ماما کو ماموں جان کے بارے میں بھی بتایا۔ جو بہت مکاری سے مسز علی کے ساتھ ساز باز کر کے اُسے زہر دلوا رہے تھے، اور اب اُسے یقین ہو گیا تھا زہر اُس دودھ میں ہوتا تھا جو مسز علی ہر رات اُس کو دینا نہیں بھولتی تھی۔ وہ بھی حیران تھی کہ اور تو کسی چیز کے لئے کبھی پوچھا نہیں تھا دودھ اپنے ہاتھ سے بلا ناغہ



لے آیا کرتی تھی۔ بسا اوقات وہ سخت کمزوری محسوس کرتی۔ پھر یاور خان نے ہی اُسے خبردار کیا۔ اُس کے Investigations کے رپورٹس میں بھی زہر کے Traces پائے گئے تھے۔

ماما ہکا بکا سب سن رہی تھیں۔ پھر شندی کا سر اپنی گود میں رکھتے ہوئے بے اختیار رو دیں۔ شندی بھی رونے لگی۔ دونوں دیر تک روتی رہیں۔

شندی روئی تھی، بے گھر ہوئی تھی مگر ___

آج ماما کو اپنے پاس پا کر جیسے دل کو بہت ڈھارس ملی تھی، بڑا حوصلہ ملا تھا۔ وہ جو اتنے دن اجنبی اجنبی سے ماحول میں خود کو تنہا محسوس کرتی تھی، وہ احساس جاتا رہا تھا۔ اب اُس کی اپنی ماما اُس کے پاس تھی۔ امی اور پاپا کے بعد وہ ہی تو تھیں اُس کی سب کچھ۔ اپنا علاقہ نہ سہی کوئی اور سہی۔ اب وہ اکیلی تو نہیں تھی۔ پھر ___ علاقہ لاکھ اپنا ہو، اپنے بندے نہ ہوں تو وہ اجنبی ہی لگتا ہے۔ علاقہ لاکھ اجنبی ہو، اپنے لوگ ساتھ ہوں تو وہ اجنبی نہیں لگتا۔

''بس میرا بچہ۔'' ماما خود آنسو پونچھتے ہوئے اُس کے بھی آنسو پونچھنے لگیں۔

''اللہ پر بھروسہ رکھو۔ وہ سب ٹھیک کرے گا۔ وہی کارساز ہے، مسبب الاسباب ہے...''

''ہاں ماما۔ مجھے اپنے خدا پر بہت بھروسہ ہے۔ وہی سب ٹھیک کرے گا۔ مجھے یقین ہے''۔ وہ سر اُٹھاتے ہوئے بیٹھ گئی۔

ماما نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''ماما آپ کی چائے تو ٹھنڈی ہو گئی ہے۔'' اچانک اُس کی نظر نیچے بیڈ کے پاس رکھی چائے کے کپ پر پڑی۔

''جاتی ہوں۔ گرم کرتی ہوں اِسے''۔ اُنہوں نے کپ اٹھایا اور کچن چلدیں۔

رات کا ایک بجنے کو تھا۔ شندی ماما کی منتظر بستر کی پشت سے تکیوں سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ آج تو ڈھیر ساری باتیں کرنی تھیں۔ اُس نے سونے کو بہت

وقت پڑا تھا۔

ماما جلدی ہی آ گئیں۔ پھر سے اُس کے پاؤں کی طرف بیٹھتے ہوئے پیر اُس کے نرم وگرم بستر میں چھپا لئے۔ کچھ سوچتی بھی جا رہی تھیں، چائے بھی پیتی جا رہی تھیں، اور باتیں بھی کرتی جا رہی تھیں۔ چائے پی کر اُنہوں نے خالی کپ نیچے رکھا۔

''بیٹی''۔ غیر اِرادی طور پر اُنہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ جیسے تسلی کرنا چاہتی تھیں کہ اُن کی بات کوئی اور تو نہیں سن رہا تھا۔ ''تمہارے پاپا کو تمہارے چچا نے گولی ماری ہے''۔

''کیا؟'' وہ سیدھی ہو بیٹھی۔

''ہاں بیٹی۔ اکرم بھیا نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ صاحب اپنی لائبریری میں اپنا اسلحہ نکالے قالین پر بیٹھے صاف کرنے میں مشغول تھے۔ تمہارے چچا ساتھ ویسے ہی نیچے بیٹھے تھے۔ اِسی دوران اکرم بھیا اُنہیں چائے دینے اوپر گیا۔ دروازہ اَدھ کھلا تھا۔ کوریڈور میں سے سب نظر آ رہا تھا۔ اکرم بھیا بتا رہا تھا اُس کے دیکھتے ہی دیکھتے جہانگیر صاحب نے پستول اٹھایا اور اُن پر گولی چلا دی۔ اکرم بھیا گھبرا کر الٹے قدموں واپس چل پڑا۔ راستے میں، مَیں مل گئی۔ اُس نے ساری بات مجھے بتا دی۔ میں نے کہا۔ چُپ۔ منہ سے ایک لفظ بھی اور نہ نکال۔ پھر کہرام مچ گیا۔ جہانگیر صاحب نے سب کو یہی بتایا کہ صفائی کرتے کرتے غلطی سے پستول چل گیا اور گولی خود اُن کو لگ گئی...''

شندی پہلے ہی کمزور اور پریشان تھی۔ اوپر سے اس قدر بھیانک انکشاف۔ وہ آہستہ سے تکیوں پر لڑھک گئی۔

''شندی بی بی۔ شندی بی بی...'' ماما نے اُسے پکارا۔ پھر جھنجھوڑا۔ مگر کوئی جواب ندارد۔

''ہائے میری بچی''۔ وہ بستر سے نکلیں۔ ''ہائے کیا ہوا میری بچی کو''۔ اُنہیں



کچھ سوجھ نہیں رہا تھا۔

پھر وہ بھاگیں پچھلی طرف۔ حمید جب اُنہیں شاندانہ کے پاس لا رہا تھا تو اینکسی کے بالکل قریب ڈھلان پر پہلا گھر دکھایا تھا۔ جس میں نور محمد رہتا تھا۔ اور جس کو یاور خان نے اینکسی کی چوکیداری سونپی تھی۔

''اے بھیا...'' وہ زور زور سے دروازہ پیٹنے لگیں۔ افراتفری میں نور محمد کا نام یاد نہیں رہا تھا۔

''کیا بات ہے؟'' اُس نے فوراً دروازہ کھولا۔

''میں چھوٹی بی بی کی ماما ہوں۔ اُن کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے...''

''آپ فکر نہ کریں۔ میں ابھی ڈاکٹر صاحب کو لے کر آتا ہوں۔'' وہ بھاگا یاور خان کے گھر کی طرف۔

تھوڑی ہی دیر میں یاور خان آ گیا۔ نور محمد فرسٹ ایڈ بوکس لئے ساتھ تھا۔ شندی کے بیڈ روم پر دستک دیتا یاور خان اندر آ گیا۔

''اوسان خطا ماما پائینی بیٹھیں شندی کے پیر مل رہی تھیں۔ شندی تکیوں پر بے سدھ پڑی تھی۔

وہ فوراً پاس چلا آیا۔

''شاندانہ۔ شاندانہ...'' اُس نے اُس کا کندھا ہلایا۔ مگر اُسے ہوش ہوتا تو کچھ رسپانس دیتی نا!

وہ اُس کے بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گیا۔

''شاندانہ۔ شاندانہ...'' وہ اُس کا چہرہ ہلا جلا رہا تھا، کان Pinch کر رہا تھا۔

اور۔۔۔ شندی کو آہستہ آہستہ ہوش آنے لگا۔ آنکھیں کھولدیں۔ اِردگرد دیکھا۔

''شاندانہ''۔یاور خان اب بھی اُس پر جھکا ہوا تھا۔

اُس کی آواز پر اُس نے یاور خان کی طرف دیکھا۔اور پھر۔۔۔ اُس کی خوبصورت آنکھوں میں قندیلیں سی جل اٹھیں۔

یاور خان آج بھی چونکا۔اِن قندیلوں میں وہی روشنی تھی جو کل ہوسپٹل میں اُس کی آنکھوں کے جلتے دیپوں میں تھی۔مگر۔۔۔

دوسرے ہی لمحے قندیل بجھ گئے۔

''آپ...؟''وہ اُٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔

''لیٹی رہو پلیز!''وہ سیدھا ہو بیٹھا۔

''ماما۔شاندانہ کے لئے گرم دودھ میں چینی ملا کر لائیں۔''وہ ماما سے بولا۔

''جی اچھا''۔ماما شندی کی طرف سے مطمئن ہو کر کچن چلدیں۔

''کیسی ہو اب؟''وہ پھر سے شندی کی طرف متوجہ ہوا۔

''ٹھیک ہوں''۔اُس کی آواز میں نقاہت تھی۔

ماما سے مل کر یقیناً وہ بہت زیادہ روئی تھی۔اُس کی سرخ متورم آنکھوں سے لگ رہا تھا۔دنوں بعد وہ اپنے فادر کی ڈیتھ کے بعد کسی اپنے سے ملی تھی۔ماما نے ضرور آنکھوں دیکھا حال بتایا ہوگا۔کمزور تو پہلے ہی تھی، برداشت نہ کرتے ہوئے بے ہوش ہو گئی تھی۔

''آپ نے کیوں تکلیف کی۔''وہ اُس کے بہت قریب بیٹھا تھا۔وہ نظریں اُٹھائے بغیر ہی پھر بولی۔

اور۔۔۔ اُس کا خوشگوار قہقہہ بلند ہوا۔

''تم بے ہوش ہو گئی تھیں۔ماما نے آدمی بھیجا۔تو میں کیسے تکلیف نہ کرتا۔''

''اوہ... ہاں''۔اُسے دھیرے دھیرے ماما کی بات یاد آتی گئی۔دو آنسو لڑھک کر گالوں پر آرہے۔

''حوصلہ کرو شاندانہ''۔اُس نے انگلیوں کی پوروں سے اُس کے آنسو



پونچھے۔''دکھ سکھ تو آتے رہتے ہیں۔اِسی کا نام زندگی ہے''۔اُس کے دکھ میں وہ بھی دکھی نظر آنے لگا تھا۔

''اتنی رات گئے آپ کو میری وجہ سے جاگنا پڑا۔''وہ پھر نادم سی لگ رہی تھی۔

''نو میَم۔میں تمہاری وجہ سے نہیں جاگا۔''وہ خوشگواری سے بولا۔''کل رات سے آن کال ہوں۔ابھی کچھ دیر پہلے ہوسپٹل سے لوٹا ہوں۔کل رات بھی دو بجے گیا تھا۔میرا یہ پورا ہفتہ اِسی طرح رہے گا...''اُس نے اپنی ڈیوٹی کے طریقہ کار سے اُسے آگاہ کیا۔

''کل رات بھی دو بج گئے تھے؟''

''ہاں۔''

''میرے کمرے میں کیوں نہیں آئے؟''وہ شاکی لہجے میں بولی۔

وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔

''دو بجے آکر میں تمہیں کیسے ڈسٹرب کرتا۔''

''میں ڈسٹرب نہیں ہوتی۔''جھکی نظریں لئے وہ ہولے سے بولی۔

وہ پھر چونک سا گیا۔انجانے میں وہ اپنے معصوم سے جذبوں کا اقرار کئے جا رہی تھی!

''اچھا اِس وقت تو تمہارے پاس ہوں نا''۔

شندی نے بھیگی جھالریں پلکیں اوپر اٹھا کر اُسے دیکھا۔وہ اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔

شندی کی پلکیں تیورا کر گر گئیں۔مگر۔۔۔

اسکی بڑی بڑی خوبصورت گرے بلو آنکھیں اُسے لمحے بھر میں ہی بہت کچھ کہہ گئیں!

تبھی۔۔۔ ماما شندی کے لئے گلاس میں دودھ لئے آ گئیں۔

''شندی بی بی۔اُٹھو بیٹا۔دودھ پی لو''۔ماما اب بھی گلاس تھامے کھڑی

تھیں۔

''یہیں رکھ دیں ماما۔ پیتی ہوں''۔ بستر میں سیدھی بیٹھتے ہوئے اُس نے بیڈ سائیڈ ٹیبل کی طرف اشارہ کیا۔

ماما نے گلاس وہیں رکھ دیا۔ خود دوسرے کمرے میں اپنا سامان وغیرہ ٹھیک کرنے چلی گئیں۔

''شندی بی بی''۔ گلاس اٹھاتے ہوئے یاور خان نے شرارت سے ماما کا 'شندی بی بی' دہرایا۔ ''دودھ پیو۔ ختم کرو سارا''۔

اُسے اُس کا شاندانہ نام تو ویسے بھی بہت اچھا لگا تھا۔ اب شندی اور بھی اچھا لگنے لگا۔

شندی کو ہنسی آ گئی۔ گلاس اُس سے تھامتے ہوئے ہونٹوں سے لگا لیا۔

''ویسے۔۔۔ تم نے مجھے ڈرا دیا تھا'' وہ خوشگواری سے بولا۔

''مجھے تو پتہ ہی نہیں چلا۔ ماما کچھ بتا رہی تھیں اور میں سن رہی تھی۔ پھر... پتہ نہیں چلا...'' اُس کی آواز اب بھی کمزور تھی۔

''ماما نے کوئی خاص بات بتائی تھی کیا؟''

''اُم مم... ہاں...''

''مجھے بتاؤ گی؟''

''کیوں نہیں۔ لیکن کل پلیز! اِس وقت دہرانے کی ہمت نہیں ہے مجھ میں''۔

''ہاں، ہاں۔ ریلیکس۔ کل بتا دینا''۔

''آپ آئیں گے کل؟'' اُس کی نظروں میں Longing تھی۔

''کیوں نہیں آؤں گا''۔

''میرا خیال تھا کہ آپ بس ہوسپٹل تک ہی...''

''کیا مطلب ہوسپٹل تک؟''

''میں اب آپ کی پیشنٹ نہیں رہی نا''۔ وہ خالی گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھتے



ہوئے بولی۔ اُس کا واقعی یہی خیال تھا کہ شاید اب ایسا ہو۔

اُس نے گہری سانس لی۔

''تم میری صرف پیشنٹ نہیں ہو۔ تم میرے ڈیڈ کے دوست کی بیٹی بھی ہو۔ اور میں رشتوں کی بہت قدر کرتا ہوں۔ تم میرے لئے بہت Important ہو... سمجھیں''۔

''جی''۔

اُسے پھر بہت اچھا لگا۔ شفقت سے اُس کا گال تھپتھپایا۔

''اب لیٹ جاؤ''۔ وہ بیڈ کے کنارے سے اُٹھ گیا۔

وہ لیٹ گئی۔ تو یاور خان نے اُس پر لحاف درست کیا۔ اور انگیٹھی میں جلتی آگ کے قریب رکھے صوفے پر بیٹھ گیا۔

''آپ کچھ لیں گے؟ چائے؟ کوفی؟''

''نو تھینکس۔ بس تھوڑی دیر تمہیں اور دیکھتا ہوں۔ پھر چلوں گا''۔

اور۔۔۔ پندرہ بیس منٹ بعد وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

''تم دوائیاں لے رہی ہو نا؟''

''جی''۔

''میں میوہ خان کے ہاتھ ایک اور دوائی بھیجتا ہوں۔ اب بھی لو، اور لیتی رہو ایک مہینہ۔ پھر بے ہوش نہیں ہو گی''۔

وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

''اب ٹھیک ہو تم۔ خدانخواستہ کوئی بات ہو بھی تو فون کر دینا مجھے۔ میرا اسیل نمبر تو ہے نا تمہارے پاس''۔

''جی''۔

''او کے۔ گڈ نائیٹ''۔

''گڈ نائیٹ''۔ شندی نے کہا۔

اور وہ بڑے بڑے ڈگ بھرتا کوریڈور میں نکل آیا۔

ماما نے اُس کا فرسٹ ایڈ بوکس نور محمد کو پکڑایا۔ اور یاور خان کو ڈھیر ساری دعائیں دیتیں دروازہ بند کر کے شندی کے کمرے میں آ گئیں۔

وہ اور ماما پھر سے باتیں کرنے لگیں۔ بلکہ اُسے یہ کہہ کر کہ وہ کمزور ہے خاموش کرایا اور خود شروع ہو گئیں۔ اُن کی باتیں بہت دلچسپ ہوا کرتی تھیں۔ دنیا جہان کی خبریں ہوتی تھیں اُن کے پاس۔ جو وہ بقول اُن کے یا تو شندی کو سناتیں یا اکرم بھیا کو اور یا پھر جب اُن کی بیگم صاحبہ حیات تھیں اُن کو!

بے شمار باتیں ہوئیں۔ اُس کے لنڈن جانے کے بعد سے لیکر جہانگیر صاحِب کے حویلی کے تمام پرانے ملازموں کو برطرف کرنے کے بعد اور پھر اُس کے بعد جو ماما پر گزری، سب شندی کے گوش گزار کر دیا۔ شندی کے ساتھ جو چچا اور ماموں نے کیا تھا۔ اُس پر بھی بے شمار روئیں۔ جھولی بھر بھر بددعائیں دیتی رہیں ظالموں کو۔ اور یہ لمبی لمبی دعائیں دیتی رہیں ڈاکٹر یاور خان کو!

رات کا پچھلا پہر تھا۔ ماما اُٹھیں۔ شندی پر لحاف درست کیا۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل پر سے دودھ کا خالی گلاس اٹھایا اور ـــــ اُسے 'شب بخیر' کہتے ہوئے سونے کے لئے پاس والے بیڈروم میں چلدیں۔

شندی نے بھی لیمپ آف کر دیا۔ بالکنی کی طرف کروٹ لی۔ آنکھیں بند کی ہی تھیں کہ یاور خان در آیا۔ پٹ سے آنکھیں کھولدیں۔ یاور خان دور چلا گیا ـــــ بہت دور!

اُس نے بے بس سی سانس لی۔ اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔





دن آہستہ آہستہ سرک رہے تھے۔ نادیہ بدستور اپنی ضد پر قائم تھی۔ یاور خان بھی خاموش تھا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ اُس نے نادیہ کی چپ میں چپ اختیار کر لی تھی۔ مگر ایک فرق تھا دونوں کی چپ میں۔ نادیہ اپنا وقت اچھا گزار رہی تھی۔ وہی قہقہے وہی شوخیاں۔ جبکہ یاور خان Tense تھا، اَپ سیٹ تھا۔ نادیہ اُسے اذیت دیکر خوش ہو رہی تھی۔ اور ـــــ وہ امن کا خواہاں تھا، سکون کا متمنی تھا!

صبح صبح نیچے ندی کنارے جوگنگ کرنے کے بعد وہ پگڈنڈی پر اوپر آ رہا تھا۔ شندی کی اینکسی کے پاس سے گزرنے لگا۔ تو بالکنی میں شندی کھڑی نظر آئی۔

وہ پاس چلا آیا۔ شندی کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے پر صبح کی پاکیزگی کا نکھار تھا۔ شبنم میں تر پھولوں کی تازگی تھی۔

''گڈ مورننگ میم۔'' وہ خوشگواری سے بولا۔

''ہائے''۔ اُس نے دھیرے سے کہا۔

''اتنی صبح صبح باہر کیوں کھڑی ہو۔ ٹھنڈ لگ جائے گی''۔

''آپ بھی تو صبح صبح باہر نکلے ہیں''۔

وہ ہنس دیا۔ دلآویزی سے۔

''واقعی۔ مجھے ٹھنڈ لگ گئی تو؟'' اُس نے شرارت سے کہا۔

''آپ کو زکام ہو جائے گا۔ ٹمپریچر الگ ہوگا''۔

''پھر؟'' وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔

''پھر آپ ہوسپٹل سے چھٹی کر لیں گے۔ بیڈ پر لیٹ جائیں گے''۔ وہ بھی اپنی رو میں بولتی جا رہی تھی۔

''اور تم میری تیمارداری کرو گی''۔

''ہاں۔'' وہ بے ساختہ ہنس دی۔

اور ـــ یاور خان کو لگا۔ دور کہیں پائل بج اُٹھے تھے۔

''اچھا۔ اب چلوں۔ ہوسپٹل جانے کی تیاری کرنی ہے''۔

ساتھ ہی اُسے نادیہ کا خیال آ گیا۔ چند پل جو بے فکری کے میسر آئے تھے۔ کافور ہو گئے۔

اُس نے گہری سانس لی۔ پُرکشش چہرے پر سائے سے لہرائے۔

''کیا بات ہے؟ آپ فکر مند نظر آ رہے ہیں''۔ شندی نے اچھے دوستوں کی طرح پوچھا۔

چند لمحے وہ خاموش رہا۔ پھر اُس کی طرف دیکھا۔

''وہ ـــ نادیہ خفا ہے مجھ سے۔'' اُس نے بھی بہت اچھے دوست کی طرح بتایا۔

''اوہ''۔ باوجود کوشش ضبط کے اُس کا رنگ پھیکا ہو گیا۔



''کئی دنوں سے کولڈ وار چل رہی ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے مزید بولا۔

''تو... آپ منا لیں اُن کو''۔

ایک بار پھر اُس نے گہری سانس لی۔

''میں نے بھی یہی سوچا ہے۔ حالانکہ غلطی اُس کی تھی۔ لیکن ماحول Tense ہو تو میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔''

''آج اُنہیں ضرور منا لیں۔ آپ کی پریشانی ختم ہو جائے گی۔''

اُس نے نظر بھر کر شندی کو دیکھا۔ چھوٹی سی یہ اینجل اُسے پسند کرتی تھی۔ مگر ہمدردی اور ایثار! وہ متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکا۔

''اچھا۔ بائے''۔ اُس نے کہا۔

''بائے''۔

اور ـــ وہ اپنے گھر کی جانب چلدیا۔

آخر کار ـــ یاور خان نے نادیہ کو منا ہی لیا۔ سب نارمل ہو گیا۔ اور یاور خان کے ذہن پر کا گراں بار ہلکا ہو گیا۔

اِس وقت پھر نادیہ اُس کے ساتھ کار میں بیٹھی گھر کی طرف رواں دواں تھی۔

شام گہری ہو رہی تھی۔ پہاڑیوں کے جنگلوں میں سیاہیاں اتر آئی تھیں اور ـــ یہ بڑا چاند چہار سو دودھیا چاندنی بکھیر رہا تھا۔

''تمہیں نہیں لگتا کہ یہ چاند کچھ کہہ رہا ہے''۔ یاور خان نے خاموشی توڑی۔

''نہیں۔ چاند باتیں نہیں کرتا''۔ نادیہ بولی۔

''غور سے سنو تو ضرور سنائی دے گا''۔ یاور خان سحر زدہ سا بولا۔

''اوہ کم آن یاور۔ تم ڈاکٹر کم شاعر زیادہ لگتے ہو''۔

''پتہ ہے یہ کیا کہہ رہا ہے؟'' اُس نے اُس کی اَن سنی کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا بتاؤ۔ کیا کہہ رہا ہے۔'' وہ کچھ اکتائے سے لہجے میں بولی۔

''یہ کہہ رہا ہے۔ کہ امن اور شانتی سے رہو۔ سکون سے ...''

''اچھا چھوڑو''۔ اُس نے اُس کی بات کاٹی۔ ''پتہ ہے ڈاکٹر کوثر کی کسی بزنس مین سے منگنی ہو گئی ہے۔ Millionaire ہے۔ یہ بڑے ڈائمنڈ کی انگوٹھی دی ہے منگنی میں''۔

''ہوں''۔ سڑک پر نظریں جمائے وہ دھیرے سے بولا۔

پتہ نہیں کیوں اُس کے لب و لہجے میں اُسے ملینئر کے لئے کچھ Greed سا محسوس ہوا۔

''تم کیا دو گے مجھے منگنی پر؟''

''سوچوں گا''۔ اُس نے احتیاط سے موڑ کاٹا۔

''بتاؤ نا۔'' وہ مچل گئی۔

''اور اگر میں غریب ہوا ڈائمنڈ نہ دے سکا تو؟''

یاور خان ایک ویل آف فیملی سے تھا۔ بہت مضبوط بیک گراؤنڈ تھا اُس کا۔

مگر اُس کو یہ موضوع ہی اچھا نہیں لگا تھا۔

''اتنے غریب سے تو میں شادی کروں گی بھی نہیں''۔

''محبت غریبی تو نہیں دیکھتی ...''

''پھر شاعری''۔

معاً ___ ونڈ سکرین پر ٹپ ٹپ بوندیں پڑنے لگیں۔

یاور خان مسکرا دیا۔ وائپرز آن کر دیئے۔ عجیب آنکھ مچولی تھی۔ فرلانگ بھر پیچھے آسمان صاف اور یہاں بارش!

''ویسے ___ رات کو جب ٹین کی چھت پر بارش کے قطرے پڑتے ہیں تو کتنا Enchanting لگتا ہے نا''۔

''اور مجھے اُس شور پر سخت غصہ آتا ہے''۔

یاور خان نے بے یقینی سے اُسے دیکھا۔



''واقعی؟''

''ہاں۔ مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔ جبکہ یہاں عام طور پر ٹین کی ہی چھتیں ہیں''۔

وہ چند پل خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا۔

''مجھے بادل، بارش، برفباری بہت اچھے لگتے ہیں''۔ وہ دھیرے سے بولا۔

''ڈاکٹر خان۔ لفٹ پر موڑیں۔ موسم کے عشق میں آپ مجھے گھر اتارنا بھول رہے ہیں''۔

اور ___ اُس نے گاڑی بائیں موڑ لی۔

نادیہ کو گھر پر چھوڑتے ہوئے وہ اپنی راہ پر ہو لیا۔

تھوڑا سا ہی آگے گیا تھا کہ بوندیں پڑنا بند ہو گئیں۔

آسمان اب پھر شفاف تھا۔ ان گنت تاروں کے جھرمٹ میں چودھویں کا پورا چاند جگمگا رہا تھا۔

اُس نے دائیں طرف اپنے روڈ پر گاڑی موڑ لی۔

تاروں کی بارات، چاندنی کا سحر، شبنمی ہوائیں اور ___ بستی کی ہریالیوں کی مد بھری خوشبوئیں!

سحر زدہ سا آگے بڑھتے ہوئے وہ اپنے گیٹ میں داخل ہو گیا۔

اوپر اپنے بیڈ روم میں آیا۔ نرم و گرم ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے اور اوور کوٹ پہنتے ہوئے بالکنی میں آ کھڑا ہوا۔

نیچے تاحدِ نگاہ بستی کے دیئے، اوپر تاحدِ نگاہ تاروں کے چراغ روشن تھے!

چبھتی سردی جیسے ہڈیوں کے آر پار ہو رہی تھی۔ اس کے باوجود حمید اُس کے لئے کوفی لایا۔ تو اُس نے بالکنی میں ہی لانے کو کہہ دیا۔

کوفی کی خوشبو من میں اتارتا وہ گرم گرم گھونٹ حلق سے اتارنے لگا۔

تبھی اُسے بائیں جانب نور محمد کو پکارتیں ماما الفت سنائی دیں۔

اُسے شندی کا خیال آ گیا۔ کوٹ کی جیب سے سیل فون نکالتے ہوئے اُس کا نمبر ڈائیل کیا۔

"Yes, Shandi here."

''اے لڑکی۔ تم سے کہا نہیں۔ کسی کو اپنی شناخت نہیں بتانی''۔ وہ خوشگواری سے بولا۔

اُس نے اُسے بہت احتیاط برتنے کو کہا تھا۔ اپنا نام، پتہ، فون نمبر وغیرہ سب چھپا کر رکھنا تھا۔ شہر کی طرف جانے پر سختی سے پابندی لگائی تھی۔ بستی میں بھی محتاط رہنا تھا۔

''آپ... 'کسی' تو نہیں ہیں نا۔ اور پھر آپ کا نمبر بھی سکرین پر آ رہا تھا''۔

''ہاں۔ یہ تو مجھے خیال ہی نہیں رہا۔ دراصل چاند اور چاندنی نے بدحواس کر دیا ہے۔'' وہ اب بھی چاند پر نظریں جمائے تھا۔

''آپ بھی چاند کو دیکھ رہے ہیں؟'' اپنی بالکنی میں کھڑی وہ حیرت اور خوشی کی ملی جلی کیفیت میں بولی۔

''ہاں۔ میں اپنی بالکنی میں کھڑا ہوں''۔

''اور میں بھی...''

''کسی دن تمہیں نمونیہ ہو گیا نا۔ تو پھر مجھے مت بلانا''۔

وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

''سوری۔ آئندہ خیال رکھوں گی''۔

''سنو''۔

''جی''

''چاند کو دیکھ کر تمہیں کس بات کا خیال آتا ہے؟'' جانے کیوں پوچھ رہا تھا وہ؟

''Peace، امن، سکون...''

اُس نے گہری سانس لی۔ یہی خیال نادیہ کو کیوں نہیں آتا تھا؟



''اچھا۔ بارش سے جب ٹین کی چھت بجنے لگتی ہے تو تمہیں اچھا لگتا ہے؟''

''بہت''۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''میں کتنی کتنی دیر یہ میوزک انجوائے کرتی رہتی ہوں۔ کیوں آپ کو اچھا نہیں لگتا؟''

''مجھے بہت اچھا لگتا ہے''۔

''آپ... نے کیسے فون کیا؟''

''نمبر ملایا۔ اور کر لیا''۔

''بتائیں نا''

''کوفی پیو گی؟''

''نہیں۔ آپ کی کوفی بہت کڑوی ہوتی ہے''۔

اُس کا فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا۔

''اور تمہاری کوفی بالکل بیکار ہوتی ہے''۔ اُس نے اُس کی دودھ ملی کوفی پر چوٹ کی۔

''آپ میری کوفی کا مذاق اُڑا رہے ہیں''۔

''سوری، سوری''۔ وہ جلدی سے بولا۔ ''سنا ہے آج تم آنٹی نور جہاں کے گھر گئی تھیں۔'' اُس نے موضوع بدلا۔

صبح آنٹی نور جہاں نے اُسے ہوسپٹل فون پر باتوں کے دوران شندی کے آنے کا بتایا تھا۔

''ہاں۔ بہت ہی اچھی ہیں آنٹی''۔

''اچھا سنو'' اُسے اچانک خیال آیا۔ ''میوہ خان کی شادی ہے آنے والے اتوار کو''۔

''اوہ کتنا اچھا لگے گا۔ اُسے یہ سادہ لوح دیہاتی بہت اچھے لگتے تھے۔

''تمہیں بھی بلایا ہے''۔

''سچ؟'' وہ خوشی سے کھل اُٹھی۔

"لیکن تم نہیں جاؤ گی"۔

"کیوں؟" وہ بجھ سی گئی۔

"وہی پہچانے جانے کی پرابلم"۔

"اوہ۔ ٹھیک ہے"۔

"او کے ۔۔۔ اب میں ذرا اپنے پیشنٹس کی خبر لوں۔ اور تم پلیز اندر چلو"۔

"جاتی ہوں لیکن ..."

"کیا؟"

"آپ بھی پلیز اندر چلیں۔" اُس کی آواز میں Concern نمایاں تھی۔

اُسے بہت اچھا لگا۔

"بس یہ ایک فون کرتا ہوں۔ پھر جاتا ہوں"۔

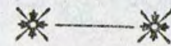
کسی دن آپ کو نمونیہ ہو گیا نا۔ تو پھر مجھے مت کہیں"۔ وہ بالکل اُسی کے انداز میں بولی۔

ایک بار پھر اُس کا جاندار قہقہہ بلند ہوا۔

"سوری۔ آئندہ خیال رکھوں گا۔" اُس نے بھی اُسی کا جواب اُسی کے لب و لہجے میں دہرایا۔ اور ۔۔۔

فون بند کرتے ہوئے اندر کمرے میں چلا آیا۔ دن کو جن مریضوں کا آپریشن کیا تھا۔ اُن کا حال احوال دریافت کیا۔ اور ۔۔۔

انگیٹھی میں جلتی لکڑیوں کے قریب صوفے پر بیٹھتے ہوئے میز پر سے ریڈرز ڈائجسٹ کا تازہ شمارہ اُٹھا کر ورق گردانی کرنے لگا۔





آج ڈاکٹر ظافر کے یہاں ڈنر تھا۔ سبھی کولیگز انوائیٹڈ تھے۔ یاور خان نے تیار ہونے سے پہلے نادیہ کو فون کیا کہ جاتے ہوئے وہ اُسے پک کرلیگا۔ مگر اُس نے کہا کہ اُسے تیار ہونے میں دیر لگے گی۔ اور چونکہ وہ چڑتا ہے ٹائم کی پابندی نہ ہونے پر۔ لہٰذا وہ چلا جائے۔ ڈاکٹر کوثر سے اُس کی بات ہوئی ہے۔ وہ آکر اُسے ساتھ لے جائے گی۔

سو۔۔۔ یاور خان ٹھیک ٹائم پر ڈاکٹر ظافر کے یہاں پہنچ گیا۔

آہستہ آہستہ سبھی مہمان پہنچ گئے۔ ہاں نادیہ اور ڈاکٹر کوثر کا انتظار ہو رہا تھا۔

تبھی ۔۔۔ ڈاکٹر کوثر کے منگیتر انور کی نئے موڈل کی بی ایم ڈبلیو سرسراتی ہوئی پورچ میں آکر رکی۔ اور ڈاکٹر کوثر اور نادیہ کو ڈراپ کرتے ہوئے واپس

چلدی۔

دونوں اندر آ گئیں۔ پتہ نہیں کیوں یاور خان کو لگا۔ کوثر سے زیادہ نادیہ ایکسائیٹڈ تھی!

بہرحال___ سخت سردی میں بھی نادیہ سپگیٹی سٹریپ بلاؤز پہنے تھی۔ گہرا میک اپ، سٹرونگ پرفیوم لگائے تھی اور___ اِس وقت پھر___ سب کی نگاہوں کا مرکز تھی!

''زبردست۔'' ڈاکٹر سلمان نے انگوٹھے کے اشارے سے نادیہ کی تعریف کی۔

''واؤ۔'' ڈاکٹر چنگیز بھی بول اٹھا۔

کولیگز تھے۔ بے تکلفی تھی آپس میں۔ لیکن ڈاکٹر چنگیز کی نظروں میں کچھ تھا ایسا کہ یاور خان کو اچھا نہیں لگا۔ خیر___

سب اپنی اپنی سیٹس پر بیٹھ گئے۔ نادیہ اور ڈاکٹر کوثر بھی ڈاکٹر نشاط اور ڈاکٹر سمینہ کے ساتھ والی کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔

''تمہیں سردی نہیں لگتی؟'' ڈاکٹر نشاط نے سادگی سے نادیہ سے کہا۔

''نہیں۔ ڈرائننگ روم کوزی ہے۔ اور پھر آج کل سب چلتا ہے۔ شادیوں میں نہیں دیکھتی شِفون اور نیٹ کے کپڑے پہنے ہوتے ہیں سب نے''۔

''مجھے تو اُنہیں بھی دیکھ کر وحشت ہوتی ہے''۔ ڈاکٹر نشاط خوب شال لپیٹے بیٹھی تھی۔

''تم تو ہو ہی بڈھی روح''۔ نادیہ کا کھنکتا قہقہہ بلند ہوا۔

''اچھا تم سناؤ''۔ ڈاکٹر سمینہ، کوثر سے مخاطب ہوئی۔ ''شادی کب ہو رہی ہے؟''

''ایک مہینہ بعد''۔

'ہنی مون کے لئے کہاں کا اِرادہ ہے؟''



''سوئٹزرلینڈ''۔

''عیش کرو بھئی''۔

''عیش جیسے عیش''۔ نادیہ بیچ میں ہی بول پڑی۔ ''ابھی بی ایم ڈبلیو دیکھی ہے انور صاحب کی۔ لیٹسٹ موڈل ہے...''

یاور خان کے کانوں میں نادیہ کی آواز پڑی۔

اُس نے نوٹ کیا۔ چند روز قبل راستے میں جب وہ کوثر کی منگنی کی انگوٹھی کا ذکر کر رہی تھی۔ تو بھی جیسے للچائی سی تھی۔ اور اِس وقت بھی اُس کی آواز میں Greed نمایاں تھی۔

کیوں تھا ایسا؟ کیوں وہ اتنی کومپلیکسڈ تھی؟

خود گائنا کولوجسٹ تھی۔ باپ کا میڈیکل سٹور تھا۔ اچھی گزر بسر ہو رہی تھی پھر کیوں...؟

اُس کی نظریں نادیہ کی طرف اُٹھیں۔ اُس کی ساڑھی کا پلو ڈھلک کر اُس کی گود میں آ رہا تھا۔ جو تھوڑا بہت جسم ساڑھی کے پلو نے ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ بھی ننگا ہو رہا تھا۔

ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ وہ اکثر و بیشتر ننگے گلے اور ٹاپ لیس بلاؤزز پہنا کرتی تھی۔ اگر کبھی وہ اعتراض کرتا تو___

'ساری عمر امیریکہ میں گزاری۔ اِس کے باوجود دقیانوسی کے دقیانوسی رہے'۔ نادیہ کا جواب یہی ہوتا!

کیا واقعی ایسا تھا؟ کیا وہ واقعی دقیانوسی تھا؟ لیکن وہ تو صرف عورت کو اُس کے صحیح مقام پر دیکھنا چاہتا تھا اور بس!

اُس کی نظر میں عورت حیا، وفا اور ایثار کا پیکر تھی۔ کیا اُس کی سوچ غلط تھی؟

نادیہ چونکہ اُس سے محبت کا دعویٰ کرتی تھی۔ اور اُس نے بھی اُسی کے اصرار پر ہی خود کو اُس کی محبت کا جواب محبت سے دینے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی تھی۔

کیا پھر اُس کا حق نہیں بنتا تھا کہ اُسے اپنی پسند و ناپسند سے آگاہ کرتا؟
اُس نے گہری سانس لی۔
مہمان ڈائننگ روم کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ بھی ساتھ ہولیا۔
پلیٹ میں کھانا لیکر ایک طرف کھڑا ہوا ہی تھا۔ کہ نادیہ آ گئی۔
''اتنے ہینڈسم کیوں ہو ہاں''۔ وہ اپنی پلیٹ میں سے چمچ بھرتے ہوئے بولی۔ ''لیڈی ڈاکٹرز تمہاری تعریف کرتی ہیں۔ تو میں جیلس فیل کرتی ہوں''۔
اُس کا بھی دل چاہا کہدے۔ کہ میل ڈاکٹرز کی نظریں جب اُس کے ننگے کندھوں پر پڑتی ہیں تو اُسے اچھا نہیں لگتا۔ لیکن ــــ آج اُس نے ایسا نہیں کہا۔ جانے کیوں؟
''کیا کہتی ہیں؟'' اُس نے یوں ہی کہا۔
''سب کہہ رہی تھیں۔ کہ اتنا ہینڈسم بندہ کم ہی بنایا ہوگا اللہ میاں نے''۔
''اچھا'' وہ آہستہ آہستہ کھانا کھا رہا تھا۔
''بائے داوے۔ تمہاری پیشنٹ کا کیا حال ہے؟''
وہ سمجھ گیا۔ اُس کا اشارہ شندی کی طرف تھا۔
''اب وہ میری پیشنٹ نہیں ہے''۔
''چلو جو بھی ہے ...''
''وہ ذوالفقار انکل و آنٹی کی تحویل میں ہوتی ہے۔ بس خیر خبر مل جاتی ہے۔
''لڑائی جھگڑے کے امکان سے بچنے کے لئے وہ دانستہ اُسے شندی کے بارے میں زیادہ نہیں بتاتا تھا۔
''چچ چچ۔ یاد تو آتی ہوگی''۔ نادیہ نے چھیڑا۔
وہ دھیرے سے مسکرادیا۔ بولا کچھ نہیں۔
اور یہی نادیہ کو اچھا نہیں لگا۔ اُس کا خیال تھا کہ وہ انکار کرے گا۔ کچھ کہے گا...
''ویسے اگر میں غلطی پر نہیں تو اُس کی اینکسی جج صاحب سے کم اور تمہارے



زیادہ نزدیک ہے۔ ہے نا؟'' وہ اُسے دور سے ساری جگہ دکھا چکا تھا۔
وہ ایک بار پھر مسکرادیا۔
''اب یہ تو بنوانے والوں کی کوئی مصلحت ہوگی نا''۔
وہ چڑسی گئی۔
''وہ مصلحت یہی ہوگی کہ تم آتے جاتے اُسے جھانکتے رہو''۔
اُس کا جاندار قہقہہ بلند ہوا۔
''بس بس۔ سنو۔ نیکسٹ سنڈے ڈاکٹر اور مسز ریاض کی ویڈنگ اینورسری ہے۔ کل ڈاکٹر ریاض سب کو انوائیٹ کریں گے''۔ اُس نے اطلاع دی۔
''میں تو نہیں آسکوں گا''۔
''کیوں؟''
''اُس دن میرے چوکیدار میوہ خان کی شادی ہے''۔
''What a name!'' اُس کے لہجے میں تضحیک نمایاں تھی۔
''اُس کے ماں باپ نے بہت پیار سے رکھا ہوگا یہ نام''۔
''اچھا نصیحت چھوڑو۔ بتاؤ کیوں نہیں جاؤ گے؟''
''بتایا نا میوہ خان کی شادی ہے وہاں جاؤں گا''۔
''اوہ کم آن۔ تم اپنے چوکیدار کی شادی پر جاؤ گے؟'' وہ یوں بولی جیسے اُس نے کوئی انہونی بات کہہ دی تھی۔
''کیوں نہیں جاؤں گا۔ اُس نے اتنے خلوص سے بلایا ہے''۔
''لیکن ڈاکٹر ریاض بھی تو بلائیں گے''۔
''اول تو یہ کہ میوہ خان نے پہلے بلاوا دیا ہے۔ دوسرے یہ کہ میں نہیں جاؤں گا تو اُسے مایوسی ہوگی۔ اپنی کم مائیگی کا احساس ہوگا...''
''تم بھی نا...'' وہ جھنجھلا اٹھی۔ ''بعض وقت تو... مجھے Suffocation ہونے لگتی ہے تمہارے ساتھ''۔

"اوہ"۔ یاور خان کا چہرہ تمتما اٹھا۔ "Then you better find a man you can breathe with." اُس نے کہا اور ـــ

پلیٹ ہاتھ میں لئے دوسری طرف چلا گیا۔

اُس کا ذہن بھنا رہا تھا۔ آج پہلی بار دل چاہا کھری کھری سنائے اُسے۔ مگر باقی ڈاکٹرز کی موجودگی میں ایسا کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ اُس کی نرمی اور ڈیسینسی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہی تھی۔

ڈنر ختم ہوا۔ وہ باہر آیا۔ اور گاڑی میں بیٹھ کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

آج پہلی بار اُس نے نادیہ کو گھر ڈراپ کرنے کی آفر نہیں کی۔ اور آج پہلی ہی بار اُسے اُس کی بات کا سختی سے جواب دیا تھا۔

برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ بات بے بات خفا ہونا۔ لڑنا جھگڑنا، بدکلامی پر اُتر آنا ـــ ایک بات اچھی تو دوسری ضرور تلخ ہوتی تھی۔ اور انجام ـــ لڑائی!

No way. ـــ اب وہ اور ذہنی پریشانی مول نہیں لے سکتا تھا۔

جوں توں کر کے وہ گھر پہنچا۔ اوپر بیڈروم میں گیا۔ کپڑے تبدیل کئے۔ سبز چائے منگوائی۔ اور آگ کے قریب صوفے پر ڈھیر ہوتے ہوئے ٹی وی آن کر دی۔

تھوڑی ہی دیر میں حمید گرم گرم خوش ذائقہ چائے لے آیا۔

گھونٹ گھونٹ کر کے پیتا وہ ٹی وی پر نظریں جمائے رہا۔ ذہن اب بھی پیچھے پلٹ پلٹ جاتا۔ نادیہ کی ساڑھی کا ڈھلکا پلو، نیم عریاں جسم، بلند قہقہے، ڈاکٹر کوثر کے منگیتر کے پیسے سے مرعوب باتیں ـــ اوچھی حرکتیں لگیں اُسے سب!

سر جھٹکتے ہوئے وہ پھر سے ٹی وی میں محو ہو گیا۔ اچھا پروگرام تھا۔ وہ دیکھتا چلا گیا۔

معاً اُس کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ نمبر دیکھا۔ نادیہ کا تھا۔ بند کر دیا اُس نے۔



ایک بار پھر بجنے لگا۔ اور پھر بار بار بجتا گیا۔ اُس نے اٹھا ہی لیا۔

"خفا ہو۔" نادیہ نے پوچھا۔

"نہیں"۔ وہ کوئی کمزوری نہیں دکھانا چاہتا تھا۔

"پھر فون ریسیو کیوں نہیں کر رہے تھے۔"

"بزی تھا"۔

"اچھا سوری یاور۔ اب مان جاؤ"۔

اتنے عرصے میں آج پہلی بار اُس نے اُسے منانے میں پہل کی تھی۔ سوری کہا تھا اُسے۔ شاید اِس لئے کہ آج اُس نے بھی پہلی بار ردِعمل دکھایا تھا!

"چھوڑو۔ کوئی اور بات کرو"۔

"اور بات یہ کہ ڈنر کے بعد انور صاحب مجھے اور کوثر کو آئس کریم کھلانے لے گئے۔ Kouser is really lucky yaawar...

تبھی ـــ اُس کے سرہانے رکھا فون بج اٹھا۔

اُس نے نجات کی سانس لی۔ پتہ نہیں کیوں انور کے نام سے ہی اُسے چڑ سی ہو گئی تھی۔

"اچھا میں بند کرتا ہوں۔ میرے لینڈ لائین پر رنگ آ رہی ہے۔ شاید ہوسپٹل سے ہو"۔ اُس نے کہا۔ اور سیل فون بند کر دیا۔

اُٹھتے ہوئے وہ اپنے بیڈ کے کنارے پر جا بیٹھا۔ ریسیور اُٹھایا۔

"یاور خان سپیکنگ۔" اُس نے ماؤتھ پیس میں کہا۔

"میں... میں... شندی بول رہی ہوں"۔

یاور خان کے کانوں میں جیسے کوئی رس گھول گیا۔ ساتھ ہی اُس کی جھجکتی سی آواز اور بے ترتیب ہوتی سانسوں پر وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔

"یس میم۔ کیا حال چال ہیں؟"

"وہ... ماما کے پاؤں میں موچ آ گئی ہے۔ سینکنے کو کہہ رہی ہیں۔ سینک

ٹھیک ہے یا مساج کر دوں؟''

''سینک ٹھیک ہے۔ ریسٹ بھی کریں''۔

''بس یہی کہنا تھا... آپ تو ٹھیک ہیں نا؟'' آج پہلی بار خود سے یاور خان کو فون کیا تھا۔ خواہ مخواہ کنفیوزڈ ہو رہی تھی۔

''بڑی جلدی خیال آیا''۔

وہ مسکرا دی۔ آہستہ سے۔

''دراصل ماما کو تکلیف ہے نا...'' اُس سے بات نہ بنی۔

''وہ ٹھیک ہو جائیں گی۔ تم مجھ سے باتیں کرو''۔ تکیوں سے پشت ٹکاتے ہوئے اُس نے ٹانگیں سیدھی پھیلا دیں۔

اور پھر —— وہ دونوں باتیں کرنے لگے۔

''پاپا کو مجھے میڈیکل کرانے کی بہت خواہش تھی''۔

باتوں باتوں میں یہ بات بھی آ گئی۔

''پھر؟'' وہ دلچسپی سے اُس کی ہر بات سن رہا تھا۔

''لیکن میری جان جاتی تھی میڈیکل کے نام سے ہی...''

''کیوں؟''

''Dead bodies کی ڈائسیکشن کا تصور کرتے ہی میں لرز جاتی تھی''۔

یاور خان کا فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا۔

''حیرت ہے۔ تم تو بادل کی گرج تک سے نہیں ڈرتیں۔ Dead body سے کیوں ڈر لگتا تھا۔'' اُس نے اُس کی بادل کے گرج سے ڈرنے پر لطیف چوٹ کی۔

''آپ میرا مذاق اُڑا رہے ہیں''۔ وہ بچوں کی طرح ناراض لگنے لگی۔

''سوری۔ سوری۔ اچھا آگے بتاؤ''۔

''اِس کے باوجود پاپا نے مجھے میڈیکل کالج میں ایڈمٹ کروا دیا...''



''اچھا؟''

''ہاں۔ اور جب پہلے ہی دن سب سٹوڈنٹس ڈائے سیکشن ہال میں جانے لگے۔ میں نے اندر جانے سے انکار کر دیا۔ تب مجھے ڈاکٹر ہاتھ سے پکڑ کر تسلیاں دیتا اندر لے گیا۔ جوں ہی میری نظر ٹیبل پر ڈیڈ بوڈی پر پڑی۔ میں Faint ہو گئی...''

یاور خان قہقہے پر قہقہے لگاتا رہا۔

''اچھا پھر کیا ہوا؟'' قہقہے ذرا تھمے تو اُس نے پوچھا۔

'' پھر کیا ہونا تھا۔ پاپا مجھے واپس لے آئے۔ اور میں 'لنڈن سکول آف آرٹس' میں داخلہ کروا کے وہاں چلی گئی''۔

''چچ چچ۔ بہت دکھ ہوا تمہاری رام کہانی سن کر...''

''آپ اُڑائیں میرا مذاق...''

''اچھا اب نہیں۔ بالکل نہیں''۔

''اچھا۔ آپ بتائیں۔ ڈاکٹر نادیہ سے پھر صلح ہو گئی آپ کی؟''

وہ اچانک چپ سا ہو گیا۔ جیسے ٹھنڈی میٹھی چھاؤں سے کوئی گرم تپتی دھوپ میں گھسیٹ لایا تھا اُسے۔

''ہاں''۔ اُس نے مختصراً کہا۔ ''میوہ خان بہت خوش ہے۔ شادی ہونے والی ہے نا''۔ دروازے کے درز میں سے میوہ خان کی جھلک دیکھتے ہی اُس نے بات بدل دی۔

''He is a nice guy. بہت ہی اچھا انسان ہے''۔

'اوہ کم آن۔ تم اپنے چوکیدار کی شادی پر جاؤ گے؟... تم بھی نا... بعض وقت تو مجھے سفوکیشن ہونے لگتی ہے تمہارے ساتھ...'

میوہ خان ہی کے بارے میں کہی نادیہ کی باتیں اُس کے کانوں میں گونجیں۔

اُس نے گہری سانس لی۔ دوبارہ اُس سے باتوں میں لگ گیا۔ کہ اُس کی معصوم اور پیاری باتیں اُس کے ذہنی کوفت پر مرہم کا کام کر رہی تھیں جیسے!

آنٹی نور جہاں وانکل چند روز کے لئے کہیں باہر گئے تھے۔ اُس کے چوکیدار نور محمد کی بیوی اُسے ملنے آئی تھی۔ پوری بستی میوہ خان کی شادی کے دن کا انتظار کر رہی تھی وغیرہ۔ شندی نے اُسے تمام نیوز دیں۔

''اب... بند کروں۔ ماما کے پاؤں پر سینک کرنا ہے''۔ اُس نے کہا۔

''تمہاری ماما کی تو...''

''گڈ نائیٹ''۔ شندی نے کہا اور فون بند کر دیا۔

کون کہہ سکتا تھا کہ وہ اتنے بڑے جاگیر کی واحد وارث تھی۔ اتنی humble تھی، اتنی منکسر المزاج!

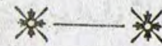
ماما کی خدمت، غریبوں کی قدر۔ قانع اتنی کے عرش سے فرش پر آئی تھی پر اُف تک نہیں کیا تھا!

چند پل وہیں بستر پر لیٹا وہ اُسی کے بارے میں سوچتا رہا۔

پھر چونکا ___ آج جن دو مریضوں کا آپریشن کیا تھا۔ اُن کا حال احوال لینا تھا۔

اُس نے ہوسپٹل فون کیا۔ نرس سے دونوں مریضوں کا حال دریافت کیا۔ اُن کا بی پی، یورین آؤٹ پُٹ وغیرہ۔

اپنی تسلی کر کے اُس نے لائیٹ آف کی۔ اور بستر میں گھستے ہوئے تھکی تھکی آنکھیں موند لیں۔





کل سے ہی یاور خان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ ٹانسلز بہت بڑھ گئے تھے۔ یہ پروبلم اُسے بہت عرصے سے تھی۔ مگر جتنا وہ اپنے مریضوں کے لئے فکرمند رہتا تھا۔ اتنا ہی خود سے غافل تھا۔

آج اُسے تیز بخار نے آ لیا تھا۔ ہوسپٹل میں بھی طبیعت خراب رہی۔ شام کی شفٹ کی اپنے میں ہمت نہیں پا رہا تھا۔ لنچ بریک میں ہی گھر آ گیا۔

اُسے کھانا دینے کے بعد حمید گھر چلا گیا۔ میوہ خان صبح سے ہی چھٹی پر تھا۔ دراصل شادی کے بعد آج میوہ خان کے سسرال والوں نے میوہ خان کے رشتہ داروں کی دعوت کی تھی۔ اُس کی حالت دیکھتے ہوئے حمید نے رک جانے کو کہا بھی مگر ___ یاور خان نے منع کر دیا۔ یہی چھوٹی چھوٹی تو اُن کی خوشیاں ہوتی تھیں۔

شام چھ بجے اُس کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی۔ ٹمپریچر $104^0c$ تک چلا گیا تھا۔ سپنجنگ کرنے کا سوچ رہا تھا۔ مگر اُٹھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ کوئی اُسے ایک کپ چائے ہی دے دیتا!

مگر___ گھر میں کوئی ہوتا تو یہ سب کرتا نا!

تبھی اُس نے نادیہ کو فون کر دیا۔ میل بھر پر تو تھی۔ پھر اُسے ہوسپٹل میں بھی معلوم تھا۔ اُسے ٹمپریچر تھا۔

''نادیہ میری طبیعت بہت خراب ہے۔ تم آ جاؤ پلیز!''

''اوہ یاور''۔ وہ کچھ پریشان سی لگنے لگی۔ ''تم ... خود کیوں دوائی نہیں لے لیتے ...''

اُس نے اُسے ڈاکٹر ہونے کے ناطے نہیں، کمپنی دینے کو فون کیا تھا۔

''دوائی تو لے لوں مگر___ چائے کون بنا کر دے گا؟'' اُس نے اچھے دوستوں کی طرح کہا۔

''ایکسکیوز می! تم مجھے چائے بنانے کے لئے بلا رہے ہو؟'' وہ یوں بولی جیسے یاور خان نے چائے بنانے کا کہہ کر اُس کی انسلٹ کی تھی۔

''نہیں۔ سپنجنگ کے لئے بھی''۔ وہ بہت آرام سے بولا۔

نادیہ جھنجلا اُٹھی۔

''نوکر نہیں ہیں کیا؟''

''نہیں۔ دونوں چھٹی پر ہیں''۔

''دراصل انور صاحب نے مجھے اور کوثر کو ڈنر پر بلایا ہے۔ اب میں انکار کروں گی تو برا لگے گا۔ میں ایسا کرتی ہوں کہ کسی نرس کو ...''

''تھینک یُو ویری مچ۔ نرس کو میں بھی بلا سکتا ہوں۔'' اُس نے کہا۔ اور___ فون بند کر دیا۔

پھر جانے جی میں کیا سمائی؟ شندی کا نمبر ملا لیا۔



''شندی میری طبیعت خراب ہے۔ میوہ خان اور حمید بھی چھٹی پر ہیں۔ تم آ سکو گی پلیز!''

''بالکل آ جاؤں گی۔ لیکن ...''

''لیکن کیا؟'' کیا وہ ابھی نادیہ کی طرح کوئی بہانہ بنانے لگی تھی؟

''اصل میں ماما نیچے کسی سے ملنے گئی ہوئی ہیں۔ میں اکیلی ... آ جاؤں''۔

''ہاں۔ آ جاؤ''۔

''کوئی کچھ کہے گا تو نہیں؟'' پتہ نہیں کیوں اکیلے آتے ہوئے وہ گھبرا رہی تھی۔

''کوئی کچھ نہیں کہے گا''۔ وہ نڈھال ہوتا جا رہا تھا۔ ''تم بس جلدی آ جاؤ۔'' اُس نے فون بند کر دیا۔

لمحوں میں ہی شندی اُس کے لاؤنج میں تھی۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ اُس کا بیڈ روم یقیناً اوپر تھا۔ اندازے سے اُس نے ایک دروازے پر ہولے سے دستک دی۔

''آ جاؤ''۔ یاور خان ہی تھا۔

وہ کچھ جھجکتی سی اندر داخل ہوئی۔ آخر تو وہ ایک جوان آدمی تھا اور اکیلا بھی۔ پر___ بیمار بھی تو تھا!

یاور خان کی دلنشیں آنکھوں میں دیئے سے جل اُٹھے۔

''شندی پلیز! جلدی سے ذرا میری سپنجنگ کرو۔ مجھے $104^0c$ ٹمپریچر ہے۔ ٹیبلٹس لی ہیں مگر ٹمپریچر کم کرنا ضروری ہے''۔

شندی جلدی سے نیچے گئی۔ کچن میں سے برتن میں ٹھنڈا پانی لائی۔ یاور خان نے اُسے ڈریسنگ روم میں الماری میں رکھے ٹاول نیپکن دکھائے۔ وہ نکال لائی۔ اور بھگو بھگو کر اُس کے ماتھے پر رکھنے لگی۔

یاور خان کی آنکھیں بند تھیں۔ شندی پریشان تھی۔ جلدی جلدی پانی اور نیپکن بدل رہی تھی۔ کچھ دیر بعد ٹمپریچر نیچے آنے لگا۔ شندی اب بھی لگی ہوئی تھی۔ آدھے گھنٹے تک یاور خان کی طبیعت کافی سنبھل گئی۔

''بس شندی۔ تھینک یو سوچ''۔ ممنونیت سے کہتے ہوئے اُس نے اُس کا ہاتھ روک دیا۔ ''یہ تھرمامیٹر مجھے دو۔ میں ٹمپریچر چیک کرتا ہوں۔'' اُس نے اپنے سائیڈ ٹیبل پر رکھے تھرمامیٹر کی طرف اشارہ کیا۔

شندی نے تھرمامیٹر جھٹکتے ہوئے اُسے دیا۔ اور نیپکن اور برتن نیچے لے گئی۔

واپس آئی۔ تو یاور خان بہتر اور مطمئن لگ رہا تھا۔

''اب بیٹھو''۔ اُس نے اُسے ہاتھ سے تھامتے ہوئے اپنے بیڈ پر بٹھا لیا۔ ''اور مجھ سے باتیں کرو''۔

پتہ نہیں کیوں وہ کچھ گھبرا سی گئی۔

''اب واپس نہ جاؤں؟''

''کیوں؟''

''مجھے ڈر لگ رہا ہے''۔ اُس نے خدشہ ظاہر کر ہی دیا۔

''کس سے؟''

''آپ کے نوکروں سے''۔

''وہ چھٹی پر ہیں''۔

اوہ۔۔۔ لیکن ماما گھر آ گئیں تو؟''

''کچھ نہیں کہیں گی ماما''۔

''لیکن ...''

''اب یہ مت کہنا کہ مجھ سے ڈر لگتا ہے۔'' وہ خوشگواری سے بولا۔

''آپ سے مجھے ڈر نہیں لگتا۔'' وہ بہت وثوق سے بولی۔

''Sure?'' اُس کے انداز میں شرارت تھی۔



''ہاں''۔ وہ بھی اُسی لب و لہجے میں بولی۔

''اچھا ایک منٹ''۔ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''اُس کا بستر درست کیا۔ سائیڈ ٹیبل پر رکھی دوائیاں، الارم کلاک وغیرہ ٹھیک سے رکھے۔ صوفے پر دھرے اخبار و میگزین ترتیب سے میز پر رکھے۔ وہیں پڑا بریف کیس اُٹھا کر اُس کے بستر کے پرلی طرف سائیڈ ٹیبل کے قریب رکھا۔

پھر۔۔۔ آتش دان میں بکھری اُدھ جلی لکڑیاں اکٹھی کر کے ترتیب سے رکھنے لگی۔

کروٹ کے بل لیٹا یاور خان اُسے دلچسپی سے تکتا رہا۔ منع نہیں کیا۔ پتہ نہیں کیوں؟

سب ٹھیک ٹھاک کر کے وہ نیچے چل دی۔ کچن میں جلدی جلدی یاور خان کے لئے کوفی بنائی اور چھوٹی سی ٹرے میں کپ سجاتی اُس کے کمرے میں آ گئی۔

اُسے حیرت سی ہوئی۔ شدید طلب ہو رہی تھی اُسے کوفی کی اس وقت!

شندی نے ٹرے اُس کے سائیڈ ٹیبل پر رکھی۔ پھر اُس کے تکیے بستر کی پشت سے لگائے۔ اور۔۔۔ یاور خان نے آہستہ سے اوپر کھسکتے ہوئے ٹیک تکیوں سے لگا لی۔

شندی نے کپ اُٹھا کر اُسے تھما دیا۔

یاور خان ممنونیت سے اُسے دیکھتا رہا۔ 'شکریہ' کا لفظ اُسے بہت کم لگ رہا تھا۔

''تم بہت اچھی ہو شندی''۔ وہ اتنا ہی کہہ سکا۔

''آپ بھی بہت اچھے ہیں''۔ وہ دھیرے سے بولی۔

وہ مسکرا دیا۔ وہ بدلہ ضرور لیتی تھی!

ایسا پہلے بھی ہوا تھا۔ ایک دن صبح کے وقت وہ جوگنگ سے واپس آ رہا

تھا۔ تو شندی بالکنی میں کھڑی نظر آئی۔

''اتنی صبح صبح باہر کیوں کھڑی ہو۔ ٹھنڈ لگ جائے گی''۔ اُس نے کہا تھا۔

''آپ بھی تو صبح صبح باہر نکلے ہیں''۔ اُس نے اُسی کے لب و لہجے میں کہا تھا۔

اور پھر ـــ ایک رات اپنی بالکنی سے کھڑے کھڑے اُس نے شندی کو فون کیا تھا۔ اُسے پتہ چلا کہ وہ بھی اپنی بالکنی میں کھڑی تھی تو:

''کسی دن تمہیں نمونیہ ہو گیا نا۔ تو پھر مجھے مت بلانا''۔ اُس نے کہا تھا۔

''کسی دن آپ کو نمونیہ ہو گیا نا۔ تو پھر مجھے مت کہیں۔'' شندی نے اُس کے ہی الفاظ اُسے لوٹا دیئے تھے!

''بیٹھو نا۔ جب تک حمید نہیں آتا۔ تم نے مجھے اٹینڈ تو کرنا ہی ہے۔۔۔'' وہ بالکل یوں بولا جیسے اُس پر اُس کا حق بنتا۔

''ہاں۔ میں آپ کو ایسے میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔ ایک کام کرتی ہوں۔۔ نیچے جا کر ماما کو آواز دیتی ہوں۔ وہ بھی آجائیں گی تو۔۔۔''

''پھر تمہیں مجھ سے ڈر نہیں لگے گا''۔

''آپ سے نہیں ... لیکن پتہ نہیں کیوں اَن ایزی سا فیل کر رہی ہوں۔''

وہ مسکرا دیا۔ ہولے سے۔

اُس نے نوٹ کیا تھا۔ شروع شروع میں شندی اُس کے ساتھ بہت اعتماد سے باتیں کرتی تھی۔ بلکہ کچھ اتھارٹی سی ہوتی تھی اُس کے انداز میں۔ وہ اُس کی Ragging بھی کرتی تھی۔ سینس آف ہیومر تھا اُس میں۔ لیکن ـــ جوں ہی یاور خان کے لئے اپنی دلچسپی کا احساس ہوا تھا محتاط سی ہو گئی تھی۔ آن گارڈ سی!

''اچھا جاؤ۔ لیکن جلدی آؤ۔ میں انتظار کروں گا''۔

''اوکے''۔ اور وہ نیچے چلدی۔



تھوڑی ہی دیر میں واپس آ گئی۔ اُس کی ناسازی طبیعت کا سن کر ماما کو ہول اٹھنے لگے تھے۔ بدحواسی میں ایک جوتا نہیں مل رہا تھا۔ بس آنے ہی والی تھیں۔

اب وہ مطمئن تھی۔ یاور خان نے اُسے بیڈ کے کنارے پر بٹھایا تو تسلی سے بیٹھ گئی۔

یاور خان نے کوفی کا آخری گھونٹ لیا۔ تو شندی نے کپ تھام لیا۔

''اب اِسے کچن میں مت لیکر جاؤ۔ یہیں رکھ دو''۔

کہ بار بار آنے جانے میں اُسے زحمت بھی ہو رہی تھی اور پھر ـــ جانے کیا تھا؟ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اُس کے پاس سے کہیں جائے!

شندی نے کپ بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

''میں لیٹتا ہوں''۔ وہ تھکا تھکا سا تھا۔ ''اور تم باتیں کرو مجھ سے۔ رائیٹ؟''

وہ واقعی لیٹنے لگا۔ شندی نے اُسے لیٹنے میں مدد دی۔ تکیے درست کیئے۔ اور بستر بھی ٹھیک کر دیا۔ پھر آہستہ سے اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔

''باتیں کرو نا۔'' آنکھیں موندے وہ دھیرے سے بولا۔

''آپ سو جائیں، آپ کو آرام کی ضرورت ہے''۔

وہ ـــ اُس کے قریب بیٹھی تو تھی مگر ـــ جانے کیوں تنہائی میں اُس کی قربت سے کنفیوزڈ ہوئی جا رہی تھی۔

''تمہاری باتوں سے ہی تو مجھے آرام ملتا ہے''۔ اُس نے دلنشین آنکھیں کھولتے ہوئے شندی پر جما دیں۔

اُس کی ہر دم بولتی آنکھیں وہ سہار نہ سکی۔ پلکوں کی چلمن گرنے اٹھنے لگی۔

''ہوں ـــ بولو نا''۔ اُس نے اصرار کیا۔

''آپ آنکھیں بند کریں۔ پھر میں باتیں کروں گی''۔ خود کو سنبھالتے

ہوئے اُس نے سادگی سے کہا۔

اور۔۔۔ اُس کا جاندار قہقہہ بلند ہوا۔

''آنکھیں بند کروں گا۔ تو تم کیسے نظر آؤ گی؟'' وہ اب بھی اُسے دیکھ رہا تھا۔

اور۔۔۔ غیر اِرادی طور پر شندی کا ہاتھ آگے بڑھا۔ اور اُس کی آنکھوں کو چھپا لیا۔

وہ ہنستا چلا گیا۔ دلآویزی سے۔

''اتنا مت ہنسیں۔ پھر ٹمپریچر ہو جائے گا''۔ اُس کا ہاتھ اب بھی اُس کی آنکھوں پر تھا۔

''اچھا ہاتھ ہٹاؤ۔ اب نہیں ہنسوں گا''۔

شندی نے ہاتھ ہٹا لیا۔ پھر۔۔۔ دھیرے دھیرے اُس سے باتیں کرنے لگی۔

اپنی آنے والی برتھ ڈے کے بارے میں، اپنے پاپا کے بارے میں، اور۔۔۔ انکل ذوالفقار اور یاور خان کے مشورے پر اُس نے جو انکل جہانگیر پر پاپا کے قتل کی دعویداری کر دی تھی۔ اُس کے بارے میں!

''تمہارے چچا نے اپنی ضمانت کرالی ہے۔ بقول نواز وہ سخت پریشان ہے۔ کہ تم کہاں اور کس کے پاس ہو؟ پولیس تمہارے ملازموں کی تلاش میں چھاپے مار رہی ہے۔ کیونکہ اکرم بابا بھی کہیں چھپ گئے ہیں۔ اور مسز علی ابھی بھی کہیں روپوش ہے''۔

''مجھے تو بہت ڈر لگتا ہے۔ ماما بھی کہتی ہیں اکرم بابا اور نواز نے گواہی دی تو انکل اُن دونوں کو جان سے مار ڈالیں گے۔۔۔''

''کمال کرتی ہو۔ اِس طرح ڈرتی رہو گی تو زندگی کیسے گزارو گی اور پھر مجرموں کو سزا تو بہرحال ملنی چاہئے''۔

''لیکن آپ بیچ میں مت پڑیں۔ وہ اتنا کچھ کر سکتے ہیں تو آپ کو بھی



نقصان پہنچا سکتے ہیں۔'' وہ پریشان نظر آرہی تھی۔

''اب تو پڑ گیا ہوں''۔ وہ مسکرایا۔

''آپ کو کچھ ہو گیا تو؟''

''مجھے کچھ نہیں ہو گا''۔ اُس کے خوبصورت نازک ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے اُس نے اُسے تسلی دی۔

تبھی نیچے لاؤنج میں آہٹ ہوئی۔

''شندی بی بی۔ شندی بی بی۔ کہاں ہو بیٹا؟'' ماما کی گھبرائی سی آواز ابھری۔

شندی اُٹھتے ہوئے سیڑھیوں کی لینڈنگ پر گئی۔ نیچے دیکھا۔

ماما ہاتھ میں مٹی کے برتن میں ہرمل سلگائے کھڑی تھیں۔ اُسے ہنسی آگئی۔ حویلی کے طور طریقے ماما بھولی نہیں تھیں۔

''ماما اوپر آجائیں۔'' وہ وہیں سے بولی۔

شندی کے ساتھ ساتھ ماما بھی یاور خان کے کمرے میں داخل ہوئیں۔

یاور خان کے قریب آ کر ایک ہاتھ میں برتن دوسرے سے ہرمل کا دھواں اُڑا رہی تھیں۔ ساتھ میں کوئلوں کو جلائے رکھنے کے لئے پھونکیں بھی مار رہی تھیں۔

''نظر لگی ہے نظر''۔ وہ ڈھیر سارا دھواں یاور خان کے چہرے پر اُڑاتے ہوئے بولیں۔

یاور خان بالکل سیریس تھا۔ وہ پرانے طور طریقوں، بزرگوں کی برکت اور رشتوں کا پیاسا تھا۔ اُسے اچھا لگ رہا تھا یہ سب!

پھر ماما نے پورے کمرے میں دھواں دیا۔ اور سائیڈ ٹیبل پر سے خالی برتن اٹھاتے ہوئے نیچے کچن میں چلی گئیں۔

''حویلی میں ماما روزانہ ہرمل کا دھواں دیا کرتی تھیں۔'' انگیٹھی کے

قریب صوفے پر بیٹھی شندی بولی۔

''اچھا۔ اِس کو ہرل کہتے ہیں۔ تمہیں پتہ ہے میں زندگی میں پہلی بار اپنے وطن آیا ہوں۔ یہ سب کچھ مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔ ایسی باتوں کے بارے میں مَیں اپنی مدر سے سنا کرتا تھا...''

''حالات بہتر ہوئے تو میں آپ کو اپنے علاقے میں لے کر جاؤں گی۔ وہاں آپ ہمارے حجرے، حویلی، فارمز وغیرہ میں گھومیں گے پھریں گے۔ تو آپ کو صحیح لطف آئے گا...''

''پکی بات ہے؟'' وہ پھر شرارت پر اُتر آیا۔

''ہاں''۔ وہ بھی ہنس دی۔

''ٹھہراؤ گی کہاں مجھے؟''

''اپنی حویلی میں''۔

''ڈر تو نہیں لگے گا؟''

''کس سے؟''

''مجھ سے۔''

''میں آپ سے نہیں ڈرتی''۔

''کتنا اچھا ہوں نا میں؟''

نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

اور___ یاور خان کو لگا۔ دور کہیں پریوں کے دیس میں جھانجر بج اُٹھے تھے!

''تم ہنستی بہت اچھا ہو''۔

''آپ سے کم''۔ اُس کے جاندار قہقہے اکثر اُسے مسحور کیے رہتے۔

وہ ہولے سے مسکرا دیا۔ اُس نے پھر بدلہ لیا تھا!

تبھی___ دروازے پر دستک ہوئی۔ ماما تھیں۔



''بیٹا۔ حمید آ گیا ہے۔ گھر چلو گی؟'' اُنہوں نے وہیں سے کہا۔

''جی ماما''۔

ماما واپس پلٹ گئیں۔

''اب چلوں؟'' وہ صوفے سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''ہاں۔ and thank you for such lovely company.''

''اپنا خیال رکھیں۔ اور پلیز! کوئی پروبلم ہو تو رنگ ضرور کریں۔''

''اچھا''۔

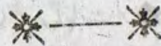
''گڈ نائیٹ''۔ وہ بولی۔ اور دروازے کی طرف بڑھی۔

''گڈ نائیٹ''۔ یاور خان اُسے جاتے دیکھتا رہا۔

کتنی calm کتنا دھیرج لئے تھی شندی۔ کتنی مدھر، پرسکون کمپنی تھی اُس کی!

نادیہ نہیں آئی اِسی میں شاید بہتری تھی۔ بات کسی بھی موضوع سے شروع ہوتی ختم یقیناً لڑائی پر ہی ہوتی تھی یا پھر آج کل___ انور صاحب پر!

گہری سانس لیتے ہوئے___ اُس نے ایک بار پھر تھکی آنکھیں موند لیں۔



دن آہستہ آہستہ گزر رہے تھے۔ یاور خان نے حسب عادت نادیہ سے کوئی شکوہ نہیں کیا۔ کہ ایک ڈاکٹر ہونے کے ناطے ہی وہ آکر اُسے دیکھ جاتی۔ اچھے دوستوں کی طرح اُس سے اُسی طرح بات کرتا رہا۔ ضرورت پڑھنے پر پک اینڈ ڈراپ کرتا رہا۔ پر ـــــ

اُس نے نوٹ کیا۔ نادیہ کی اُس کے لئے وہ والی گرمجوشی نہیں رہی تھی۔ جو کچھ عرصہ پہلے ہوا کرتی تھی۔ اور ـــــ خود اُس نے اپنا جائزہ لیا۔ تو وہاں بھی خاموشی سی ہی پائی!

ایسا کیوں ہوا تھا؟

نادیہ کی گرمجوشی شاید اِس لئے کم ہوئی تھی۔ کہ یاور خان اُس کے معیار پر پورا نہیں اُترا تھا۔ اُس نے اُس کی بے باکی پر اُسے تنبیہہ کی تھی۔ اُس کی بد



زبانی پر اُسے ٹوکا تھا۔ اور ـــــ ایف اے فیل انور کی طرح اُس کے سامنے اپنی دولت کی نمائش نہیں کی تھی!

خود اُس کے من میں خاموشی سی شاید اِس لئے چھا گئی تھی۔ کہ قدرے فاصلہ آجانے کی وجہ سے اُس کی روز روز کی بے اطمینانی اور پریشانی خاصی کم ہو گئی تھی۔ سکون جیسے لوٹنے لگا تھا۔ سو بہتر تھا۔ من میں خاموشی ہی رہتی!

صبح سے وہ دو آپریشن کر چکا تھا۔ خاصے پیچیدہ تھے دونوں ہی آپریشنز۔ ابھی تیسرا آپریشن بھی کرنا تھا۔ تھکا تھکا سا وہ سرجن لاؤنج میں آیا۔ کیپ، ماسک ،گلووز وغیرہ اتارے۔ واش بیسن میں ہاتھ دھوئے۔ پھر پرلے سرے پر کچنٹ میں آ گیا۔ الیکٹرک کیتل میں پانی ڈالا، سوئچ آن کیا۔ کپ میں ٹی بیگ اور شوگر ڈالا، اوپر سے کھولتا ہوا پانی انڈیلا اور تھوڑا سا دودھ ڈال کر چمچ چلاتے ہوئے سامنے دیوار کے ساتھ لگے صوفے پر آ بیٹھا۔

ٹانگیں میز کے نیچے سیدھی پھیلاتے ہوئے وہ چائے کے گرم گرم گھونٹ حلق سے اتارنے لگا۔

نادیہ بھی اپنی چائے کا کپ ہاتھ میں لئے وہیں آ گئی۔

''کل میں چھٹی کے وقت تمہیں ڈھونڈتی رہی۔ تم نظر ہی نہیں آئے۔''

نادیہ اُس کے پاس بیٹھتے ہوئے گویا ہوئی۔

''تم نے میسج ہی نہیں دیا تھا۔'' اُس نے ساتھ جانا ہوتا تھا تو سیل فون پر میسج دے دیتی تھی۔

''کل میں اپنا سیل گھر بھول آئی تھی''۔

''ہوں ـــــ ویسے کل میں بھی ذرا جلدی میں تھا۔ فوراً ہی نکل گیا تھا''۔

''خیریت تھی؟''

''ہاں۔ بس ایک دوست نے ٹائم دیا ہوا تھا۔ گھر آنا تھا اُس نے''۔

چائے کا کپ میز پر رکھتے ہوئے، سر صوفے کی پشت سے ٹکا کر اُس

نے آنکھیں موندلیں۔

''تھک گئے ہو؟'' نادیہ نے پوچھا۔

''ہاں۔اور ابھی تیسرا آپریشن بھی کرنا ہے''۔اُس کی آنکھیں اب بھی بند تھیں۔

''ویسے تمہیں نہیں لگتا کہ ڈاکٹرز بن کر ہم نے بیوقوفی کی ہے۔'' نادیہ نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔اِس سے تو اچھا تھا کوئی بزنس ہی کر لیتے...''

اُسے ہنسی آگئی۔جب سے انور سے ملی تھی۔حواسوں پر بزنس ہی چھا گئی تھی۔

''نہیں مجھے نہیں لگتا ایسا۔'' اُس نے سیاہ دلنشین آنکھیں کھول دیں۔

''بزنس میں بہت پیسہ ہے''۔

''ڈاکٹر، ڈاکٹر ہے۔'' اُس نے Firmly کہا۔اور چائے کا کپ اٹھا کر ہونٹوں سے لگالیا۔

''تم تو میرے اُلٹ کوئی بات نہ کرو۔تو تمہیں چین نہیں آتا۔'' وہ بُرا مان گئی۔

وہ مسکرادیا۔وہ شاید لڑنے کی تمہید باندھ رہی تھی۔مگر ــــ پتہ نہیں کیوں اب اُس کی لڑائی سے اُسے وہ پریشانی نہیں ہوتی تھی جو کچھ عرصہ پہلے ہوا کرتی تھی۔

تبھی ڈاکٹر نادر بھی وہاں آگیا۔نادیہ دل کی بھڑاس نکال نہیں پائی۔سو جلدی جلدی چائے ختم کی۔اور ایکسکیوز کرتے ہوئے وہاں سے اُٹھ کر دوسری سمت چلی گئی۔

''سر کل میرے آفس میں زوردار لڑائی ہوئی ہے میَم نادیہ کی ڈاکٹر کوثر کے ساتھ''۔نادر نے اُس کے جاتے ہی قدرے نیچی آواز میں یاور خان کو خبر دی۔



ڈاکٹر نادر لڑائی کی خبر سے زیادہ اُسے احتیاط برتنے کے خیال سے یہ بات کہنا چاہتا تھا۔جونیئر تھا اُس سے۔مگر بے تکلف اور خیر خواہ دوست بھی تھا۔

''باپ رے۔'' آنکھیں پوری کھولتے ہوئے وہ خوبصورتی سے ہنس دیا۔

نادیہ اُس کے علاوہ بھی لوگوں سے لڑتی تھی، خاصی دلچسپ خبر تھی۔

''سر پتہ ہے لڑائی کس بات پر ہوئی ہے؟''

یاور خان خاموشی سے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔

''ڈاکٹر کوثر نے میَم نادیہ کو اپنے منگیتر کے ساتھ کسی ہوٹل میں ڈنر کرتے دیکھ لیا تھا''

پل بھر کو یاور خان کے پرکشش چہرے پر سایہ سا لرز گیا۔گو نادیہ سے اُس کا تعلق کبھی اتنا مضبوط اور ہموار نہیں رہا تھا لیکن ــــ جیسا بھی تھا۔تعلق تھا تو! بہر حال ــــ وہ جلدی ہی سنبھل گیا۔

''خوب تُو تُو میں میں ہوئی۔کوثر نے صرف اتنا کہا کہ سُنا ہے کل انور کے ساتھ ڈنر پر گئی تھیں۔جبکہ وہ خود اُسی ہوٹل میں اپنی فیملی کے ساتھ موجود تھی۔سنتے ہی آتش پا ہو گئیں۔جو منہ میں آیا کہہ گئیں۔بجائے گلٹی فیل کرنے کے الٹا اُس پر برس پڑیں۔بالکل جاہلوں کی طرح لڑ رہی تھیں۔وہ نہیں ہوتیں گاؤں کی عورتیں جو دیوار پر سر اٹھا کر ایک دوسرے کے ساتھ لڑتی ہیں...''

''اوہ نو۔'' یاور خان کا بے اختیار فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا۔

''ہاں سر۔بالکل ایسا ہوتا ہے ہمارے دیہاتوں میں''۔نادر بولا۔

اُسے معلوم تھا یاور خان ملک سے باہر پلا بڑھا تھا۔دیہاتی زندگی سے واقف نہیں تھا۔''عورت دیوار سے چارپائی لگا کر اُس پر چڑھتے ہوئے ہمسائی کی خوب خبر لیتی ہے۔ہمسائی بھی جی بھر کر کوسنے دیتی ہے۔کبھی کبھی ایک آدھی برتن بھی ایک دوسری کو دے مارتی ہیں...''

"یہاں ہمسائی نے کیا کیا؟" یاور خان اب بالکل نارمل تھا، دلچسپی سے پوچھا۔

اب کے نادر زور سے ہنس پڑا۔

"سر۔ ڈاکٹر کوثر بہت ڈیسنٹ لڑکی ہے۔ وہ خاموش تھی۔ ڈاکٹر نادیہ ہی بولے جا رہی تھیں۔"

"End result کیا ہوا؟"

"کیا ہونا تھا۔ بس میم نادیہ اُسے خوب سنا کر چائے چھوڑ چھاڑ کھٹ پٹ کرتی وہاں سے چل دیں۔"

یاور خان کے ساتھ نادر بھی اِس واقعہ پر دیر تک ہنستا رہا۔

شام چھ بجتے ہی یاور خان ہوسپٹل سے نکل آیا۔ اکیلا ہی تھا۔ نادیہ نے پک کرنے کو کوئی میسیج نہیں دیا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے کی بات البتہ اور تھی۔ اگر اُسے میسیج یا رنگ کرنے میں دیر ہو جاتی تو وہ خود ہی پوچھ لیتا تھا۔ بلکہ کبھی کبھی تو زور دیتا تھا ساتھ جانے پر۔ مگر ___ کچھ دنوں سے واقعی فاصلے آ گئے تھے دونوں کے بیچ!

گھر کے بجائے اُس نے گاڑی کا رخ بازار کی طرف کر لیا۔ کچھ ضروری شوپنگ کرنا تھی۔

سردی اب بھی جوبن پر تھی۔ بادل اب بھی آسمان پر منڈلا رہے تھے اور ___ لوگ اب بھی گرم کپڑوں کا بوجھ اُٹھائے زندگی کا کاروبار جاری رکھے تھے۔

شام گہری ہو رہی تھی۔ اُس نے نئے بنے شوپنگ مال کی پارکنگ میں گاڑی پارک کر لی۔

اندر جا کر وہ اپنی مطلوبہ چیزیں خریدنے لگا۔ کافی دیر تک خریداری کرتا رہا۔ پھر ایک ویڈیو شاپ پر آ گیا۔ اچھی سی دو چار موویز اٹھائیں۔ دکان سے



نکل ہی رہا تھا۔ کہ نظر مقابل کے جیولر کی دکان پر پڑی۔

وہیں نادیہ اور انور کھڑے تھے۔ انور نادیہ کی کلائی میں بریسلٹ پہنا رہا تھا۔ وہ بہت خوش دکھائی دے رہی تھی۔ پھر ___ اُس کی آنکھوں میں دیکھتے دیکھتے انور نے اُس کا وہی ہاتھ تھامتے ہوئے اُس پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔

تو ___ ڈاکٹر کوثر کا شبہ درست تھا!

مووی کی دکان سے وہ سیدھا بیکر کی دکان پر گیا۔

غیر ارادی طور پر شندی کا نمبر ملایا۔

"میں مال میں کھڑا ہوں۔ تمہیں کچھ چاہئے تو بتاؤ"۔ اُس نے شندی سے کہا۔

شندی نے کچھ چیزیں منگوالیں۔

"بس؟" یاور خان نے پوچھا۔

"اور کوفی اور..."

"اور چوکلیٹس اور مارزی پان۔ یہی نا؟"

وہ خاموشی سے مسکرا دی۔ کہ یہی چیزیں وہ اکثر اُس سے منگواتی رہتی تھی!

اپنے گھر کے لئے بھی اُس نے بیکری کی چیزیں لیں۔ اور سٹور سے باہر نکل آیا۔

رات کی سیاہیاں گھر آئی تھیں۔ شہر کی روشنیاں جگ مگ جگمگ کر رہی تھیں اور ___ ہڈیوں کو چیرتی سردی در آئی تھی!

مختلف موڑ موڑتا وہ آبادی سے باہر نکل آیا۔ کولتار کی پتلی وائینڈنگ سڑک پر نظریں جمائے وہ اپنے گھر کی طرف رواں دواں تھا۔

گاہے گاہے اُس کے ذہن میں ڈاکٹر کوثر اور نادیہ کی لڑائی کی بات

ابھرتی۔ پھر ـــ کچھ دیر قبل نادیہ اور انور کی شبیہہ دکھائی دیتی۔

اُس نے خود کو ٹٹولا۔ وہاں کوئی واضح پریشانی نظر نہیں آئی۔

ڈاکٹر کوثر کا خیال آیا۔ یہاں نادیہ نے ضرور پیچھے سے وار کیا تھا!

ڈاکٹر کوثر نے اُس پر اعتماد کیا تھا۔ انور سے ملوایا تھا۔ ساتھ لیکر گھومی پھری تھی۔ اُس کا نادیہ نے جو جواب دیا تھا۔ وہ حیران کن ضرور تھا!

بہرحال ـــ اُس نے خیال جھٹکا۔ اور گاڑی دائیں طرف بستی کی جانب موڑلی۔

آسمان یہاں بھی ابر آلود تھا۔ بڑا سا چاند یہاں وہاں سے جھانکتا دھیرے دھیرے اوپر اُٹھ رہا تھا اور ـــ اوپر اُن کے گھروں میں کسی لائیٹ ہاؤس کا کام دیتیں بتیاں جھلمل جھلمل کر رہی تھیں۔

اُس نے حسبِ سابق شیشہ ذرا سا نیچے کر لیا اور ـــ دور پار کے جزیروں، جنگلوں اور جھرنوں کی خوشبوؤں میں سب کچھ بھول گیا۔

لاؤنج میں سے ہوتا سیڑھیوں پر چڑھنے ہی لگا تھا۔ کہ کچن سے حمید برآمد ہوا۔

''صاحب۔ جج صاحب کا فون آیا تھا۔ ڈنر کی یاددہانی کرا رہے تھے۔'' وہ بولا۔

''گوڈ!'' وہ تو بالکل بھول گیا تھا۔

وہ جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

بہت تھکا ہوا تھا آج۔ جسمانی طور پر بھی اور ذہنی طور پر بھی۔ لیکن جانا ضروری تھا۔ کہ عرصہ بعد آنٹی و انکل کا بیٹا ابراہیم پڑھائی ختم کر کے انگلینڈ سے لوٹا تھا۔ اور یہ ڈنر اُسی خوشی میں دیا گیا تھا۔

اُس نے کوفی بھی نہیں پی۔ تیار ہوا۔ اور انکل ذوالفقار کے گھر کی طرف چل دیا۔



چیدہ چیدہ انوائیٹڈ مہمان تقریباً سب آ گئے تھے۔ کوزی ڈرائنگ روم قیمتی سگریٹس، پرفیومز سے مہک اور روشنیوں سے دمک رہا تھا۔

یاور خان اندر داخل ہوا۔ تو انکل ذوالفقار اور ابراہیم نے گرم جوشی سے اُسے ریسیو کیا۔ پھر مہمانوں سے ملوایا۔ اور ابراہیم نے اپنی قریبی سیٹ آفر کی۔

سبھی مہمان خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ مرد حضرات سیاست اور حالاتِ حاضرہ پر بحث کر رہے تھے تو خواتین شادی بیاہ، کپڑوں اور جیولری کی جدید ترین ڈیزائنز پر روشنی ڈال رہی تھیں۔

تبھی ـــ شندی اندر داخل ہوئی۔

ایمرلڈ گرین شلوار قمیض، کندھے پر میچ کرتی بیش قیمت شال، کانوں میں ایمرلڈز کے بڑے بڑے دیدہ زیب آویزے، کمر کو چھوتے گھنے ڈارک براؤن بال، حسین چہرہ، حسین آنکھیں ـــ بلاشبہ وہ حسنِ مجسم تھی!

جانے کیوں یاور خان کا دل بے ترتیبی سے دھڑکا۔

ابراہیم جلدی سے اُٹھتے ہوئے اُس کے پاس گیا۔ اور اُسے گائیڈ کرتا آنٹی نور جہان کے پاس لے آیا۔ اُنہوں نے اُسے وہیں اپنے پاس بٹھالیا۔

سب خواتین اُسے توصیفی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ آنٹی نے بڑی محبت اور خلوص سے اُس کا تعارف سب سے کروایا۔ آنٹی واحد ہستی تھیں جنہیں یاور خان نے شندی کے بارے میں سب کچھ صحیح صحیح بتایا تھا۔ اور اُسی ہی کے کہنے پر اُنہوں نے آج تک شندی کو بھی نہیں بتایا تھا کہ وہ اُس کی اصلیت کے بارے میں کچھ جانتی تھیں۔ اِس وقت اپنی دوستوں سے بھی اُنہوں نے صرف اتنا کہا کہ وہ ان کے عزیزوں میں سے تھی اور پڑھائی کے سلسلے میں اُن کے یہاں اینکسی میں مقیم تھی۔

سبھی باتوں میں مصروف تھے۔ یاور خان کی نظر ایک بار پھر شندی کی

طرف اُٹھی۔

چہرے پر بکھر آئے خوبصورت بال پیچھے ہٹاتی، پُرکشش ہونٹوں پر حسین ترین سمائل سجائے وہ شرمیلے سے انداز میں کسی خاتون کی بات کا جواب دے رہی تھی۔

اچانک ہی وہ اُسے اپنے بہت قریب لگی۔ بہت اپنی لگی۔

اُسے لگا وہ صدیوں سے اُسے جانتا تھا۔ ملا صرف آج تھا۔

لیکن نہیں ___ وہ اُسے آج نہیں ملا تھا۔ بہت دن پہلے ملا تھا۔

اُس دن ___ جس دن حویلی میں اُس کے پاس جا کر اُس نے اُسے Slow poisoning سے محتاط رہنے کی ہدایت کی تھی!

وہ اُس کے غیر معمولی حسن، باوقار سراپے اور میجیسٹک ناز و انداز سے اُسی وقت ہی اِمپریس ہوا تھا۔ اور باقی کا تمام وقت جو وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ جان پہچان کے ناطے اُس سے چھیڑ چھاڑ کرتا تھا، اچھی دوست سمجھ کر گپ شپ کرتا تھا۔ یہ بھی اُس میں دلچسپی کا ہی پہلو تھا!

اُس نے سوچا۔ منزل تو اُس کی یہاں تھی۔ وہ کہاں بھٹکتا پھر رہا تھا؟

تبھی ___ کھانے لگنے کا اعلان ہوا۔ سبھی ڈائننگ روم کی طرف جانے لگے۔

بوفے ڈنر تھا۔ خواتین ایک بار پھر ایک طرف سمٹ آئیں۔ کچھ لوگ خود پلیٹ اٹھا رہے تھے۔ کچھ کو آنٹی و انکل دے رہے تھے۔ خواتین کو ابراہیم ہی سرو کر رہا تھا۔

یاور خان نے دیکھا۔ شندی کو پلیٹ پکڑاتے ہوئے ابراہیم نے غور سے اُس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ وہ بے کل سا ہو گیا۔ شندی میں اپنی دلچسپی ایک طرف، اُس کے ساتھ اُس کا دوسرا رشتہ بھی تو تھا!

بہر حال ___ مہمان میز پر لگی ڈشز میں سے کھانا لے لیکر ایک طرف



کھڑے ہوتے گئے۔ ابراہیم تمام وقت شندی کو ہی سرو کرتا رہا۔ یاور خان کو اپنی کنپٹیاں سلگتی محسوس ہو رہی تھیں۔

سب ایک بار پھر ___ کھانا کھاتے ہوئے گپ شپ میں مصروف ہو گئے تھے۔

تبھی ___ یاور خان شندی کے پاس چلا آیا۔

''گڈ ایوننگ میم''۔ وہ اپنے مخصوص مدھر انداز میں بولا۔

نظریں اٹھا کر شندی نے دیکھا۔ سیاہ قیمتی سوٹ میں ملبوس، مقناطیسی شخصیت میں سپریم خود اعتمادی، دلنشیں آنکھوں میں اٹل اتھارٹی لئے، جیسے کوئی گریک گوڈ اُس کے سامنے ایستادہ تھا!

وہ ___ ڈول سی گئی۔

''ہائے۔'' اُس نے بمشکل کہا۔

یاور خان کے پُرکشش ہونٹوں پر مبہم سی مسکراہٹ ابھری۔ وہ بسا اوقات اُس کا سامنا نہ کر پاتی تھی۔

گرے بلو بہت خوبصورت آنکھیں۔ چہرے پر بکھر بکھر آتے بال، لمبا قد، سلم فگر اور ___ حسین پاؤں کی انگلی میں ایمرلڈز سے مزین پیارا سا نازک چھلا ___ اپنے مخصوص پرفیوم کی مدھرتا لئے ___ لجائی سی، پر بہت گریس فل!

آج اُسے پھر بابل اور نینوا کی شہزادیوں کا خیال آ گیا۔ بابل اور نینوا کی شہزادیاں ___ جن کے قیمتی ریشمی ملبوسات وادیٔ یمن کے عطر سے مہکتے تھے!

''you look gorgeous.'' وہ دھیرے سے بولا۔

شندی نے کچھ چونکتے ہوئے اُس کی طرف دیکھا۔

ایک بار پھر وہ ہولے سے مسکرایا۔ شندی کو اُس کا لب و لہجہ شاید بدلا سا لگا تھا۔

''تھینک یو''۔ اُس نے بہر حال شکریہ ادا کیا۔

یاور خان نے توجہ اپنی پلیٹ پر مرکوز کر لی۔

تبھی ابراہیم باربی کیوڈ چکن اُن کے پاس لے آیا۔ یاور خان نے کارنڈ سے ایک پیس شندی کی پلیٹ میں رکھا اور دوسرا اپنی پلیٹ میں لے لیا۔ ابراہیم کو شندی کی طرف زیادہ تگ ودو نہیں کرنا پڑی۔ ڈش لئے آگے بڑھ گیا۔

''چوکلیٹس اور مارزی پان ملے؟'' کھانا کھاتے اُس نے پوچھا۔

اُس نے آتے آتے اُس کی سب شوپنگ میوہ خان کے حوالے کر دی تھی۔

''جی۔مل گئے۔تھینکس''۔

چند پل وہ خاموشی سے کھانا کھاتا رہا۔

''تم___پورا آدھا گھنٹہ لیٹ آئی ہو''۔ یاور خان نے کہا۔

''اور آپ ... پورے بیس منٹ لیٹ آئے ہیں۔'' اُس نے اُسے کھڑکی میں سے یہاں آتے دیکھا تھا۔

اُس کا جاندار قہقہہ بلند ہوا۔

''تم بدلہ ضرور لیتی ہو''۔

وہ چپکے سے مسکرادی۔

''تم___بہت پیاری لگ رہی ہو۔'' اُس نے اُسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ بھی ... بہت ... ہینڈسم لگ رہے ہیں۔'' اُس نے بمشکل بات پوری کی۔کہ___

اُس کی آنکھوں میں کچھ تھا۔ کچھ کہانیاں سی، داستانیں سی ...

اُس کی لمبی خمیدہ پلکیں جھک گئیں۔

یاور خان کی دلنشیں آنکھوں کی شوخی سوا ہو گئی۔ پرکشش ہونٹوں پر کی شریر مسکراہٹ گہری ہو گئی۔



''تم___بہت پیاری ہو۔''

اور اب کے شندی چپ رہی۔ کہ وہ اُس بولتی آنکھوں کا سامنا بالکل نہیں کر پا رہی تھی۔

وہ دھیرے سے مسکرایا۔

''تم نے بدلہ نہیں لیا۔'' وہ ہولے سے بولا۔ بدلہ لینے کے لئے ہی تو اُس نے چال چلی تھی!

وہ خاموشی سے اپنی پلیٹ پر نظریں جمائے چمچ اِدھر سے اُدھر کر رہی تھی۔

''ہوں___بتاؤ نا۔''

''آپ کھانا نہیں کھائیں گے''۔ اُس نے سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے اُس کا دھیان کھانے کی طرف دلایا۔

ایک بار پھر وہ خوشگواری سے ہنسا۔

''میں تو کھا رہا ہوں۔تم چمچ سے کھیل رہی ہو''۔

اُسی لمحے یاور خان کا ہوسپٹل سے فون آ گیا۔ اور شندی نے نجات کی سانس لی۔

آج جانے کیا ہو گیا تھا اُسے؟ بدلی بدلی سے باتیں کر رہا تھا!

لذیذ کھانے کے بعد سب دوبارہ ڈائننگ روم میں آ گئے۔ وہیں مزیدار کشمیری چائے سرو ہوئی۔

چائے پینے کے بعد مہمان آہستہ آہستہ رخصت ہو گئے۔

شندی اور یاور خان کو آنٹی وانکل نے کچھ دیر وہیں بٹھائے رکھا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر یاور خان اُٹھ کھڑا ہوا۔

''آنٹی اب اجازت دیں۔میں نے بارہ بجے ہوسپٹل بھی جانا ہے۔''

''ہاں بیٹا۔جاؤ''۔

''شندی آؤ''۔ یاور خان نے اُسے ساتھ چلنے کو کہا۔

دونوں باہر نکل آئے۔ دونوں نے اوپر ہی جانا تھا۔ پہلے یاور خان اور پھر شندی کی جگہ تھی۔

اپنے گھر پر رکنے کی بجائے وہ شندی کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

''شندی''۔ وہ چلتے چلتے بولا۔

''جی''

''ایک بات کہوں''۔

''ہاں۔''

''بدلہ تو نہیں لو گی''۔

وہ بے اختیار ہنس دی۔

''لوں گی''۔

''پکی بات ہے؟''

''ہاں''۔

کھویا کھویا سا بڑا چاند چاروں اور مدھ بھری چاندنی بکھیر رہا تھا۔ ہر چیز بہت واضح نظر آ رہی تھی۔ شندی کی حسین آنکھیں بھی، یاور خان کی سحر جگاتی نظریں بھی!

اُس نے دھیرے سے اُس کا نازک ہاتھ تھاما۔ ہولے سے اپنے پرکشش ہونٹ اُس پر رکھے۔

''I love you.'' اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اُس نے آہستہ سے کہا۔

اُس نے دیکھا۔ شندی ساکت سی رہ گئی تھی۔

''بدلہ نہیں لو گی؟'' اُس کا ہاتھ تھامے وہ اب بھی اُس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔



''میں... میں...''

اور اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے وہ جلدی سے اپنے گھر کے دروازے میں گھس گئی۔

انوکھی سی لذت محسوس کرتا یاور خان واپس مڑا اور ــــ بڑے بڑے قدم اٹھاتا اپنے گھر کی طرف ہو لیا۔

رات کا ایک بج چکا تھا۔ شندی کی نیند تو یاور خان چُرا کر لے گیا تھا۔ کیا خاک کوشش کرتی سونے کی!

وہ جیسے آنکھیں بند کرتی تو اپنے بالکل قریب پاتی اور ــــ آنکھیں کھولتی تو وہ دور بہت دور نظر آتا۔ آج اُس نے کھلی ہی آنکھوں سے اُسے اپنے بہت نزدیک پایا تھا۔

'I love you.' اُس کے ہاتھ پر اپنے ہونٹ رکھتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں دیکھتے دیکھتے اُس نے آہستہ سے کہا تھا۔

اُس کی آنکھوں میں جادو تھا۔ وہ ساکت ہو کر رہ گئی تھی!

'بدلہ نہیں لو گی؟' وہ اب بھی اُس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

اُس کی جادو گھر آنکھیں باتیں کر رہی تھیں۔ قصے، کہانیاں!

اور ــــ وہ بدلہ کیسے لیتی؟

کتنا ہیر پھیر کر آن گھیرا تھا اُسے اُس نے!

اُس نے کروٹ بدلی۔ نظر گھڑی پر گئی۔ ڈیڑھ بج چکا تھا۔ نیند جانے کہاں غائب ہو گئی تھی؟ اوہ ــــ اُسے یاد آیا۔ وہ تو یاور خان ساتھ لے گیا تھا!

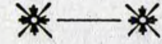
آنکھیں موندتے ہوئے اُس نے یاور خان کو پلکوں میں بند کر لیا۔

'سونے دیں نا پلیز!' اُس نے ریکویسٹ کی مگر...

آج تو جیسے وہ ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ قسم کھالی تھی جیسے نیند نہ لوٹانے کی

اُسے!

صبح کے تین بجے جا کر کہیں اُسے اُس پر ترس آیا۔ نیند واپس کی۔ اور دھیرے دھیرے اُس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔





آج ہوسپٹل میں بھی اُسے خمار سا تھا۔ بن پیئے جیسے پیئے ہوئے تھا۔ مدہوش سا، سرشار سا!

آپریشن ختم کر کے وہ سرجن لاؤنج میں آیا۔ نادیہ بھی ساتھ تھی۔ اپنے ساتھ ساتھ اُس نے اُس کے لئے بھی کوفی بنائی۔ دونوں کپس ہاتھوں میں لئے وہ کھڑکی کی طرف آیا۔ کپس میز پر رکھے۔ اور صوفے پر بیٹھ گیا۔

نادیہ نے دیکھا۔ اُس کی دلنشیں آنکھوں میں سرخ ڈورے بہت نمایاں ہو رہے تھے۔

''رات سوئے نہیں کیا؟'' اُس نے پوچھا۔

''نو۔۔۔ آن کال ہوں اِس ہفتے۔ رات بھی تقریباً جاگتے گزاری ہے۔

دوبارہ آیا ہوں ہوسپٹل۔'' اُس نے تھکی تھکی آنکھیں موندلیں۔

کچھ عرصہ قبل تک نادیہ کو اُس کا تمام ٹائم ٹیبل پتہ ہوتا تھا۔ آج کل دھیان انور کی طرف رہتا تھا شاید۔ بھول بھال گئی تھی غالباً!

یاور خان کی دلکش آنکھیں بند تھیں۔ پرکشش ہونٹوں پر مبہم سی مسکراہٹ تھی۔

''کچھ خوش خوش لگ رہے ہو۔ کیا بات ہے؟'' نادیہ بولی۔

وہ سیدھا ہو بیٹھا۔ نظریں اُس پر جمادیں۔

''میں واقعی بہت خوش ہوں۔'' وہ خوشگواری سے بولا۔

''وہی تو پوچھ رہی ہوں کیا بات ہے؟''

''محبت ہوگئی ہے کسی سے''۔ اُس نے کوفی کا کپ ہونٹوں سے لگالیا۔

نادیہ کچھ جز بزسی ہوئی۔ دل میں چور بھی تو تھا۔

''اچھا؟'' لہجے میں پھر بھی طنز تھا۔ ''اِس لئے کھنچے کھنچے رہتے ہو مجھ سے''۔

عجیب چیز تھی۔ انور کے ساتھ بھی پینگیں بڑھا رہی تھی۔ اُسے بھی کسی اور کے پاس جاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی تھی!

''تمہارے پاس تو بیٹھا ہوں۔ تمہارے سامنے تو ہوں''۔

''اس کے باوجود تمہاری وہ والی بات نہیں رہی''۔

اور ۔۔۔ اگر یہی بات وہ کہہ دیتا۔ تو لڑائی یقینی تھی!

اُس نے نادیہ کا کپ مزید اُس کے قریب کیا۔

''کوفی پیو۔ ٹھنڈی ہوجائے گی''۔ وہ مصالحت کے انداز میں بولا۔

اُس نے کپ اٹھایا۔ گھونٹ بھرا۔

''تم بات گول کر رہے ہو۔ جبکہ تمہاری آنکھیں بتا رہی ہیں۔ تم بہت خوش ہو۔''



''میں ۔۔۔ دراصل ۔۔۔ پی کر آیا ہوں''۔ اُس نے اپنا کپ میز پر رکھا۔

''چھوڑو نا۔ صبح صبح تو کوئی پی کر نہیں آتا''۔

''میں نے کب کہا صبح پی ہے۔ رات کو پی تھی''۔

''تو اب یہ کام بھی کرنے لگے ہو''۔

''گلاس سے نہیں ... آنکھوں سے پی ہے۔'' وہ بات چبا چبا کر مسکراتے مسکراتے کہہ رہا تھا۔ ''پتہ نہیں کیا چیز تھی آنکھوں میں کہ ... نظر ملاتے ہی پلادی...''

نادیہ کچھ کچھ سمجھ گئی۔ شندی کا بے پناہ حسن، جادو جگاتی آنکھیں اور ۔۔۔ یاور خان سے دو چار قدم پر قیام ۔۔۔ کچھ نہ کچھ تو ہونا ہی تھا!

''میں سمجھ گئی تم کس کی بات کر رہے ہو''۔

وہ گڑبڑایا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ شندی کا نام آئے۔ بات کر کے پچھتایا۔

''یار میں مذاق کر رہا تھا''۔

''چلو۔ مان لیتی ہوں کہ مذاق کر رہے تھے۔'' وہ کوفی پینے لگی۔ مگر مطمئن پھر بھی نہیں تھی۔

وہ دوسرا آپریشن کرنے آپریشن تھیٹر چلا۔ تو بات آئی گئی ہوگئی۔

شام کے نیم روشن دھندلکوں میں وہ گھر کی طرف رواں دواں تھا۔

شندی اِس وقت بھی اُس کے حواسوں پر چھائی تھی۔ وہ پہلے بھی لڑکیوں سے مل چکا تھا۔ ملکی بھی، غیر ملکی بھی مگر ۔۔۔

شندی میں جو بات تھی، وہ کسی اور میں نہیں دیکھی!

اُس کے مزاج میں شبنم کی مدھرتا تھی، اُس کی حیا میں پہلے پہر کی پاکیزگی تھی اور ۔۔۔ اُس کے سراپے میں پارسا شہزادیوں کا سا وقار تھا!

تبھی تو ۔۔۔ جو Longing اُسے شندی کے لئے ہو رہی تھی، جو انوکھی

سی چبھن، میٹھی سی کسک وہ اُس کے لئے محسوس کر رہا تھا۔ وہ اُس نے اس سے قبل کسی اور کے لئے محسوس نہیں کی تھی!

اور اب۔۔۔ اُسے ایک نئی فکر لاحق ہوگئی تھی!

امی کو کیسے بتائے گا؟ امی بہت محبت کرنے والی بے حد شفیق تھیں۔ مگر ساتھ ہی اپنی بات پر سختی سے قائم رہنے والی تھیں۔ اُنہیں ٹس سے مس نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اُسے اپنے آپ پر ترس سا آیا۔ بہت چاہتا تھا وہ شندی کو۔ کیا کرے گا؟

غیر اِرادی طور پر اُس کا ہاتھ اپنے سیل پر گیا۔ اور شندی کا نمبر ملا لیا۔

''اوہ... آپ ہیں''۔

اُس کی بے ترتیب ہوتی سانسیں اُس نے صاف محسوس کیں۔ مسکرا دیا، دھیرے سے۔

''کیسی ہو؟''

''فائین''۔

اُس نے اُس کی آنکھوں میں دیئے جلتے محسوس کئے۔ اُسے دیکھ کر اُس کی آنکھیں دیئے ہی تو جلاتی تھیں!

بے اختیار اُس کا جی چاہا۔ اُسے دیکھے۔ مگر کیسے؟ گھر سے باہر وہ اُسے یجا نہیں سکتا تھا۔ کہ اُسے دیکھنے جانے کا خطرہ تھا۔ گھر کے اندر؟ بغیر کسی وجہ کے وہ وہاں کبھی نہیں گیا تھا۔ پھر اُس کی ماما بھی تو تھیں اُدھر!

''شندی''۔

''جی''۔

''تم بیمار پڑ جاؤ نا''۔

''جی''۔



''پڑ جاؤ نا پلیز!''

وہ اب بھی نہیں سمجھی۔ خاموش رہی۔

وہ ہنس دیا۔ دلآویزی سے۔

''دیکھو تم بیمار پڑ جاؤ گی۔ تو ماما مجھے بلا لیں گی۔ اور اِس طرح میں تمہیں مل لوں گا''۔

''اوہ۔۔۔ آپ ویسے ہی آ جائیں۔'' اُس کا انداز شرمیلا شرمیلا سا تھا۔

''ویسے آ سکتا ہوں؟'' وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔

''جی''۔ وہ اُن لوگوں کا محسن بھی تو تھا۔ اُسے ہنسی بھی آئی۔ ایک مختارِ کُل قسم کی چیز آج اُس سے اجازت طلب کر رہی تھی!

''اچھا سنو۔ ماما سے کہو۔ ڈنر مت تیار کریں۔ میں ساتھ لیکر آؤں گا۔''

''جی''۔ وہ اتنا ہی بولی۔ کہ کم از کم آج وہ اُس سے زیادہ بحث نہیں کر سکتی تھی۔

''بائے''۔ یاور خان نے عجلت سے کہا۔ فون بند کیا اور۔۔۔

کسی ٹین ایجر لوور کی طرح گاڑی کا رخ واپس موڑتے ہوئے شہر کی طرف بھگانے لگا۔

اُسے پتہ تھا شندی کو K.F.C پسند تھا۔ پیزا ہٹ کی پیزا پسند تھی۔ وہ منگوایا کرتی تھی یہ سب شہر سے۔

وہ سیدھا وہیں گیا۔ دونوں جگہوں سے چیزیں لیں۔ بیکری سے چوکلیٹس اور مارزی پان لئے اور واپس اپنی بستی چلا آیا۔

ٹھیک نو بجے وہ اُس کے مین دروازے پر تھا۔

شندی نے ہی دروازہ کھولا کہ اُسے اُس کی Due respect ملنی چاہئے تھی!

''ہیلو میم۔'' وہ خوشگواری سے بولا۔

''ہائے''۔جھکی جھکی نظریں، خوبصورت چہرے پر لالی لئے وہ بمشکل بولی۔

چند پل کنفیوژن میں وہ وہیں کھڑی رہی۔

وہ دھیرے سے مسکرایا۔

''اندر لے جاؤ نا''۔

''اوہ۔آئیں پلیز! اُس نے جلدی سے کہا اور ــــ

اُسے راستہ دیتی اندر لاتے ہوئے اپنے خوبصورت کوزی، لونگ روم میں بٹھادیا۔خود بھی اُس کے مقابل صوفے پر بیٹھ گئی۔

تھوڑی دیر دونوں طرف خاموشی چھائی رہی۔

شندی سر جھکائے اپنے ناخنوں سے کھیل رہی تھی۔نظریں اُٹھا کر دیکھنے اور بات کرنے کی جیسے ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

اُسے ہنسی آ گئی۔شروع میں شندی کو اُس سے اپنی محبت کا احساس ہوا تھا۔تو محتاط ہو چلی تھی۔اب اُس نے اپنی چاہت کا اظہار کر دیا۔تو ــــ

وہ تو بالکل ہی چپ کر گئی تھی۔ساری کرّوفر جاتی رہی تھی!

اُٹھتے ہوئے وہ اُس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

''اپنے ناخنوں سے بہت کھیل لیا۔اب باتیں کرو میرے ساتھ''۔وہ اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بولا۔

اُس نے خاموشی سے نظریں اُٹھا کر اُسے دیکھا۔بولی اب بھی کچھ نہیں۔

''یار میں تو پچھتا رہا ہوں تمہیں بتا کر۔اچھی خاصی گپ شپ کرتی تھیں میرے ساتھ''۔وہ اب بھی اُس کا ہاتھ، ہاتھ میں لئے تھا۔''اچھا بتاؤ ماما کہاں ہیں؟''اِسی بہانے سہی وہ بات تو کر لیتی۔

''کچن میں ہیں۔کوفی بنا رہی ہیں۔''وہ بول ہی پڑی۔



''وہ ــــ تمہاری والی کوفی کی طرح؟''اُس نے اُس کی لائیٹ سی کوفی پر لطیف چوٹ کی۔

''نہیں... آپ کی والی کوفی کی طرح''۔

''گڈ۔اسی طرح اچھے اچھے کام کیا کرو...''

''کیا مطلب؟ وہ صرف آپ کے لئے بن رہی ہے۔میری والی اُسی طرح ہے''۔

''چلو۔تم باتیں تو کرنے لگی ہو''۔اُس نے اُس کا خوبصورت نازک ہاتھ اپنے ہونٹوں سے چھوا۔

وہ کانوں کی لوؤں تک سرخ ہو گئی۔ہاتھ واپس کھینچنا چاہا مگر اُس کی گرفت مضبوط تھی۔

''وہ... ماما دیکھ لیں گی۔''وہ سٹپٹائی سی لگ رہی تھی۔

''ماما سے میں ڈرتا ہوں؟''اُس نے دوبارہ اُس کے ہاتھ پر اپنے پرکشش ہونٹ رکھ دیئے۔

اُسی لمحے ماما ہاتھوں میں ٹرے لئے کچن کے دروازے سے نمودار ہوئیں۔

یاور خان نے فوراً اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔محتاط ہو کر بیٹھ گیا۔

''آپ ماما سے بالکل نہیں ڈرتے''۔شندی اپنی ہنسی بمشکل چھپاتی آہستہ سے بولی۔

یاور خان ہنس دیا۔دلآویزی سے۔

ماما آئیں۔یاور خان کو سلام کرتے ہوئے کوفی کے برتن دونوں کے آگے میز پر رکھے۔یاور خان کی خیر خیریت پوچھی۔اور خالی ٹرے لئے واپس چلی گئیں۔

شندی کی کوفی تیار تھی۔یاور خان کی بنانا تھی ابھی۔وہ اپنا کپ ایک

طرف کرتے ہوئے اُس کے لئے کوفی بنانے لگی۔

''تم اپنی کوفی پیئو۔ ٹھنڈی ہو جائے گی۔ میں بناتا ہوں اپنی''۔ وہ اُس کا کپ اُس کے آگے سرکاتے ہوئے بولا۔'' ویسے بھی تم میری کوفی بنانا نہیں جانتیں''۔

وہ محض چھیڑ رہا تھا اُسے۔ ورنہ وہ پہلے بھی اُس کے لئے کوفی بنا چکی تھی۔ اور وہ واقعی اچھی کوفی بناتی تھی۔

شندی بے اختیار ہنس دی۔

''کیوں؟ غلط کہا میں نے؟''

''نہیں۔ آپ غلط نہیں کہہ سکتے''۔ وہ اب بھی ہنس رہی تھی۔

''تمہیں پتہ ہے تمہاری ہنسی کیسی لگتی ہے؟'' وہ اپنے کپ میں چمچ چلاتے چلاتے بولا۔

''کیسی لگتی ہے؟''

''جیسے پریوں کے دیس میں گھنٹیاں بج رہی ہوں''۔ اُس نے کپ ہونٹوں سے لگالیا۔

وہ بھی کہنا چاہتی تھی کہ اُس کے بے تحاشا خوبصورت دانت، اُس کی جادوگر سمائیل اور اُس کے طلسم جگاتے قہقہے اُسے پہروں مسحور رکھتے تھے۔ مگر کہہ نہ سکی۔ خاموشی سے نظریں اپنی کوفی پر جمائے رکھیں۔

وہ بہت خوبصورت باتیں کرتا تھا۔ مختصر، خوشگوار، دلآویز!

وہ انجوائے کرتی رہی اُس کی باتوں کو۔ یاور خان من میں اُتارتا رہا اُس کی ہنسی کو۔ اور یوں ـــــ دونوں نے ہنستے بولتے اپنی اپنی کوفی ختم کی۔

حمید ڈنر کے بوکس لے آیا تھا۔ ماما نے وہیں لونگ میں ہی کھڑکی کے قریب کونے میں لگی خوبصورت میز پر گرم گرم کھانا چن دیا۔

''شندی بی بی۔ کھانا لگا دیا ہے۔'' ماما نے پاس آتے ہوئے اُسے



اطلاع دی

دونوں اُٹھتے ہوئے ڈائننگ ٹیبل پر آ گئے۔

یاور خان نے شندی کا سفید شفاف نیپکن کھولتے ہوئے اُس کے آگے بچھایا۔ پھر اپنا نیپکن اپنے آگے ڈال دیا۔

شندی نے پیزا سے ابتدا کی۔ تو یاور خان نے چکن پیس اپنی پلیٹ میں لے لیا۔

دونوں کھانا بھی کھا رہے تھے۔ باتیں بھی کر رہے تھے۔

تبھی ماما گاجر کا حلوہ لے آئیں۔ ماما نے خاص طور سے یاور خان کے لئے بنایا تھا۔

''آپ کو ماما کا بنایا ہوا گاجر کا حلوہ یقیناً پسند آئے گا۔'' شندی گلاس میں سے پیپسی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہنے لگی۔'' حویلی بھر میں ماما کے اِس حلوے کا چرچا تھا۔''

''اوہ۔ پھر تو ضرور کھاؤں گا۔ ویسے تم اور ماما آج میرا ویٹ بڑھانے پر تلی ہوئی ہو۔ تم نے پیزا کھلا دیا۔ ماما حلوہ کھلا دیں گی۔ اگلا پورا ہفتہ مجھے کسر نکالنی پڑے گی۔۔۔''

''آپ بہت خیال رکھتے میں اپنا۔'' شندی نے کہا۔

''بہت تو نہیں۔ لیکن رکھتا ہوں''۔ وہ تھوڑا سا حلوہ اپنی پلیٹ میں لیتے ہوئے بولا۔

''ڈیلیشس''۔ یاور خان نے کہا۔ ''تمہیں آتا ہے بنانا؟''

''نہیں''۔

''بہت مزے کا ہے''۔

''آپ کو اچھا لگتا ہے گاجر کا حلوہ؟''

''بہت اچھا لگتا ہے۔''

"میں ماما سے سیکھوں گی"۔

"میرے لئے بناؤ گی؟"

"اِسی لئے تو سیکھوں گی"۔

یاور خان کو اُس سے وہ بہت اچھی لگی۔ بحث نہ مباحثہ۔ بات سن لی، سمجھ لی اور مان لی ــــ اُسے لگا۔ صحرا کی تپتی ریت میں بھٹکتا وہ اچانک ٹھنڈے میٹھے جھرنے کے پاس آ گیا تھا!

"I love you Shandi." اُس نے اُس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

"I love you so much.

شندی پھر گنگ ہو کر رہ گئی۔ جواباً کچھ نہ کہہ سکی۔

"تم مجھے پہلے کیوں نہیں ملیں؟" وہ ایک بار پھر شرارت پر اُتر آیا۔

"میں یہیں تھی۔ آپ خود کہیں اور گھومتے پھر رہے تھے۔" اُس کے لہجے میں شکایتیں در آئیں۔

وہ سمجھ گیا اُس کا اشارہ نادیہ کی طرف تھا۔

"اب کہیں اور نہیں گھوموں گا پھروں گا۔" "تم مل گئی ہو نا۔ مجھے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہے"۔ اُس کے ہاتھ پر ہولے سے اپنے ہونٹ رکھتے ہوئے اُس نے کہا۔

حلوے کا آخری چمچ لیتے ہی اُس نے اپنی گھڑی پر نگاہ کی۔ گیارہ بجنے والے تھے۔

"اب چلنا چاہئے مجھے۔" وہ بولا۔ "آن کال ہوں اِن دنوں۔ کیا پتہ کس وقت کال آ جائے ہوسپٹل سے"۔

گو جانے کو اُس کا دل نہیں کر رہا تھا۔ مگر رات کے گیارہ بجنے کے بعد بھی ایک لڑکی کے پاس بیٹھے رہنا کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اِسی بات کا شندی کو بھی خیال تھا۔ ورنہ دل تو اُس کا بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ یوں ہی بیٹھا باتیں کرتا رہے



اور وہ بیٹھی سنتی رہے۔ بہر حال ــــ

دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"او کے میم"۔

آپ اِس دروازے سے چلے جائیں۔ یہ نزدیک پڑتا ہے۔ آپ کے گھر کو۔ اُس نے کوریڈور میں پچھلے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

وہ آگے بڑھا۔ شندی بھی دو قدم ساتھ چل کر رک گئی۔

"مجھے چھوڑنے باہر تک نہیں جاؤ گی۔" اُس نے اُسے ہاتھ سے تھاما۔

وہ خاموشی سے ساتھ چلی آئی۔

چاند آج بھی نور بکھیر رہا تھا، ڈھلان پر بکھرے چھوٹے چھوٹے گھروں میں روشنیاں ماند پڑ گئی تھیں اور ــــ ماحول ساکت ساکت سا لگ رہا تھا۔

وہ رک گیا۔ اُس کا ہاتھ اب بھی اُس کے ہاتھ میں تھا۔

"کتنا Bewitching ہے نا سب کچھ"۔ وہ اُس کی خوبصورت آنکھوں میں جھانکا۔

"ہاں۔" وہ بمشکل بولی۔

یاور خان نے اُس کے حسین چہرے پر بکھر آئے بال انگلی سے پیچھے ہٹائے۔ پھر دھیرے سے اُسے سینے سے لگایا، اور ہولے سے اپنے ہونٹ اُس کے خوبصورت ماتھے پر رکھ دیئے۔

"لیکن تم سے زیادہ Charm کہیں نہیں ہے"۔ وہ اُسے بے تحاشا پیار کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

شندی خود سپردگی لئے اُس کے مضبوط بازوؤں میں جکڑی رہی۔ وہ اپنی سانسوں میں مدغم ہوتی اُس کی گرم مہکتی سانسیں محسوس کر رہی تھی، اُس کے مخصوص پرفیوم کی اروما اُسے مدہوش کئے دے رہی تھی اور ــــ اُس کے وجود کا قرب اُسے دنیا سے بیگانہ کر رہا تھا!

یاور خان بے خود سا اُسے پیار کیے جا رہا تھا۔ کتنے ہی پل یوں ہی گذر گئے۔

پھر — شندی کو ہوش آیا۔ آہستہ سے اُس سے الگ ہوگئی۔ کہیں ماما دیکھ لیتیں تو؟

''کیا ہوا؟'' یاور خان کے لہجے میں اب بھی شرارت تھی۔ دلنشیں آنکھوں میں شوخی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

وہ اُس کی نظروں کا سامنا نہ کر سکی۔ گھنی سیاہ پلکوں نے خوبصورت آنکھوں پر چلمن گرا دی۔

''وہ... ماما... دیکھ لیں گی''۔

''اوہ— ظالم سماج''۔

''نہ چاہتے ہوئے بھی شندی کو ہنسی آ گئی۔

یہ سوبر اور اِمپوزنگ بندہ خوبصورت باتیں کرنا جانتا تھا!

''اچھا چلتا ہوں۔ یوں ہی تمہیں دیکھتا رہا تو کبھی نہیں جا پاؤں گا۔''

ایک بار پھر اُس نے اُس کے ہاتھ پر پیار کیا۔ ''گڈ نائیٹ''۔ اُس نے دھیرے سے کہا۔

''گڈ نائیٹ۔'' شندی بولی۔

اور — یاور خان بڑے بڑے ڈگ بھرتا اپنے گھر کی طرف بڑھنے لگا۔

چند ثانیے وہ وہیں کھڑی اُسے جاتے دیکھتی رہی۔ پھر اندر چلی آئی۔





آج ہفتہ تھا۔ اُس کا ایوننگ سیشن نہیں تھا۔ لنچ بریک ہوتے ہی وہ گھر کے لئے چل پڑا۔

پورے آکاش پر بوجھل گھٹاؤں کا قبضہ تھا۔ دبے پاؤں برف کے گالے پڑ رہے تھے اور — وقت سے پہلے ہی شام گھر آئی تھی۔

گاڑی کی ہیڈ لائٹس آن کئے وہ چکر دار سڑک پر نظریں جمائے احتیاط سے آگے بڑھ رہا تھا۔

آج پھر امی نے اپنے ملنے والوں کے ہاتھ اُسے پارسل بھیجا تھا۔ یہ لوگ یہیں کے رہنے والے تھے۔ کراچی میں بزنس کرتے تھے۔ کبھی کبھار اس طرف آنا ہوتا تو امی سے یاور خان کے لئے کسی پیغام وغیرہ کا ضرور پوچھتے۔ پچھلی

بار کی طرح آج بھی امی نے اُسے بہت ساری چیزیں بھجوائی تھیں۔ بے شک کہ یہ سب چیزیں یہاں بھی ملتی تھیں مگر ماں کا دل ___ بچہ کبھی اُس کی نظر میں بڑا ہوتا ہی نہیں!

وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔ اُسے بھی تو امی کے ہاتھ کی ہر چیز کی ہر وقت ضرورت ہوتی تھی۔ اُسے امی پر ڈھیر سارا پیار آیا۔ کتنا چاہتی تھیں وہ اُسے!

معاً اُسے شندی کا خیال آیا۔ کیا امی اُسے قبول کر لیں گی؟ کتنا ٹیڑھا سوال تھا؟

اُس نے سر جھٹکا۔ قیامت سے پہلے اپنے اوپر قیامت طاری کرنا عقلمندی نہیں تھی۔ اُسے شندی بہت اچھی لگتی تھی۔ اور وہ اُس کے پیار میں مگن رہنا چاہتا تھا۔ آنکھیں بند کر کے۔

کل شندی کا برتھ ڈے تھا۔ ’پاپا بہت شوق سے میری برتھ ڈے سیلبریٹ کیا کرتے تھے۔‘ ایک دفعہ اُس نے باتوں باتوں میں اُسے بتایا تھا۔

اُس پر پیار آنے کے ساتھ ساتھ اُسے دکھ بھی ہوا۔

گہری سانس لیتے ہوئے ___ اُس نے گیٹ پر ہلکا سا ہارن دیا۔

میوہ خان دوڑا چلا آیا۔ آج سبز ٹوپی کے ساتھ سرخ مفلر بھی لپیٹے تھا۔ گھٹنوں تک لمبا نیلا کوٹ، لونگ شوز، اور حسبِ معمول پاؤ پاؤ بھر سرمہ فی آنکھ بھی ڈالے تھا!

وہ آہستہ سے مسکرایا۔ اُس کا یہ ڈریس صرف بستی تک ہی محدود تھا۔ اُس کے ساتھ کہیں آنا جانا ہوتا یا ہوسپٹل کی ڈیوٹی کرنی ہوتی تو اُسے یاور خان کا مہیا کردہ یونیفارم پہننا پڑتا تھا۔ اُس نے اُس کے لئے خاص طور سے سیاہ پینٹ کوٹ اور شوز کا بندوبست کیا ہوا تھا۔

وہ سیدھا اپنے بیڈروم کی طرف گیا۔ میوہ خان گاڑی سے پارسل لیکر اُس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔



یاور خان نے ہاتھ منہ دھو کر کپڑے تبدیل کیئے۔ بیڈ روم میں آیا، صوفے پر بیٹھا، اور میز پر پڑا پارسل کھول لیا۔ امی نے اُس کے لئے گرم کپڑے، نائیٹ سوٹس اور ڈھیر سارا ڈرائے فروٹ بھیجا تھا۔ ساتھ میں حمید اور میوہ خان کے لئے بھی کپڑے تھے۔ میوہ خان کی بیوی کے لئے شادی کے گفٹ میں سرخ کامدار سوٹ، سچے طلے کی شال اور سونے کے جھمکے بھی تھے۔ میوہ خان امی کا بھی چہیتا تھا۔ وہ بھی امی کا دم بھرتا تھا۔ اُن سے ملنے کراچی بھی جا چکا تھا۔ اُن کا فون آتا۔ تو وہ بھی بات کیئے بنا نہ رہتا۔

حمید اُس کے لئے چائے لایا۔ تو اُس نے اُن دونوں کی چیزیں اُس کے حوالے کر دیں۔ پھر ٹی وی آن کی اور صوفے پر کہنی کے بل لیٹتے ہوئے گھونٹ گھونٹ کر کے چائے پینے لگا۔

محویت سے نیوز سن رہا تھا۔ کہ اچانک کپ ہاتھ میں لرزا اور چائے چھلک کر اُس کی قمیض پر آ رہی۔

اٹھتے ہوئے وہ ڈریسنگ روم میں آ گیا۔ الماری کھولی۔ اور اپنا نائیٹ سوٹ نکالنے لگا۔

ایک نکالا۔ پھر واپس رکھ دیا۔ اِس کی تو شرٹ کا بٹن ٹوٹ چکا تھا۔ دوسرا نکالا۔ اِس کی شرٹ کا بٹن بھی لوز تھا۔ پر کام چل سکتا تھا۔ وہ کچھ جھنجھلا سا بھی گیا۔ میوہ خان نے اب تک بٹنوں کا نوٹس نہیں لیا تھا۔ سارا وقت گپیں ہی مارتا رہتا تھا حمید کے ساتھ۔ آج اُس کی خبر لینی تھی اُس نے۔ مگر ___

بٹن تو ٹھیک کیا جا چکا تھا لیکن ___ عجیب الٹے سیدھے ٹانکے لگا کر اپنی جگہ فِکس کر لیا گیا تھا۔ یہ کس سے ٹھیک کروایا تھا میوہ خان نے؟ اُس نے پہلے والے نائیٹ سوٹ کی شرٹ بھی چیک کی۔ اُس میں بھی بٹن ٹانکا جا چکا تھا۔ بالکل اِسی سٹائل میں خیر ___

اُس نے کپڑے تبدیل کیئے، نائیٹ سوٹ کے اوپر ہاف لینتھ گرم

گاؤن لیا، کمرے میں آیا، کچن بیل کی، اور پھر سے صوفے پر بیٹھتے ہوئے ٹی وی دیکھنے لگا۔

''جلدی ہی میوہ خان آ گیا۔

''جی سر''۔ وہ ادب سے بولا۔

''یہ میز صاف کرو۔ چائے گری ہے۔ اور ڈریسنگ روم سے میرے کپڑے بھی لو۔ قمیض پر بھی چائے گری ہے۔'' وہ ٹی وی پر نظریں جمائے جمائے بولا۔

میوہ خان نے ڈریسنگ روم سے اُس کے کپڑے اٹھائے۔ نیچے گیا اور کچن سے چھوٹا تولیہ لا کر میز صاف کرنے لگا۔

''میوہ خان۔ میری شرٹس کے بٹن کس سے لگوائے ہیں تم نے؟'' یاور خان نے سنجیدگی سے پوچھا۔ کہ میوہ خان کو اُس کے بٹن خود اُسی صفائی سے ٹانکنے چاہئے تھے۔ جیسے وہ ہمیشہ سے کرتا آیا تھا۔

''صاحِب''۔ اُس کا کام کرتا ہاتھ رک گیا۔ ''میں نے تو نہیں لگائے، آج لگانے تھے لیکن... '' اپنی کوتاہی پر وہ سخت نادم لگ رہا تھا۔

یاور خان کو کچھ حیرت سی ہوئی۔

''پھر کس نے لگائے ہیں؟''

''پتہ نہیں صاحِب''۔ وہ کچھ گھبرا سا بھی گیا۔

''تم گھر لیکر گئے تھے قمیض؟'' مبادا اُس کی بیوی کا کارنامہ ہو یہ!

''نہیں صاحِب''۔

اُسے حیرت کے ساتھ تجسس ہونے لگی۔ یہ کام حمید کا بھی نہیں تھا۔ پھر؟

''کوئی آیا تھا میرے کمرے میں؟''

''نن... نہیں صاحِب۔'' میوہ خان ہکلایا۔

کچھ تھا۔ جس کا میوہ خان کو پتہ تھا۔ اور جو وہ چھپائے نہیں چھپا پا رہا تھا!



''میں سمجھ گیا...''

''لیکن صاحِب۔ میں نے نہیں بتایا آپ کو۔'' اُس کی بات کاٹتے ہوئے وہ مزید گھبراہٹ سے بولا۔

اوہ— تو وہ اُس بندے سے گھبراتا بھی تھا۔ جس نے یہ کام کیا تھا!

''تم نے نہیں بتایا مجھے۔ میں خود سمجھ گیا ہوں۔ اب نام بھی بتا دو۔'' اُس نے بات تقریباً اگلوالی تھی۔

''صاحِب۔ وہ... شاندانہ بی بی آئی تھیں۔ آپ کے نائیٹ سوٹوں میں بٹن بھی لگائے۔ استری بھی کیے۔ اور الماری اور کمرہ بھی ٹھیک کیا۔ میں نے بہت منع کیا۔ مگر وہ نہیں مانیں۔ پھر کہا کہ میں آپ کو اُن کے یہاں آنے کا نہ بتاؤں...''

وہ حیرت سے سب سن رہا تھا۔ بولا کچھ نہیں۔ دھیان ایک بار پھر ٹی وی پر لگا دیا۔

میوہ خان میز صاف کر کے چلا گیا۔

یاور خان نے ایک نظر اپنی شرٹ کے بٹن پر ڈالی۔ بے اختیار اُس کا فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا۔ پھر نائیٹ سوٹ کی استری پر نگاہ کی۔ جس کی طرف اُس کا پہلے دھیان نہیں گیا تھا۔ اُس کا حال بھی بٹنوں جیسا ہی تھا۔

اچانک اُسے شندی پر بے طرح پیار آیا۔ گاؤن اتارتے ہوئے گرم لائننگ والا رین کوٹ پہنا۔ اور تیزی سے پڑتی برف میں شندی کے دروازے پر جا پہنچا۔

اُس نے سوچ لیا تھا۔ شندی دروازے پر آ گئی تو ٹھیک۔ ورنہ ماما سے وہ کوئی بہانہ کر دے گا۔

بیل بجنے کے تھوڑی ہی دیر بعد ماما نے دروازہ کھول دیا۔

''وہ— شندی نے بتایا تھا اُس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' اُس نے

خالص جھوٹ بولا۔

اُسے اپنے آپ پر حیرت بھی ہو رہی تھی۔ اچھا خاصا Confident بندہ تھا۔ شندی کے پیار میں کنفیوزڈ ہوا جا رہا تھا۔

''اندر آئیں بیٹا۔ برف میں کھڑے ہیں۔'' ماما نے فوراً اُسے اندر آنے کو کہا۔

وہ اندر چلا آیا۔ ماما اُسے شندی کے بیڈ روم تک لائیں۔

''اپنے کمرے میں ہیں۔ آپ چلے جائیں۔'' ماما نے کہا۔ اور ـــ خود دوبارہ کچن میں چلی گئیں۔

یاور خان نے ہولے سے شندی کے دروازے پر دستک دی۔

''آ جائیں''۔ اُس کی مہین دلکش آواز ابھری۔

اور ـــ یاور خان اندر چلا آیا۔

شندی کارنس سے ٹکی جانے کن سوچوں میں گم تھی؟ اتنی برفباری میں اُسے اپنے بیڈ روم میں دیکھ کر حیران سی بھی ہوئی۔ آنکھوں میں قندیلیں بھی جل اٹھیں۔

''آپ...؟''

وہ پاس چلا آیا۔ چپ چاپ اُسے بازوؤں میں بھر لیا۔ سینے سے جکڑ لیا۔

''تمہیں اچھا نہیں لگا میرا آنا، ہوں''۔ وہ اُسے پیار کرتے کرتے کہہ رہا تھا۔

آج پھر اُس کی گرم مہکتی سانسیں اُس کی سانسوں میں مدغم ہونے لگیں، اُس کے مخصوص پرفیوم کی خوشبو اُس کے حواسوں پر چھانے لگی، اُس کے مقناطیسی سراپے کا لمس اُس کی روح میں سرایت کرنے لگا!

چند پل یوں ہی بے خودی میں گزر گئے۔ پھر ـــ یاور خان کو ہی ہوش



آیا۔ ماما آ جاتیں تو؟

اُس نے آہستہ سے اُسے چھوڑ دیا۔ جھکی جھکی نظریں، بھیگے بھیگے ہونٹ لئے وہ وہیں کھڑی رہی۔

''آج ایک چور آیا تھا میرے کمرے میں''۔ وہ اُس کی جھکی جھکی آنکھوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔

شندی سمجھی نہیں۔ نظریں اُٹھا کر اُسے دیکھنے لگی۔

''دیکھو'' اُس نے اپنی شرٹ کا بٹن اُسے دکھایا۔ ''میرا بٹن بھی لگا گیا...''

اوہ ـــ اُس نے فوراً اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔

''میں نے نہیں لگایا۔'' وہ صاف مکر گئی۔

اُس نے اُس کے ہاتھ ہٹا دیئے۔ اُسے پھر سینے سے لگا لیا۔

''وہ جس طرح سے لگا ہے نا بچارا۔ اُس کا حال بتا رہا ہے۔ کہ اُسے شاندانہ میم صاحب نے لگایا ہے۔''

''نہیں لگایا میں نے''۔ اُس نے پھر دہرایا۔

اُس نے پھر اُسے پیار کیا۔

''ہائے داوے۔ اِس یُونیک طریقے سے تم نے ٹانکے لگائے کیسے؟''

اُس نے پھر اُسے چھیڑا۔

''میں نہیں بولتی آپ سے۔'' روٹھے روٹھے لہجے میں کہتی وہ اُس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کرنے لگی۔

یاور خان نے اُسے مضبوطی سے بھینچ لیا۔ بار بار پیار کرنے لگا۔

''تم میرے آپریشن تھیٹر میں آ جاؤ۔ سٹچز لگانے کی باری آئے گی تو تم سٹچز لگا دیا کرو گی''۔ وہ باز نہیں آ رہا تھا۔

''چھوڑیں مجھے''۔ وہ پھر Struggle کرنے لگی۔

اُس نے ایک پیار اُسے زبردستی دیا۔ اور چھوڑ دیا۔

وہ بالکنی کے رخ جاتی اپنے بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گئی۔

''چلو آؤ۔ لِونگ روم میں بیٹھتے ہیں''۔ پاس آتے ہوئے وہ مصالحت آمیز لہجے میں بولا۔

''نہیں۔ میں بات نہیں کروں گی آپ سے''۔ وہ پھولے پھولے منہ کے ساتھ بولی۔

اُس سے وہ اُسے بہت اُڈوریبل لگی۔

''میں تو مذاق کر رہا تھا۔ مجھے تمہارا بٹن لگانا اچھا لگا تھا۔ بہت زیادہ۔ تمہیں تھینکس کہنے ہی تو میں اتنی برفباری میں آ گیا تھا...''

نظریں اٹھا کر وہ اُسے دیکھنے لگی۔ ناراضگی معدوم ہونے لگی۔

''میں تو اپنی اور قمیضوں کے بھی بٹن توڑنے والا ہوں...''

اور۔۔۔ اُسے لگا وہ اب بھی اُس کا مذاق اُڑا رہا تھا۔ مزید برداشت نہ کر سکی۔ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''کبھی نہیں بولوں گی آپ سے۔'' اُس نے وہاں سے جانے کو قدم بڑھائے۔

''I'm serious. I swear, I'm not joking اور بھی بٹن لگا دو میری قمیضوں میں۔ یہ بھی بہت پیارا لگا ہے''۔ اُس نے اپنی قمیض کے بٹن کو اپنے ہونٹوں سے چھو لیا۔ ''میں ہوسپٹل پہن کر جایا کروں گا۔''

وہ ہولے سے مسکرا دی۔ یاور خان کو لگا، چاند بادلوں سے جھانکا تھا!

''بولو گی نا اب''۔

اُس کی دلنشیں آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اُس نے سر دھیرے سے نفی میں ہلا دیا۔

''بولو نا۔ پلیز!''

اُس نے اب بھی سر کو نفی میں جنبش دی۔ اُس نے تھوڑا اُس کے بٹن



لگانے کا مذاق اڑایا تھا؟ کچھ تو بدلہ اُس نے بھی لینا تھا!

''پلیز!'' اُس نے دوبارہ کہا۔

وہ اب بھی چپ چاپ اُس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

اُس کی واپلکوں میں جھوٹا غصہ تھا۔ جھکی پلکوں میں بے تحاشا پیار تھا!

اُس کی ہر ادا نرالی تھی۔ وہ محظوظ ہوئے بنا نہ رہ سکا۔

پھر۔۔۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

''اب؟'' اُس کی جادوگر آنکھیں شندی پر جمی تھیں۔

یہ چٹان جیسی چیز پیار کرنے کے سب انداز جانتا تھا!

شندی نے اُس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔ محبت سے اپنا گال اُن پر رکھا۔ اور چپکے سے اُس کے دونوں ہاتھوں پر پیار کر لیا۔

''ایک یہاں بھی''۔ یاور خان نے اپنا گال آگے کر دیا۔

شندی نے ہولے سے اپنے کومل ہونٹ وہاں رکھ دیئے۔

اور۔۔۔ یاور خان بے خود سا ہو گیا۔ ایک بار پھر اُسے اپنے مضبوط بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔ دیوانہ وار پیار کرنے لگا۔

چند لمحے پھر بے خودی کی نذر ہو گئے۔

''آؤ لِونگ میں بیٹھتے ہیں۔ ورنہ تمہاری باڈی گارڈ مجھے آئندہ اندر گھسنے نہیں دیں گی۔''

دونوں لِونگ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔

ماما دونوں کے لئے کوفی اور چیز سینڈوچز لے آئیں۔ برتن میز پر لگانے لگیں۔

''شندی بیٹا۔ تم نے بتایا ہی نہیں کہ تمہاری طبیعت خراب ہے۔'' اُس کا کپ اُس کے آگے رکھتے رکھتے ماما گویا ہوئیں۔

شندی پل بھر کو کچھ کنفیوزڈ سی نظر آنے لگی۔ نظریں یاور خان کی طرف

اُٹھیں۔ اس نے فوراً ایک دلکش وِنک دی۔

اوہ۔۔۔ وہ سمجھ گئی۔ ماما سے اُسی نے کہا تھا۔ وہ بھی بالکل صاف جھوٹ!

''جی ماما۔ گلے میں درد ہو رہا تھا۔ سر میں بھی ...'' اور وہ کیا کہتی؟

''ڈاکٹر صاحب کی دوا بھی لینا۔ سوتے وقت جوشاندہ بھی دوں گی۔''

''تھینک یو ماما''۔

اور ماما کچن کی طرف چلدیں۔

''میں تمہارے پیار میں کیا کیا نہ بنا''۔ مسکین سی شکل لئے وہ اپنے لئے کوفی بنا رہا تھا۔

قبل اِس کے کہ وہ کچھ کہتی۔ اُس نے خود ہی کہہ دیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ بے اختیار ہنس دی۔

دونوں دلچسپ باتوں کے دوران کوفی پیتے رہے۔ باتوں کا رخ چلتے چلتے ہوسپٹل اور ہوسپٹل کی ڈیوٹیز پر آ ٹکا۔

''کل سنڈے ہے۔ آج کوئی آپریشن بھی نہیں کیا۔ سو مریض کی بھی فکر نہیں ہے۔ خوب سوؤں گا... اگر تم سونے دو تو۔'' ہیر پھیر کر اُس نے اُس کے لئے کچھ نہ کچھ کہنا ہی تھا۔ یہ طے تھا!

''میں نے کیا کیا ہے؟''۔

''میری نیندیں اُڑائی ہوئی ہیں''

''نیندیں آپ کے پیشنٹس نے اُڑائی ہوئی ہیں''۔

''اُن کی مجال ہے میری نیند اُڑائیں''۔

''بائے داوے۔ آپ کی ڈاکٹر نادیہ کا کیا حال ہے؟'' اُسے اچانک خیال آیا۔

اور۔۔۔ یاور خان کا خوشگوار قہقہہ بلند ہوا۔

''مجھے پتہ تھا ایک دن تم ضرور پوچھو گی''۔



اُسے نادیہ کے ذکر پر اُس کی ہنسی اچھی نہیں لگی۔

''نہیں۔ وہ میرے لئے اتنی امپارٹنٹ نہیں ہے''۔

وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔ وہ نادیہ سے جیلس لگ رہی تھی!

''ہوں''۔ اُس نے کوفی کا آخری گھونٹ لیا۔ اور خالی کپ میز پر رکھ دیا۔

وہ چند پل منتظر رہی۔ مگر اُس نے ٹانگیں سیدھی پھیلائے ہوئے خاموشی سے سر صوفے کی پشت سے ٹکا دیا تھا۔

آپ نے اُسے ہوسپٹل میں ہی دیکھا تھا پہلی بار؟'' اُس نے پھر پوچھا۔

وہ اب بھی چپ تھا۔ سامنے خلاؤں میں دیکھ رہا تھا۔

''اچھا یہ بتائیں۔ پہل کس نے کی تھی؟''

اُس کے ہونٹوں پر مبہم سی مسکراہٹ تھی اور بس!

''I,m sure پہل اُس نے کی ہوگی''۔ وہ خود ہی بولی۔

اُس کی curiosity پر اُس کی مسکراہٹ قدرے گہری ہوگئی۔

''اور پھر آپ... بھی پیچھے پڑ گئے ہوں گے...''

وہ سیدھا ہو بیٹھا۔

''میں اُس کے پیچھے بالکل نہیں پڑا۔'' اُس نے ''پیچھے'' پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''بس۔۔۔ دوستی کا جواب دوستی سے دیا تھا...''

''دوستی یا...؟''

ایک بار پھر وہ خوشگواری سے ہنس دیا۔ وہ چھوڑنے والی نہیں تھی۔ اُس کی تسلی کرنا ہی تھی اُسے!

''یار۔۔۔ میں ایک غریب بندہ ہوں خدا کا...''

اُس کی شکل اچانک اتنی مسکین ہوگئی تھی۔ اور لب و لہجہ اتنا لاچار کہ نہ

چاہتے ہوئے بھی اُسے ہنسی آ گئی۔

''اتنے مسکین مت بنیں۔ آپ پوری چیز ہیں''۔

ایک بار اور اُس کا جاندار قہقہہ بلند ہوا۔

''میں یہ نہیں کہتا کہ میں بہت اچھا آدمی ہوں۔ اور تم سے پہلے کبھی کسی اور لڑکی سے دوستی نہیں کی۔'' وہ سنجیدہ ہو گیا۔ ''نو ___ بلکہ ___ مجھے ایک دو لڑکیوں سے اٹیچمنٹ بھی ہوئی تھی مگر...

''اُن میں سے ایک ڈاکٹر نادیہ ہو گی۔'' اب وہ بھی خوشگوار موڈ میں تھی۔

''اوہ''۔ اُس نے شرارت سے اپنی کنپٹی سہلائی۔ ''یہ تو مجھے یاد ہی نہیں رہی...''

''مطلب یہ کہ یہ اُن دو کے علاوہ تھی؟'' اُسے ہنسی آ گئی۔

''یس''۔

''آپ... پکے فلرٹ ہیں۔''

''نہیں نہیں۔ میں فلرٹ نہیں ہوں''۔ اُس کی شکل پھر سے مسکین ہو گئی۔

''پھر کیا ہیں؟'' وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

''صرف ایک کمزور بندۂ خدا''۔ عاجزی انتہا کو پہنچ گئی۔ ''اب دیکھو نا ___ ایک لڑکی تھوڑے سے کپڑے پہن کر، بہت سارا میک اَپ کر کے، فرانس کی پوری پرفیومری میں غوطہ لگا کر، کلوپیٹرا کے طمطراق کو مات دیتی سامنے آ جائے۔ تو میں تو... ایک مسکین بندہ ہی ہوں نا... ڈگمگا گیا تو کیا عجیب بات ہو گئی۔ شکر کرو۔ الٹا نہیں گرا...''

یہ یاور علی خان کہہ رہا تھا۔ عام حالات میں جو بہت جاہ و جلال والا تھا، دبدبے سے جس کے آس پاس کی فضا بھی مرعوب ہو جاتی تھی اور ___ جان جاتی تھی جس سے اپنے سٹاف کی!



وہ ہنستی چلی گئی۔

''یہ کون تھی؟'' ہنسی قدرے تھمی تو اُس نے پوچھا۔

''تمہاری ڈاکٹر نادیہ''۔

''میری ڈاکٹر نادیہ''۔

جواب میں اُس کی جاندار ہنسی گونجی۔

پھر ___ میں نے تمہیں دیکھا، پہلی بار تمہاری حویلی میں ___ کھیتوں کی طرف جاتے۔ بے حد سادگی میں بھی تم بہت اچھی لگ رہی تھیں، باوقار سی۔ اُس کے بعد تمہیں ہوسپٹل میں، یہاں اینکسی میں، بار بار دیکھا۔ بابا کے دوست کی بیٹی ہونے کے ناطے تو تم مجھے اچھی لگتی ہی تھیں مگر ___ جلدی ہی میں نے محسوس کیا ___ تم میرے حواسوں پر چھانے لگی تھیں۔ اور ___ اِس سے پہلے ___ میرے حواسوں پر کسی نے حکومت نہیں کی۔ "No body could govern me like this.
And I suppose this is colled love ..."

وہ اب بھی مسکرا دی۔

''اور... ڈاکٹر نادیہ سے...؟''

''میں نے کہا نا۔ اتنی سٹرونگ feelings میری پہلے کبھی کسی کے لئے ڈیویلپ نہیں ہوئیں۔ اتنی کہ ___ مجھے ڈر لگنے لگے کہ...''

وہ چپ چاپ اُسے تکتی رہی۔ بولی کچھ نہیں۔

''اچھا چلتا ہوں اب''۔ اُس نے گھڑی پر نگاہ کی۔ ''کافی دیر ہو گئی ہے۔ تم اِن Bewitching آنکھوں سے دیکھتی رہو گی نا۔'' اُس نے باری باری اُس کی دونوں آنکھوں پر پیار کیا۔ ''تو میں سچ مچ نہیں جا پاؤں گا۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ بھی کھڑی ہو گئی۔

''تمہاری آنکھیں اتنی خوبصورت کیوں ہیں، ہاں؟'' وہ اب بھی اُس

کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

''اپنی آنکھوں کا پتہ ہے؟'' وہ بھی اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے تھی۔

''نہیں''۔ اُس نے نفی میں سر ہلایا۔

''میگنیٹک ہیں۔ مسمرائیز ڈ رہتی ہوں میں...''

''Really?'' اُس نے اچانک پٹڑی بدلی۔ بغور اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔

بے شمار داستانیں تھیں اُس کی آنکھوں میں۔ اَن گنت افسانے تھے!

ساتھ میں شرارت تھی، شوخی بھی!

کوشش کے باوجود وہ سہار نہ سکی۔ جھالریں پلکیں لڑکھڑا کر گر گئیں۔

وہ محظوظ ہوا۔ بہت زیادہ۔

''اچھا۔۔۔ شب بخیر۔'' اُس نے اُسے وہیں لِونگ میں چھوڑا، اور بڑے بڑے قدم اٹھاتا پچھلے دروازے کی طرف بڑھا۔

برفباری تھم گئی تھی۔ آسمان کھلنا شروع ہو گیا تھا۔ سردی مزید بڑھ گئی تھی۔

کھانے کے بعد حسب معمول ماما اپنی چائے لئے شندی کے پاؤں کی طرف آ کر بیٹھ گئیں۔

شندی اُن سے باتیں کرنے لگی۔ اُس کی آواز میں خوشی کی چہکار تھی، آنکھوں میں سرور کی چمک اور چہرے پر لالی کی دمک تھی!

ماما بہت کچھ سمجھ رہی تھیں۔ اور جانے کیوں؟ اُس کی خوشی میں خوش بھی تھیں۔ یاور خان اچھا انسان تھا۔ آڑے وقت میں اُن کے کام آیا تھا۔ اچھے دل کا اچھا ذہن کا مالک تھا۔



گپ شپ کرنے کے بعد ماما اپنے کمرے میں چلدیں۔ اور شندی لائیٹ آف کرتے ہوئے نرم گرم بستر میں گھس گئی۔ آنکھیں موند کر سونے کی کوشش کرنے لگی مگر۔۔۔

''اتنی سٹرونگ feelings میری پہلے کبھی کسی کے لئے ڈیویلپ نہیں ہوئیں۔ اتنی کہ۔۔۔ مجھے ڈر لگنے لگے کہ...''

اُس کی بات اُس کے کانوں میں گونجی۔ پتہ نہیں کیا کہنا چاہتا تھا وہ آگے؟

اُس نے سونے کی کوشش ہی چھوڑ دی۔ اطمینان سے اُس کی دلچسپ خوبصورت باتوں کی بازگشت میں کھوگئی۔

معاً اُس کا سیل فون بج اُٹھا۔ بارہ بج رہے تھے۔ کس کا ہوسکتا تھا؟

''ہپی برتھ ڈے''۔ یاور خان تھا۔ ''جلدی سے بالکنی میں آؤ۔ اور اپنا گفٹ لو۔''

وہ بہت نیچی آواز میں بات کر رہا تھا۔ شاید آس پاس کا خیال تھا!

وہ اُٹھی۔ لیمپ آن کئے بغیر ہی صوفے کی پشت پر سے شال اٹھا کر نائیٹ سوٹ کے اوپر لپیٹی اور۔۔۔ بنا کوئی کھٹکا کئے بولٹ کھولتے ہوئے آہستہ سے بالکنی میں نکل آئی۔

بالکنی ڈھلان کے لیول پر ہی تھی۔ یاور خان ریلنگ پر سے قدم بڑھاتا اندر آ گیا۔

بغیر کسی تمہید کے اُس کا ہاتھ تھاما۔ اور کوٹ کی جیب سے ڈائمنڈز سے مزّین بیش قیمت بریسلٹ نکالتے ہوئے اُس کی نازک کلائی میں پہنا دیا۔

شندی نے شکریہ کے لئے لب کھولنا چاہے۔ مگر اُس نے اِشارے سے چپ کرا دیا۔ کہیں ماما جاگ جاتیں تو؟

شندی نے دھیرے سے اپنے ہونٹ اُس کے گال پر رکھ دیئے۔

وہ بے خود سا ہو گیا۔ بدلے میں اُسے ڈھیر سارا پیار کر لیا۔

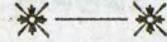
اور ـــ بالکل آہستگی سے نیچے اترتے ہوئے اپنے گھر کی راہ ہو لیا۔

واہ ـــ کیا انداز تھا۔ برتھ ڈے وِش کرنے کا؟

چوری چوری آیا۔ گریٹ کیا۔ اور چلدیا!

مدہوش سی وہ اندر آ گئی۔ بستر میں گھستے ہوئے لیمپ آن کیا۔ ایک نظر اپنی کلائی پر ڈالی۔ وہاں گولڈ اور وائیٹ گولڈ میں جڑے ہیروں کا بے حد خوبصورت بریسلٹ جھلملا رہا تھا۔ اُس نے ہولے سے اپنے ہونٹ اُس پر رکھے اور ـــ

لیمپ آف کرتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔





آج پھر نادیہ نے اُس سے لفٹ لی تھی۔ اُس کا گھریلو ڈرائیور کسی کام سے شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ سو اُس نے یاور خان کو اُسے گھر ڈراپ کرنے کو کہا تھا۔

دونوں باتیں کرتے گھر کی طرف چلے جا رہے تھے۔

گو دونوں کا تعلق اب صرف کبھی کبھار باتوں تک ہی رہ گیا تھا۔ مگر نادیہ پھر بھی کوئی نہ کوئی Hint دے جاتی۔ اپنی محبت کی، اُس کی بے رخی کی اور ـــ انور صاحب کی دولت کے ریل پیل کی!

یاور خان نے البتہ کبھی اُس سے کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا۔ نہ یہ کہ وہ انور سے اُس کی ملاقاتوں سے واقف تھا، نہ یہ کہ اب وہ اُسے آپریشن تھیٹر کے علاوہ

کہیں نظر نہیں آتی تھی۔ بلکہ ۔۔۔ وہ تو خاصا مطمئن محسوس کر رہا تھا۔ پُرسکون، پرامن!

پھر اب تو وہ شندی کی معصوم محبت سے بے وفائی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

اُسے گھر پر چھوڑتے ہوئے وہ واپس مڑا۔ اور چکردار سڑک پر احتیاط سے چلتا آگے بڑھنے لگا۔

شام گِھر آئی تھی، پرندے اپنے آشیانوں کی طرف چل پڑے تھے اور ۔۔۔ سردی سوا ہوگئی تھی۔

گاڑی بستی کی طرف موڑتے ہوئے وہ دھیرے دھیرے اوپر جانے لگا۔

دائیں جانب والا موڑ کاٹتے ہوئے وہ پیچھے گیا۔ تو منظر یکسر بدل گیا۔ ڈھلان پر بکھرے گھروندوں میں سے شام کی پکوان کے دھوئیں اُٹھ رہے تھے، بیدِ مجنوں کی زمین بوس شاخوں پر بنائے گھونسلوں میں پنچھی آ آ کر بیٹھ رہے تھے اور ۔۔۔ نور محمد کا دس سالہ بیٹا اپنی بھیڑ بکریاں ہانکتا گھر کی طرف رواں دواں تھا!

روح پرور منظر کو من میں اتارتے اتارتے اُس نے اوپر نگاہ کی۔ شندی کی بالکنی خالی تھی وہ اکثر اُسے اِس وقت یہاں نظر آتی تھی۔ کبھی کوئی کتاب پڑھتے ہوئے، کبھی سنیک کھاتے ہوئے۔ شاید مصروف تھی اندر۔

آخری موڑ کاٹتے ہوئے وہ ایک بار پھر سامنے آ گیا۔

تبھی ۔۔۔ اُس کی نظر بائیں جانب شندی کے گھر کے پچھلے دروازے پر پڑی۔ بالکل وہیں جہاں چند روز قبل رات کو وہ اور شندی کھڑے تھے، اِس وقت شندی کے پاس ابراہیم کھڑا تھا۔ سٹیئرنگ وہیل پر اُس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی، کنپٹیاں سلگ سی اُٹھیں۔

چند روز پہلے اُن کے یہاں ڈنر پر بھی وہ شندی کے بہت آگے پیچھے ہو



رہا تھا۔ مگر اب ۔۔۔ اب تو گھر جا پہنچا تھا۔ وہ بھی جب شام گہری ہو رہی تھی!

غصہ سے بھناتا، آگے بڑھتا، وہ اپنے گیٹ میں داخل ہو گیا۔

سیدھا اپنے بیڈروم میں گیا۔ شندی کو فون کرنے ہاتھ فون کی طرف گیا۔ مگر پھر ۔۔۔ جیسے کچھ خیال آ گیا، اِرادہ بدل دیا۔

واش روم گیا۔ گرم پانی کا شاور لیا۔ تو طبیعت قدرے بشاش ہو گئی۔ نرم و گرم کپڑے پہنے اور آتش دان میں جلتی لکڑیوں کی آگ کے قریب صوفے پر بیٹھ کر ٹی وی آن کرتے ہوئے کوفی کا انتظار کرنے لگا۔

تھوڑی دیر وہ مختلف چینلز چیک کرتا رہا۔ پھر ۔۔۔ ایک لگا ہی لیا۔ کچھ بے چین سا تھا، بے کل سا۔

پھر ۔۔۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ۔۔۔ اُس نے اپنا سیل اٹھایا اور شندی کا نمبر ملا لیا۔

"Shandi here." اُس کی آواز اُس کے کانوں میں رس گھول گئی۔

"کیسی ہو؟"

"بالکل ٹھیک"۔

"ابراہیم کیا کر رہا تھا تمہارے پاس؟" وہ بلا تمہید بولا۔ اُس کے ٹھہرے ہوئے لہجے میں دھاڑ سی تھی۔

شندی سہم سی گئی۔ تو اُس نے اُسے دیکھ لیا تھا!

"آنٹی سے میں نے کچھ کپڑے منگوائے تھے۔ وہ دینے آیا تھا۔" گارمنٹس، شوز وغیرہ کی جتنی بھی شوپنگ ہوتی تھی وہ آنٹی سے ہی کرواتی تھی۔

"اُن کے نوکر کیا مر گئے تھے سب"۔

یہی تو اُس نے ابراہیم سے کہا تھا۔ کہ وہ کسی نوکر کے ہاتھ بھجوا دیتا۔

"میں نے سوچا اتنی خوبصورت لڑکی کو ایک بار پھر مل لوں"۔ اُس نے

کہا تھا۔

وہ اور بھی کئی معنی خیز باتیں کر رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں بھی بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔ وہ تو پہلے ہی گھبرائی ہوئی تھی۔ اوپر سے یاور خان بھی پوچھ گچھ کرنے لگا تھا۔

''وہ... میں نے کہا تھا اُس سے...''

''پھر؟ کیا کہا اُس نے؟''

''ک... کچھ نہیں''۔ وہ اب بھی گھبرائی گھبرائی سی تھی۔

اُسے اُس پر ترس آ گیا۔ اس میں اُس کا کیا قصور تھا؟

''اچھا سنو۔ پھر کوئی آئے۔ تو ماما کو بھجوایا کرو۔ تم باہر مت نکلا کرو''۔

''اچھا''۔

جبکہ اُس نے ایسا ہی کیا تھا۔ مگر ابراہیم نے ماما سے کہا تھا کہ وہ خود بات کرنا چاہتا تھا۔ اُن کی مالکن سے۔

تبھی۔۔۔ حمید اُس کی کوفی لے کر آ گیا۔

''میں پھر فون کروں گا۔ Love you'' اُس نے فون بند کر دیا۔

کوفی پیتے پیتے اُسے خیال آیا۔ وہ خود چلا جائے شندی کے پاس۔ اُس کی برتھ ڈے پر اُسے Greet کرنے کے بعد وہ اُس سے ملا ہی نہیں تھا۔ فون پر بات ہو جاتی تھی۔ جو پیاس اور بڑھا دیتی تھی۔

مگر۔۔۔ اب کیا بہانہ بنائے گا؟ اُس کی ماما کی تو...

پھر اُسے ایک ترکیب سوجھی۔ شندی کا لینڈ لائین ملا دیا۔

''ہے... لو''۔ اُس کی توقع کے عین مطابق ماما ہی تھیں۔

''ماما میں ڈاکٹر یاور بات کر رہا ہوں''۔ اُس نے کچھ جھجکتے جھجکتے کہا۔

پتہ نہیں کیوں دل میں چور سا رہنے لگا تھا شندی سے اپنے پیار کے اظہار کے بعد سے۔



''جی بیٹا۔ کیسے ہیں آپ؟'' ادب کے ساتھ ساتھ اُن کے لہجے میں شفقت بھی تھی۔

یاور خان قدرے Encourage ہوا۔

''ٹھیک ہوں ماما۔ آپ کیسی ہیں؟''

''ٹھیک ہوں بیٹا۔ اِس عمر میں کچھ نہ کچھ تو لگا ہی رہتا ہے۔''

''تو آپ مجھے بتایا کریں نا۔ میں فِٹ کر دوں گا بالکل۔''

''اللہ عمر دراز کرے۔ ماں کا کلیجہ ٹھنڈا ہو...''

''تھینک یو ماما''۔

شندی کے 'تھینک یو' کہنے پر بھی ماما بہت خوش ہوا کرتی تھیں۔ اِس وقت یاور خان کے کہنے پر اور بھی خوش ہو گئیں۔

''جیتے رہیئے، خوش رہیئے۔ شندی بی بی بھی 'تھنک یو' کہتی ہیں تو دل خوش ہو جاتا ہے۔''

''آپ کی شندی بی بی کیا کر رہی ہیں؟'' اُسے موقع مل ہی گیا۔

''ارے بیٹا۔ آج تیسرا دن ہے۔ برابر گاجر کا حلوہ بنانے کی کوشش کرتی ہیں اور پھر رد کر جاتی ہیں۔ کہ ماما آپ کے جیسے والا نہیں بنا۔ اِس وقت پھر لگی ہوئی ہیں...''

اوہ۔۔۔ یاور خان بے اختیار ہنس دیا۔

شندی پر بے طرح پیار آیا۔ اُسی کے کہنے پر تو وہ سیکھنے کی کوشش کر رہی تھی!

''کہتی تھیں۔ جس دن ٹھیک بن جائے گا ڈاکٹر صاحب کو بھی بھیجیں گے۔'' ماما نے مزید کہا۔

''واؤ۔۔۔ ویسے ماما آپ نے کیا پکایا ہے آج؟''

''میں نے چکن بریانی اور مٹر قیمہ بنائے ہیں۔ فروٹ کسٹرڈ بھی ہے...''

"بہت مزیدار چیزیں ہیں سب ہاں"۔

"آپ کو پسند ہیں یہ چیزیں؟"

"بہت"۔

"تو آپ آ جائیں نا۔ شندی بی بی کے ساتھ مل کر کھالیں۔"

اُسے یہی تو چاہئے تھا۔ ماما سے بات کرنے کی ساری تگ و دو اسی لئے تو کی تھی۔

"آتا ہوں ماما پھر میں بھی"۔ اُس نے فون بند کر دیا۔

اُٹھا۔ ڈریسنگ روم جا کر اوور کوٹ پہنا اور ___ گھر سے نکلتے ہوئے شندی کی طرف ہو لیا۔

پچھلے دروازے پر دستک دی۔ تو ماما نے خوشی خوشی دروازہ کھول دیا۔

"آئیں بیٹا آئیں۔ اپنا ہی گھر سمجھیں۔"

وہ اندر داخل ہو گیا۔ مختصر سے کوریڈور میں سے گزرتے ہوئے دائیں طرف نظر ڈالی۔ شندی کچن میں مصروف تھی۔ اُسے بہت اچھا لگا۔ کھلے دروازے کو ہولے سے انگلیوں سے بجاتے ہوئے اندر چلا آیا۔

اُسے دیکھ کر شندی بدحواس سی ہو گئی۔

ہر چیز بکھری پڑی تھی۔ سارا کچن اتھل پتھل ہو رہا تھا۔

"آپ... آپ کیسے آئے؟"

"تمہیں حلوہ پکاتے دیکھنے آ گیا۔"

"اوہ"۔ اُس نے فوراً دیگچے پر ڈھکن بند کر دیا۔ آگے بڑھ آئی۔

"آئیں لِونگ میں بیٹھتے ہیں۔" وہ لال سرخ ہو رہی تھی۔

"نہیں۔ میں یہیں رہوں گا۔ تمہیں حلوہ پکاتے دیکھوں گا۔" وہ وہیں کھڑا رہا۔

"پلیز چلیں نا۔ میں آپ کے سامنے نہیں پکا سکوں گی۔" وہ سچ مچ



گھبرائی جا رہی تھی۔

"اچھا کتنی دیر اور لگے گی؟" وہ واقعی اُس کے سامنے کچھ نہ کر پاتی۔ جانا ہی بہتر تھا۔ "میں ویٹ کروں گا"۔

"بس دو منٹ میں تیار ہوتا ہے۔ آپ چلیں میں آتی ہوں۔"

"اوکے میم صاحِب۔"

وہ لاؤنج میں آ کر بیٹھ گیا۔ آج وہ پہلے کی نسبت زیادہ بے تکلف محسوس کر رہا تھا۔

شندی جلدی ہی آ گئی۔ اُس کے قریب والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

"آپ کو کیسے پتہ چلا میں حلوہ بنا رہی ہوں۔"

"ماما نے بتایا تھا۔"

"اوہ ___ تو وہ لمبی لمبی باتیں آپ سے کر رہی تھیں؟"

"ہاں۔ بلکہ میں نے فون کیا تھا اُنہیں۔"

"اُن کو فون کیا تھا؟"

"اُن کے ساتھ دوستی کی تو تم تک رسائی ہوئی نا"۔

"اوہ مائی گوڈ!" وہ خوبصورتی سے ہنس دی۔ "آپ Tricks بھی کرتے ہیں؟"

اُس کا جاندار قہقہہ بلند ہوا۔

"کرنا پڑتا ہے۔"

"اچھا؟" شندی شرارت سے بولی۔

اور ___ یاور خان نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے اُس کے خوبصورت گھنے بال جھنجھوڑ ڈالے۔

"میرے سارے بال الجھا دیئے۔" بال درست کرتے کرتے وہ روٹھی روٹھی سی شکل لئے بولی۔

اِس وقت وہ اُسے بہت پیاری لگی۔

اُس نے اُسے اپنے پہلو سے لگالیا۔ ہونٹ اُس کے ماتھے پر رکھ دیئے۔

''مجھے پورے کا پورا الجھا دیا۔ وہ کوئی بات نہیں، ہاں۔'' وہ اُس کی بند بند آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ آواز جذبات سے بھاری ہونے لگی۔

''ہوں، بتاؤ نا''۔ انگلی سے اُس کے خوبصورت چہرے پر لکیر بناتے ہوئے وہ ایک بار پھر بولا۔

وہ خاموش تھی۔ کہتی بھی کیا؟

''اچھا اوپر تو دیکھو نا۔'' وہ باری باری اُس کی دونوں آنکھوں پر پیار کرتے ہوئے ایک بار اور بولا۔

اور ___ شندی نے آہستہ سے جھالریں پلکیں وا کیں۔

اُس کی آنکھوں میں بے شمار باتیں تھیں۔ بے حساب قصے تھے۔

وہ سہار نہ سکی۔ پلکوں کی چلمن گرنے اُٹھنے لگی۔

اور ___ اُس نے اُسے ڈھیر سارا پیار کرلیا۔

قدرے ہوش میں آیا۔ تو اُسے اپنے سے الگ کیا۔ اُس کے بال سہلائے۔

تبھی ماما دونوں کے لئے کوفی لیکر آگئیں۔ اُن کے آگے میز پر لگائی۔ اور خالی ٹرے لئے واپس چلی گئیں۔

شندی چپ چپ سی تھی۔ یاور خان اپنے لئے کوفی بناتے ہوئے دھیرے سے مسکرایا۔

''شندی باتیں کرو نا''۔

وہ کیسے باتیں کرتی۔ نظریں تو اوپر اٹھا نہیں سکتی تھی۔ اتنی بول رہی تھیں آج اُس کی آنکھیں۔ آہستہ سے اُس نے اپنا مگ اپنے نزدیک کرلیا۔

''اچھا تم مت کرو۔ میں باتیں کرتا ہوں۔ تم سنو''۔



وہ ریلیکس محسوس کرنے لگی۔

''تمہیں پتہ ہے ایک لڑکی نے مجھے Haunt کیا ہوا ہے۔ گھر میں بھی، ہوسپٹل میں بھی میرے حواسوں پر چھائی رہتی ہے۔ آنکھیں بند کرتا ہوں تو بھی وہی، کھولتا ہوں تو بھی وہی۔ پتہ نہیں کیا ہوگا میرا...''

نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کے آخری جملے پر شندی کو ہنسی آگئی۔

وہی دور کہیں بجتے پائلوں کی سی ہنسی!

اُس کی ہر ادا انوکھی تھی۔ وہ بے بس سا اُسے دیکھنے لگا!

''میں تو کہیں کا نہیں رہا۔ الٹے سیدھے کام کرنے لگا ہوں اب تو''۔

''مثلاً؟'' شندی بول ہی پڑی۔

یاور خان کا زوردار قہقہہ بلند ہوا۔

''مثلاً۔'' ایک پل کو اُس نے کچھ سوچا۔ ''کل میں نے آپریشن کے بعد مریض کے پیٹ پر ٹانکے لگانے کے بجائے پاس کھڑے ڈاکٹر کے ہاتھ پر لگا دیئے...''

اور ___ شندی کھلکھلا کر ہنس دی۔

''آپ... جھوٹ بھی بولتے ہیں؟''

وہ ایک بار پھر ہنس دیا۔

''کبھی کبھی ___ جب ضرورت پڑتی ہے تو''۔

''اِس وقت ضرورت تھی؟''

''ہاں نا۔ تم بول جو نہیں رہی تھیں۔''

وہ چپکے سے مسکرا دی۔ وہ بہت دلچسپ باتیں کرتا تھا!

شندی نے اپنا مگ اٹھالیا۔ آہستہ آہستہ کوفی پینے لگی۔

تبھی ___ یاور خان نے اُسے نواز کی دی گئی مزید معلومات سے آگاہ کیا۔ مسز علی ملک سے باہر پہنچی ہوئی تھی۔ اکرم بابا ابھی بھی پولیس کی نظروں سے

پوشیدہ تھے۔ نواز بتا رہا تھا۔ کہ وہ اکرم بابا سے ملا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے۔ کہ جوں ہی شندی بی بی گھر آ جائیں گی، اُن کی بیوی بچوں کے سر پر کوئی ہاتھ رکھنے والا ہو گا۔ تو وہ خود بخود گواہی دینے کورٹ میں پیش ہو جائیں گے ...''

''اوہ۔۔۔ انکل اُنہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ وہ بہت خوفناک انسان ہیں۔'' اُسے پیٹتے وقت اُن کا غضبناک چہرہ اُس کے سامنے آ گیا۔ وہ سہم کر بولی۔

''انکل اُن کا کچھ نہیں کر سکتے۔'' وہ تسلی آمیز لہجے میں بولا۔ ''تمہارے پاپا کے ساتھ اگر کیا۔ تو صرف موقع کا فائدہ اٹھا کر کیا۔ اب اُن کی اصلیت کھل چکی ہے۔ دوبارہ ہمت نہیں کر سکتے۔ اُنہیں پتہ ہے الزام اُن پر ہی آئے گا۔''

''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔'' وہ اب بھی گھبرائی گھبرائی سی تھی۔

اور۔۔۔ یاور خان نے سوچا۔ اُسے بتا کر اُس نے اُس نے غلطی کی۔ آئندہ وہ اس سلسلے میں اُس سے بات نہیں کرے گا۔ کیس چلتا رہے گا۔ جو ہو گا۔ سامنے آ جائے گا۔

''میں ہوں نا۔'' اُس نے اُس کا نازک ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھ میں تھام لیا۔ ''تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

اُس کی دلنشیں آنکھوں میں اپنائیت تھی، بہت کیئر تھی!

اُس کی ڈھارس بندھی۔ دل بڑا ہوا۔

''اور پھر اچھا ہے کہ کچھ فیصلہ ہو۔ تم کب تک یوں چھپتی چھپاتی پھرو گی۔ جبکہ تمہارا اپنا گھر ہے۔ اپنے لوگ ہیں ...''

''اپنا گھر ہے۔ اپنے لوگ نہیں ہیں۔'' وہ اُداسی سے بولی۔

وہ چپ سا ہو گیا۔ اُس کی طرف دیکھا۔ ایک گہری سانس لی۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا''۔ اس نے اُس کے ہاتھ کی پشت پر اپنے پرکشش ہونٹ رکھ دیئے۔



''مجھے اپنا گھر بہت یاد آتا ہے۔'' اُس کی حسین آنکھیں نم ہو گئیں۔ آہستہ سے اپنا سر اُس کے گھٹنے پر رکھ دیا۔

وہ اُس کے خوبصورت مہکتے بال سہلانے لگا۔ بہت پیار سے، بہت اپنائیت سے۔

'سنو'۔

''جی''۔ وہ سر اُٹھا کر اُسے دیکھنے لگی۔

''یہ۔۔۔ ابراہیم کیوں آیا تھا؟''

وہ اب بھی قدرے گھبرا سی گئی۔

''آپ کو بتایا تو تھا۔ میری شوپنگ کی چیزیں لیکر آیا تھا...''

''ہمہ''

''غصہ ابھی تک ٹھنڈا نہیں ہوا؟''

''اپنے گھر ڈنر پر بھی تمہارے آگے پیچھے ہو رہا تھا۔ اُس وقت تو میرا دل چاہا تھا گلہ دبا دوں اُس کا اور آج۔۔۔ آج دل چاہا تھا گولی مار دوں اُسے۔ ایک دو نہیں۔ پوری مشین گن خالی کر دوں ...''

''باپ رے''۔ شندی مسکرا دی۔

''میں سیریس ہوں۔ آئندہ تو ہمت کر کے دیکھے ...''

تبھی اُس کا سیل بج اٹھا۔ اُس نے کال ریسیو کی۔

''مجھے جانا ہو گا میم۔ ہوسپٹل سے کال ہے''۔ وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''لیکن آج تو آپ آن کال نہیں ہیں۔'' وہ بھی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''اوہ۔۔۔ تمہیں اتنا یاد رہتا ہے۔''

''مجھے آپ کی بہت سی باتیں یاد رہتی ہیں''۔

اُس نے محبت سے اُسے دیکھا۔ پیار سے اپنے ہاتھ کی پشت سے اُس کا گال سہلانے لگا۔

"وہ دراصل میں نے اپنے سٹاف سے کہہ رکھا ہے۔ کہ میرے پیشنٹ کو پرابلم ہو تو آن کال سرجن سے مت کہیں مجھے خود بلائیں۔"

"اوہ"۔ اُسے سسٹر نرگس نے بھی یہی بتایا تھا کہ یاور خان اپنے پیشنٹ کو دیکھنے خود آتا ہے۔ آن کال سرجن سے تسلی نہیں ہوتی۔ "لیکن کھانا تو کھا کر جائیں"۔

"پھر کبھی سہی، ہاں"۔ اُس نے اُس کا گال تھپتھپایا۔

اور ـــ بڑے بڑے قدم اٹھاتا گھر آیا، گاڑی میں بیٹھا اور ـــ

ہوسپٹل کی راہ لی۔

رات دیر سے واپس آیا۔ اوپر جاتے جاتے اُس نے حمید کو کھانا اُس کے بیڈ روم میں لانے کو کہا، ہاتھ منہ دھوئے، کپڑے تبدیل کیئے اور صوفے پر بیٹھتے ہوئے کھانے کا انتظار کرنے لگا۔

تھوڑی ہی دیر میں کھانے کی ٹرے لئے حمید اندر آ گیا۔ اُس کے سامنے میز پر برتن لگانے لگا۔

"صاحب نور محمد یہ حلوہ لیکر آیا تھا"۔ اُس نے حلوے کی ڈش رکھتے رکھتے کہا۔

"اوہ۔" شندی کے ہاتھ کا بنا حلوہ!

ایک دلآویز مسکراہٹ اُس کے لبوں سے چپک کر رہ گئی۔

وہ کھانا کھانے لگا۔ حمید نے بھی آج سوپ خاصا اچھا بنایا تھا۔ چائنیز چلی اور چاول بھی بُرے نہیں تھے۔ سیکھ ہی گیا تھا آہستہ آہستہ

اور ـــ حلوہ ـــ بس سو سو تھا۔ مگر اُسے بہت اچھا لگا۔ کہ شندی نے یہ صرف اُس کی خاطر بنایا تھا!





دن دھیرے دھیرے سرک رہے تھے۔ ٹھنڈ اب بھی تھی۔ مگر وہ والی چبھن نہیں رہی تھی۔ خوبانیوں اور سیبوں کے باغوں میں سفید گلابی شگوفوں کی بہار آ گئی تھی، نوخیز ہریالیوں میں نرم خرام ہوائیں۔ سرگوشیاں کرنے لگی تھیں اور ـــ چرند پرند میں نئی جوت انگڑائیاں لینے لگی تھی۔

متواتر تین گھنٹے آپریشن تھیٹر میں کھڑے رہنے کے بعد یاور خان تھکا سا سرجن لاؤنج میں آ گیا۔ ماسک اور گلووز اُتارے، ہاتھ دھوئے، کچٹ آیا، اپنے لئے چائے بنائی۔ اور پرلی طرف جا کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ نادیہ بھی ساتھ ساتھ تھی۔

"تھک گئے ہونا؟" نادیہ کے لہجے میں اپنائیت تھی۔

یاور خان چونک سا اٹھا۔ عرصہ بعد وہ concerned سی لگ رہی

تھی۔

''ہاں''۔ اُس نے میز کے نیچے ٹانگیں سیدھی پھیلا دیں۔ سر کرسی کی پشت سے ٹکاتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

''اور ابھی ایک اور بھی آپریشن رہتا ہے۔'' وہ اپنے پرس میں سے پیپر نیپکن نکالتے ہوئے اُس کی ٹھوڑی کے نیچے آپریشن کے دوران لگا خون کا چھینٹا صاف کرتے ہوئے بولی۔

وہ مسکرا دیا۔ دھیرے سے۔

''بہت مہربان ہو رہی ہو آج ہاں''۔ سیدھا ہوتے ہوئے اُس نے کپ ہونٹوں سے لگا لیا۔

''تم ہی کھچے کھچے رہتے ہو ورنہ...'' وہ خاموش ہو گئی۔

چائے پینے کے دوران نادیہ نے مزید گلے شکوے کئے۔ شندی کا بھی ذکر آیا۔ کہ اُس کا خیال تھا کہ یاور خان اُس میں انٹرسٹڈ تھا سو اُس نے خود ہی قدرے فاصلہ رکھ لیا تھا۔ لیکن اب اُس کی غلط فہمیاں دور ہو گئی تھیں۔ اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے دور دور رہیں۔

یاور خان 'ہاں' 'ہوں' میں جواب دیتا رہا۔ اور کرتا بھی کیا؟

دوسرے آپریشن سے فارغ ہو کر وہ لنچ کے لئے کیفے ٹیریا میں آ گیا۔

وہیں ڈاکٹر نادر بھی ایک ٹیبل پر بیٹھا تھا۔ وہ بھی آ کر بیٹھ گیا۔

''خیریت؟ آج لنچ کے لئے ہوسٹل نہیں گئے''۔ یاور خان نے پوچھا۔

اُس کا فلیٹ ہوسپٹل کے احاطے میں ہی تو تھا!

''سر۔ دراصل آج میری وائف بمعہ بچے کے چلی گئی اپنے پیرنٹس کے پاس۔ نوکر بھی بس یوں ہی سا ہے۔ سو جتنے دن وہ وہاں گزارے گی۔ میں لنچ یہیں کیا کروں گا۔''

''گڈ آئیڈیا''۔ یاور خان نے بھی اپنے لئے کھانا منگوا لیا۔



دونوں کھانا کھاتے گپ شپ کرنے لگے۔

''کل ڈاکٹر کوثر کا نکاح ہو گیا ہے۔ آپ کو پتہ ہے؟''

ڈاکٹر نادر کے پاس ویسے خبریں خاصی ہوتی تھی!

''اچھا۔'' شاید اُسے انور کے علاوہ کوئی مل گیا تھا!

''ڈاکٹر نادیہ آج کل بڑی اَپ سیٹ رہتی ہیں۔ وہ تو اپنی دانست میں لے اڑی تھیں انور کو مگر انور کے پیرنٹس نے انور کو کھری کھری سنائیں اور کل شام بٹھا کر نکاح پڑھوا دیا ڈاکٹر کوثر کے ساتھ...''

تو۔۔۔ اس لئے آج ایک بار پھر مہربان ہو رہی تھی اُس پر!

''تمہیں کیسے معلوم ہوا یہ سب؟''

''ڈاکٹر کوثر کی میری وائف سے بڑی گپ شپ ہے۔ اُس نے خود فون کر کے بتایا ہے اُس کو۔''

''آئی سی۔۔۔ ویسے ٹریٹ لینا چاہئے ڈاکٹر کوثر سے۔'' یاور خان خوشگواری سے بولا۔

''میں نے صبح کہا تھا اُس سے۔ کہتی تھی کل دے گی ٹریٹ سب کو۔''

''چلو اچھا ہے۔ ڈاکٹر کوثر کا گھر بس جائے گا۔''

لنچ کے بعد دونوں اپنے اپنے آفس چلے گئے۔

''چھٹی ہونے سے پہلے نادیہ نے اُسے سیل پر میسج دیا۔ کہ گھر جاتے وقت وہ اُسے ساتھ لیتا جائے۔

شام ساڑھے چھ بجے کے قریب آج پھر دونوں گاڑی میں بیٹھے اپنے گھروں کی طرف چلے جا رہے تھے۔

''تمہاری... پیشنٹ کا کیا بنا؟'' نادیہ نے خاصی دیر کی خاموشی کو توڑا۔

اوہ۔۔۔ اُس کا اشارہ یقیناً شندی کی طرف تھا!

''کون سی پیشنٹ؟ آج جس کا آپریشن ہوا ہے؟'' وہ جان بوجھ کر

انجان بن گیا۔ لہجے میں شرارت سی بھی تھی۔

''چھوڑو نا۔ اچھی طرح جانتے ہو میں کس کی بات کر رہی ہوں''۔

یاور خان نے صبح بھی نوٹ کیا تھا، اِس وقت بھی۔ وہ کچھ پریشان سی تھی، متفکر سی بھی۔

''میں واقعی نہیں جانتا تم کس پیشنٹ کی بات کر رہی ہو؟'' وہ اب بھی انجان بنا رہا۔

''میں نیلوفر کی بات کر رہی ہوں''۔

''اوہ___ اُس کو کیا ہوا؟'' لب ولہجہ اب بھی شریر تھا۔

''تنگ مت کرو نا یاور۔ میں پہلے ہی کافی پریشان ہوں''۔

''کیوں؟ کیا ہوا؟''

''بتاؤں گی۔ پہلے تم بتاؤ۔ نیلوفر کا کچھ بتایا نہیں؟ کب جائے گی وہ یہاں سے؟''

یاور خان مسکرا دیا۔ دلآویزی سے۔

''تم کیوں اُسے یہاں سے بھگانے پر تلی ہو؟'' وہ خوشگواری سے بولا۔

''میرا بس چلے تو میں اُس کا گلہ دبا دوں''۔

''اوہ مائے گوڈ! اِتنی بری لگتی ہے تمہیں۔''

''کیوں نہیں لگے گی۔ تم جو... اچھا بتاؤ۔ تمہارا اُس کے ساتھ صرف دوستی کا تعلق ہے یا...''

''کہیں دوستی سے بات آگے نکل گئی ہو تو؟''

''میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گی۔'' وہ سختی سے بولی۔

''واؤ۔'' یاور خان نے اپنی کنپٹی سہلائی۔ ''میں بے بچارا...''

''تم بچارے ہرگز نہیں ہو''۔ وہ تیزی سے بولی۔



یاور خان نے گہری تھکی سانس لی۔ مسکرایا۔

''تم اچھی خاصی میچورڈ ڈاکٹر ہو۔ لیکن بعض وقت بالکل بچوں جیسی باتیں کرتی ہو...''

''دیکھو میں سیریس ہوں۔ تم بات ٹالنے کی کوشش مت کرو۔''

''میں بات ٹال نہیں رہا''۔

''تو پھر صاف بتاتے کیوں نہیں ہو کہ مجھ سے اکتا گئے ہو''۔

''باپ رے۔ تم اکتانے والی چیز ہو؟'' وہ اپنی دلنشیں آنکھیں پوری کھولتے ہوئے بولا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی نادیہ ہنس دی۔

''اچھا چھوڑو۔ تم نہیں بتاؤ گے۔ میں ہی اپنی پریشانی بتا دیتی ہوں''۔

وہ اُس سے بات اگلوا نہ سکی۔ ہار ماننا ہی پڑی۔

''ہاں پلیز! بتاؤ نا کیوں پریشان ہو؟''

''میرے لئے ایک پروپوزل آیا ہے''۔

''یہ تو واقعی پریشانی کی بات ہے''۔ اُس نے پھر اُسے چھیڑا۔

''اِسی لئے تو کہہ رہی ہوں۔ تم اپنی مدر سے جلدی بات کرو۔ کیونکہ ممی اور ڈیڈی اِس بار مجھے سیریس لگ رہے ہیں۔''

''تو ہونے دو نا سیریس۔''

نادیہ جھنجھلا اُٹھی۔

''پہلے تم سیریس ہو جاؤ۔ تمہیں پتہ ہے میں تمہارے علاوہ کسی اور کا سوچ بھی نہیں سکتی۔''

یاور خان دھیرے سے مسکرایا۔ انور سے مایوس ہو کر ایک بار پھر وہ اُسے بیوقوف بنانے کا سوچ رہی تھی۔

''تمہیں میں نے بتایا تھا نا کہ امی اپنی ایک دوست کی بیٹی سے میرا رشتہ

کروانا چاہتی ہیں۔ اور یہ بھی بتایا تھا کہ امی اپنی بات کی بہت پکی ہیں۔ میں تو خود پریشان ہوں کہ امی سے کیسے اپنی بات منواؤں گا۔'' وہ واقعی شندی کے بارے میں امی سے بات کرنے کے خیال سے اَپ سیٹ تھا۔

''تو تم نے ابھی بات نہیں کی اُن سے؟''

''چھٹی ملے تو جاؤں۔ فون پر کرنے والی باتیں تو ہیں نہیں''۔

''اور اِس دوران بھی ممی اور ڈیڈی نے میری بات پکی کرادی تو؟''

''تو ___ وہی ہوگا جو منظورِ خدا ہوگا۔'' اُس نے گاڑی بائیں جانب نادیہ کے گھر کی طرف موڑ دی۔

کچھ یقین اور کچھ بے یقینی کے عالم سے دوچار وہ گاڑی سے اتر گئی۔

اور ___ یاور خان نے آہستہ سے گاڑی کا رخ واپس موڑ لیا۔

گھر کی طرف چلا۔ تو کچھ گِلٹی سا محسوس کرنے لگا۔

اُسے چاہئے تھا کہ اُس سے صاف بات کر لیتا۔ اندھیرے میں رکھنا کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ لیکن ___ کیسے منہ پر کہہ دیتا؟ اور پھر شدید لڑائی کا امکان بھی تو تھا!

بہر حال ___ آئندہ بات ہوئی اِس موضوع پر۔ تو یقیناً اُس سے معذرت کر لے گا۔

''رات گھِر آئی تھی۔ جگمگاتی کہکشاں بستی پر جھک آئی تھی اور ___ اور پار کسی جزیرے سے سرگوشیاں کرتی ہوائیں در آئی تھیں!

جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ دیئے اپنی بالکنی میں کھڑا وہ اردگرد کے سحر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

تبھی ___ اُس کا سیل فون بج اٹھا۔ نادیہ تھی۔

''یس ڈاکٹر صاحب''۔ وہ خوشگواری سے بولا۔

''تمہیں بتایا تھا نا اُس پروپوزل کا''۔



''ہاں''۔

''وہ لوگ آج پھر آئے تھے''۔

وہ خاموش رہا۔ کیا کہتا؟ انور نے راستہ بدل لیا تھا تو اُسے اُس کی یاد آ گئی تھی!

''کچھ بولو نا۔'' وہ پھر بولی۔

''کیسا ہے وہ آدمی؟'' آخر وہ گویا ہوا۔

''کون؟'' وہ جیسے سمجھی نہیں۔

''وہی جو تمہیں پروپوز کر رہا ہے۔''

''بس اچھا ہے۔ سائیکیاٹرسٹ ہے...''

''تو پھر ___ ٹھیک ہے نا۔ یہی کچھ تو ہوتا ہے۔''

''کیا؟'' اُسے جیسے یقین نہیں آیا۔

''ہاں۔ اِسی میں تمہاری بہتری ہے۔ اتنی چاہت سے تمہارا رشتہ مانگ رہا ہے۔ یہی تمہاری قدر بھی کرے گا''۔ اُس نے اپنی رائے دے ہی دی۔

''اور تم... نیلوفر کے چکر میں ہو''۔ وہ اچانک آتشِ پا ہو گئی۔

اُس نے انکار نہیں کیا۔ خاموش رہا۔

اُسے اور بھی غصہ آ گیا۔

''خود سے اتنی چھوٹی اور مجبور لڑکی کے ساتھ گلچھرے اُڑاتے شرم نہیں آتی''۔ وہ چلائی۔

''اوہ شٹ اَپ۔'' کتنی فضول بات کر رہی تھی۔ وہ بھی برس پڑا۔

''چلاؤ مت۔ اتنے پارسا بھی نہیں ہو''۔

"Stop it. I say, stop it."

''سچی بات کڑوی لگی نا''۔

سچ تو اُس کے پاس بھی بہت تھا۔ مگر وہ اتنا کم ظرف نہیں تھا کہ اُسے یاد

دلاتا!

"Shut up — Just shut up." اُس نے فون بند کردیا۔

وہ عورت نہ ہوتی تو وہ اُس کا گلہ دبا دیتا۔ کتنی گندی اور مکروہ سوچ تھی اُس کی!

اور ___ بالکنی سے اندر کمرے میں آتے آتے اُس نے سوچا۔ یہی وقت تھا۔ اُسے امی کو سب بتا دینا چاہئے تھا!

کچھ دیر یوں ہی وہ بے مقصد بیچ کمرے میں کھڑا رہا۔ پھر خیال آیا اُسے حمید نے آج کوفی نہیں دی تھی۔ گھر آتے ہی وہ کوفی نہ پی لیتا تو وہ ادھورا ادھورا سا محسوس کرتا تھا۔

اوپر سے کہلانے کی بجائے وہ خود نیچے کچن میں آ گیا۔

''صاحب۔ میں آپ کی کوفی لیکر آیا تھا۔ آپ فون پر بات کر رہے تھے۔ میں واپس لے آیا''

وہ جس وقت نادیہ سے تیز تیز باتیں کر رہا تھا۔ اُسی وقت حمید کوفی لیکر آیا تھا۔ مگر یاور خان کو غصے میں دیکھ کر اُلٹے قدموں واپس آ گیا تھا۔

''اوہ۔ چلو اب لے آؤ۔ اور ___ میوہ خان کو بھی اوپر بھیجو''۔ کہتے کہتے وہ واپس مڑا۔

کوفی اور میوہ خان دونوں آ گئے۔ کس کافر کا دھیان نہ بدلتا!

کوفی کا خالی کپ اور میوہ خان دونوں رخصت ہوئے تو وہ وہیں صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے شندی کا نمبر ملانے لگا۔

''کیسے ہیں آپ؟'' اُدھر سے شندی کی آواز ابھری۔

ہر بار شرمایا لجایا لہجہ ___ فرمانبرداری، مؤدب سی!

جاگیردارانہ ماحول میں پلی بڑھی یہ بھی تو ایک لڑکی تھی۔ وہ نادیہ سے اُس کا مقابلہ کئے بغیر نہ رہ سکا۔



''ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ۔ کیا کر رہی تھیں؟''

وہ مسکرادی۔

''Patience کھیل رہی تھی۔''

اوہ ___ تاش کا گیم جو صرف ایک بندہ کھیلتا ہے!

''اِس کا مطلب ہے لونلی فیل کر رہی تھیں''۔

''ہاں۔ ماما بھی بازار گئی ہیں''۔

''میں آ جاؤں؟'' اچانک اُس کا دل اُسے ملنے کو کرنے لگا۔

''آ جائیں''۔

''واقعی آ جاؤں؟'' ماما بھی تو نہیں تھیں۔

شندی سمجھ گئی۔ خوبصورتی سے ہنس دی۔

''آ جائیں۔ ماما بس آنے ہی والی ہیں۔''

''او کے میم۔'' اُس نے فون بند کر دیا۔

ڈریس اَپ ہوا اور ___ منٹوں میں اُس کے پاس جا پہنچا۔

اُس نے پہلے کی طرح اُسے لِونگ روم میں بٹھایا۔ خود بھی پاس ہی بیٹھ گئی۔ اب اُس کی وہ پہلے والی جھجک جاتی رہی تھی۔

لجاتی سی، آنکھیں چراتی سی وہ اُس کے ساتھ باتیں کرنے لگی۔ پیاری پیاری اور میٹھی میٹھی!

یاور خان گاہے گاہے اُس کے چہرے پر بکھر آئے اُس کے خوبصورت بال ہٹاتا، اُس کی بے حد حسین آنکھوں میں بغور جھانکتا، اُس کے دلکش چہرے کو ہونٹوں سے چھوتا ___ تو وہ کانوں کی لوؤں تک سرخ ہو جاتی، لعلیں لب کپکپا اٹھتے اور لانبی خمیدہ پلکیں آنکھوں پر سائبان کر لیتیں!

سارے دن کی تھکن اور نادیہ کے ساتھ چخ چخ کے بعد اُسے لگا۔ وہ اُس گھنے درخت کے نیچے آ بیٹھا تھا۔ جو اپنی ڈالیوں پر مہکتے پھولوں کی قندیلیں جلائے

دور دور تک سایہ کیے تھا!

''ابراہیم پھر تو نہیں آیا تھا؟'' اُس نے اچانک پوچھا۔

''نہیں۔ آنٹی آئی تھیں''۔

''She is a nice lady.'' وہ بولا۔

''ہاں۔ میرا تو بہت خیال رکھتی ہیں۔''

''وہ ہیں ہی بہت اچھی۔ امی کی دوست تو ہیں ہی۔ مجھے بھی بہت محبت دی ہے''۔

''کہتی تھیں ابراہیم کچھ عرصے میں جاب کے سلسلے میں واپس انگلینڈ جانے والا ہے۔ سوچتی ہوں جانے سے پہلے کسی اچھی سی لڑکی سے اُس کا نکاح کروالوں۔''

آنٹی آئی تھیں اور شندی سمجھ گئی تھی اِس بار وہ خاص طور سے یہ بات کرنے آئی تھیں۔ کیونکہ سارا وقت باتوں کا موضوع ہی تو ابراہیم رہا یا پھر شندی کی تعریفیں کرتی رہیں۔ مزید کہ ــــ یہی وقت تھا، شندی کو ایک مرد کے مضبوط سہارے کی ضرورت تھی...

شندی نے اِس وقت یاور خان کو محض چھیڑنے کے لئے یہ بات بتائی۔

''یہ کہہ رہی تھیں وہ؟'' یاور خان کے کان کھڑے ہوئے۔

''ہاں۔'' اُس نے ہنسی بمشکل ضبط کی۔

''تو تمہیں کیوں کہہ رہی تھیں؟''

''پتہ نہیں۔ یہ بھی کہہ رہی تھیں کہ یہی وقت ہے کہ مجھے ایک مرد کے مضبوط سہارے کی ضرورت ہے...''

''اِس کا مطلب ہے آنٹی کے منہ میں بھی تمہارے لئے پانی آرہا ہے۔'' اُس نے دو لمحے توقف کیا۔ دلنشیں آنکھوں میں تشویش ابھر آئی تھی۔'' مضبوط سہارا، ہہہ۔ ابراہیم ــــ چوہا۔'' اُس نے اُن کے مختصر تخنی سراپے پر چوٹ



کی۔

آنکھوں میں اتھارٹی، شخصیت میں کمانڈ ــــ پھر بھی جیلس ہوگیا تھا۔

شندی کو ہنسی آگئی۔

''تم ہنس رہی ہو''۔ وہ سنجیدہ ہو رہا تھا۔

''نہیں''۔ سر نفی میں ہلاتے ہوئے وہ اور بھی ہنس دی۔

اُس نے اُسے اپنے پہلو سے لگایا۔ غور سے اُس کی آنکھوں میں دیکھا۔

''اُن سے کہہ دو۔ تم میری ہو۔ صرف میری۔'' اُس نے آہستہ سے اپنے ہونٹ اُس کے ماتھے پر رکھ دیئے۔

پھر ــــ اُسے اپنے دونوں بازوؤں میں بھرلیا۔ سینے سے لگالیا۔

''I love you Shandi.'' اُس کے مہکتے بالوں میں چہرہ دیئے وہ جذبات سے بھاری آواز میں بولا۔

اور ــــ شندی اپنی دھڑکنوں میں دھڑکتی اُس کے دل کی دھڑکنیں، اپنی سانسوں میں گڈمڈ ہوتی اُس کی مہکتی سانسیں، اپنے چہرے پر محبت کی مہر ثبت کرتے اُس کے تپتے ہونٹ محسوس کرتی اُس کے بازوؤں میں گھری دنیا و مافیہا سے بے خبر اُس کے سینے سے لگی رہی۔

اُسے لگا ــــ وہ ہی تھا اُس کا سب کچھ۔ وہ کون تھا؟ کہاں سے تھا؟ اُسے جاننے کی ضرورت نہیں تھی!

''شندی''۔ یاور خان اِس کی بند بند آنکھوں میں جھانکا۔

''جی۔'' جھالریں پلکیں وا کرتے ہوئے وہ ہولے سے بولی۔

''Do you love me too ?''

کوئی بھی جواب دیئے بنا شندی نے دھیرے سے اپنے کومل ہونٹ اُس کے گال پر رکھ دیئے۔

بہت انوکھا بہت پیارا جواب تھا۔ وہ مدہوش سا ہوگیا۔ اُسے ڈھیر سارا

پیار کرلیا۔

تبھی۔۔۔ باہر ماما کے قدموں کی آہٹ ہوئی۔

یاور خان کی سیاہ گھنی بھوئیں اوپر اٹھ گئیں۔ مسکرا دیا۔

''آ گئیں تمہاری بوڈی گارڈ''۔

دونوں سنبھل کر بیٹھ گئے۔

چند ثانیے کے لئے یاور خان کا دھیان آنٹی نور جہاں کی باتوں کی طرف گیا۔ کچھ نہ کچھ ضرور تھا اُن کے ذہن میں شندی کے لئے۔ اُسے بھی اب بات کو زیادہ طول نہیں دینا چاہئے تھا۔ لیکن۔۔۔ امی۔۔۔ باپ رے!

''آپ کہاں کھو گئے؟''

وہ خیالوں سے ابھرا۔ اُس کی طرف دیکھا۔

''کہیں نہیں۔ یہیں ہوں۔ تمہارے پاس''۔ وہ خوشگواری سے بولا۔

وہ مسکرادی۔ وہ واقعی اُس کے پاس رہتا تھا۔ دن رات، پل پل!

ڈنر پر چکن و یجیٹیبل سوپ تھا، ایگ فرائیڈ رائس، ڈرم سٹکس اور فروٹ ٹرائفل تھا۔

دونوں مزیدار کھانا کھانے لگے۔

''ماما نے یہ کھانے بنانا کہاں سے سیکھا ہے؟'' اُسے واقعی حیرت ہو رہی تھی۔

''ہماری حویلی کے خانساماں سے۔ پاپا کو بھی بہت شوق تھا چائنیز کھانوں کا۔''

''اوہ۔۔۔ میں حمید سے کہوں گا وہ بھی آ کر ماما سے سیکھے...''

''مجھے نہیں کہیں گے سیکھنے کو؟'' پتہ نہیں کیوں اُس کے لہجے میں شکایت سی عود کر آئی۔

''اوہ۔ تم سیکھو گی؟ میرے لئے؟''



''ہاں۔'' اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔

اُس سے وہ اُسے بہت بہت اچھی لگی۔ آہستہ سے اپنے ہونٹ اُس کے ہاتھ کی پشت پر رکھ دیئے۔ "I'm so lucky for having such a wonderful girl as the love of my life."

"And I am even luckier for having you as my love."

وہ اپنائیت سے مسکرا دیا۔ ایک بار اور اُس کے ہاتھ پر پیار کرلیا۔

تبھی۔۔۔ ماما ہاتھوں میں ایک ڈش لئے آ گئیں۔

''شندی بی بی۔ یہ جج صاحب کے گھر سے آیا ہے۔'' اُنھوں نے ڈش میز پر رکھی۔ اور واپس چل دیں۔

کھیر تھی۔ بہت اچھی لگ رہی تھی۔

''تو بات یہاں تک پہنچ گئی ہے''۔

اُس کے لب و لہجے پر اُسے ہنسی آ گئی۔

''آنٹی تو شروع ہی سے کچھ نہ کچھ بھیجتی رہتی ہیں۔''

''خطرے کا سگنل ہے۔ And now its high time to tell my mother every thing about you."

شندی کی پلکیں جھک گئیں۔ چہرے پر حیا کی لالی بکھر گئی۔

''کیوں کیا خیال ہے؟'' یاور خان نے اُس کی جھکی جھکی پلکوں کو دیکھتا محظوظ ہوتا پھر بولا۔

''آپ... یہ لیں۔'' اُس کی شوخ نظروں سے بچنے کے لئے اُس نے اُسے کھیر آفر کی۔

''سوری۔ میں رقیبوں کے گھر کی چیز نہیں کھاؤں گا۔''

جبکہ وہ اپنے فزیک کا خیال اتنا رکھتا تھا کہ میٹھی چیز کو شاذ ہی ہاتھ

لگا تا تھا۔

شندی کو اور بھی ہنسی آ گئی۔

''ہائے داوے۔ تم کیوں اتنی خوش ہو رہی ہو''۔

''مجھے تو آپ کی باتوں پر ہنسی آ رہی ہے۔''

''کیوں؟''

''بچوں جیسی باتیں کر رہے ہیں۔''

''کیا واقعی؟'' اُس نے اچانک اُسے غور سے دیکھا۔

اور ـــ وہ اپنی ساری تیزی بھول گئی۔ پلکیں گرنے اٹھنے لگیں۔

وہ محظوظ ہوئے بنا نہ رہ سکا۔

''اچھا مَیم صاحب۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''تم کھیر کھاؤ اور میں گھر چلتا ہوں، ہاں''۔ اُس نے اپنائیت سے اُس کا چہرے تھپتھپایا اور ـــ

کوریڈور کی طرف بڑھا۔

چند پل وہ اُسے جاتے دیکھتی رہی۔ پھر اپنے بول میں کھیر نکالی اور ـــ

اُسی کے متعلق سوچتی آہستہ آہستہ کھانے لگی۔

⁂——⁂



چند سال قبل یاور خان کے والد ڈاکٹر علی خان کا انتقال ہوا۔ تو انیسہ بیگم اپنی دونوں بیٹیوں نایاب اور شاداب سمیت کینیڈا سے کراچی چلی آئیں۔ وطن واپس آنے کا مقصد یہیں سیٹل ہونے کے علاوہ بیٹیوں کی شادیاں بھی مناسب جگہوں میں کروانے کا تھا۔ یاور خان بہنوں سے بڑا تھا۔ And was A Diplomat American Board in Surgery امیریکہ میں ہی جاب کر رہا تھا۔ مگر ماں بہنوں کی ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے وہ بھی جلدی ہی وائینڈ اَپ کر کے کراچی چلا آیا۔

بیٹیوں کو توقع کے مطابق اچھے بَر مل گئے۔ جلدی ہی اپنے گھروں کی اور پھر بچوں والی بھی ہو گئیں۔ یاور خان نے کچھ عرصہ کراچی میں جاب کی۔ پھر

یہاں اِس پرائیویٹ ہوسپٹل میں اچھی آفر ہوئی تو یہاں چلا آیا۔

آج ہی صبح دس بجے کی فلائیٹ سے وہ کراچی پہنچا۔ ایئرپورٹ سے باہر آیا۔ تو ڈرائیور کے ساتھ ساتھ امی بھی اُسے لینے آئیں موجود تھیں۔ اُسے دیکھ کر باغ باغ ہوگئیں۔

اِس بار وہ پورے چار ماہ بعد آیا تھا۔ یہاں موسم گرم تھا۔ ایئرکنڈیشنرز چلنے لگے تھے۔

نہادھو کر فریش ہوا۔ تو امی اور وہ دونوں وسیع وعریض خوبصورت لاؤنج میں آکر بیٹھ گئے۔

دنیا جہان کی گپ شپ ہونے لگی۔ نایاب اور شاداب کی، اُن کے بچوں کی، یاور خان کے چچا اور دونوں پھوپھیوں کی، پاس پڑوس کی اور ـــــ امی کی اُس دوست اور اُن کی بیٹی کی جس سے امی اُس کا رشتہ کروانا چاہتی تھیں۔

''بہت پیاری لڑکی ہے۔ تم دیکھو گے تو ضرور پسند آئے گی''۔

اور ـــــ یاور خان سوچ میں پڑ گیا۔

امی کو شندی کے بارے میں بتادے؟

No ـــــ وہ گھبرا گیا۔ امی نے ڈانٹ تو پلانی ہی تھی۔ پھر آتے ہی کیوں؟ رات کو تسلی سے ڈانٹ کھالیگا۔

''کیا بات ہے بیٹا؟'' امی نے یوں ہی پوچھ لیا۔

''کچھ نہیں ـــــ امی نایاب اور شاداب کس وقت آئیں گی؟ اُنہیں پتہ تو ہے نا میرے آنے کا۔'' وہ خوبصورتی سے بات ٹال گیا۔

''کیوں نہیں۔ میں نے رات ہی فون پر بتادیا تھا۔ شام تک آجائیں گی دونوں۔''

''پھر تو مزا آجائیگا''۔ وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔

دوپہر لنچ پر امی نے اُس کی پسند کے کھانے بنوائے تھے۔ مٹن پلاؤ،



کوفتے، بھنڈی گوشت، شامی کباب اور کھیر۔ اُسے پاکستانی کھانے بہت اچھے لگتے تھے۔ وہ جب بھی امیریکہ سے چھٹیوں میں امی کے پاس کینیڈا آتا تھا۔ تو خاص طور سے امی سے فرمائش کرتا تھا اِن کھانوں کی۔

دنوں بعد امی کے ہاتھ کا کھانا کھایا تھا۔ بہت اچھا لگا۔

دوپہر آرام کرنے کے لئے جو سویا۔ تو شاداب نے ہی آکر جگایا۔ نایاب اور شاداب کے بچے بھی آئے ہوئے تھے۔ واقعی مزا آگیا۔ عرصہ بعد بہن بھائی اکٹھے ہوئے تھے۔ خوب خوب گپ شپ ہوئی۔

رات ڈنر کے بعد بھی لاؤنج میں بیٹھے سبز چائے پیتے سب باتیں کرتے رہے۔ گیارہ بجے امی اٹھتے ہوئے نماز پڑھنے اور پھر آرام کرنے چلدیں۔ اور نایاب، شاداب اپنے اپنے بچوں کو سلانے۔

بچوں کو سلا چکیں تو دونوں بہنیں بھائی کے بیڈروم میں آدھمکیں۔ ایک بار پھر گپ شپ کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور ـــــ

یہیں یاور خان نے شندی کے بارے میں کچھ نایاب اور شاداب کے گوش گزار کردیا ـــــ کہ ـــــ

کس طرح ایک دن یاور خان کو اخبار کے ذریعے سے معلوم ہوا کہ فلاں فلاں علاقے کے جاگیردار عالمگیر حیدر اسلحے کی صفائی کرتے ہوئے گولی چل جانے سے انتقال کرگئے تھے۔ یاور خان اور اُس کی بہنوں کی شروع سے ہی بہت خواہش تھی۔ کہ پاکستان جاکر اپنے رشتہ دارں سے ملیں۔ رشتوں کی مٹھاس کیا ہوتی ہے؟ وہ دیکھنا چاہتے تھے مگر ـــــ

امی اور یاور خان نے جب بابا کے سائیڈ کے رشتہ داروں، چچا اور پھوپھیوں سے میل جول کی کوشش کی۔ تو وہ رسپانس نہیں ملا۔ جو ملنا چاہئے تھا۔ یک طرفہ کوشش زیادہ عرصہ نہ چل سکی۔ اپنی سبکی معلوم ہوئی تو یاور خان اور امی بھی خاموش ہوگئے۔

پھر خالو کے انتقال کا علم ہوا۔ تو اُس نے سوچا۔ اب کے ننھیال میں جائے۔ اُن کا رویہ کیسا تھا؟ وہ جاننا چاہتا تھا۔ گو اُسے معلوم تھا امی نے اپنے میکے سے کبھی کوئی تعلق نہیں رکھا تھا۔ بقول امی اُن کے والد نے دوسری شادی کر کے اُن کے ساتھ ناانصافی کی تھی۔ خالہ نفیسہ اُن کی سوتیلی بہن تھیں۔ امی کا کہنا تھا خالہ نے بہتیرا اُن سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر ـــ نانا نے جو اُن کی حق تلفی کی تھی۔ وہ بھول نہ پائی تھیں۔ اور اِسی وجہ سے اُنہوں نے کبھی بھی نہ نفیسہ خالہ کو کوئی رسپانس دیا۔ نا ہی اپنے سوتیلے بھائی سے کوئی رابطہ رکھا۔

پر ـــ اب چونکہ یہ موت کی بات تھی۔ اِس پر یقیناً امی برا نہ مانتیں۔

خالہ نفیسہ کی ایک بیٹی بھی تھی۔ سو ـــ اتنے بڑے سانحے کا پتہ چلا تو اُس نے سوچا یہی موقعہ تھا جا کر اپنی خالہ زاد سے تعزیت کر آئے۔ خالو کے بھائی جہانگیر حیدر کو بھی مل لے۔

مگر ـــ وہ حویلی پہنچا، جہانگیر حیدر کا پوچھا۔ تو حویلی کے اندر سے نواز آ گیا...

یاور خان نے بہنوں کو شروع سے لے کر آج تک کے تمام واقعات بتا دیئے۔

شندی کے حالات سن کر نایاب کی آنکھوں میں تو آنسو آ گئے۔

''اوہ۔ کیا چچا اور کیا ماموں ہیں۔ دونوں ہی بچاری کے دولت کے چکر میں تھے۔'' وہ انگلیوں سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

''تو ـــ آپ کو شندی پسند آ گئی ہے۔'' شاداب مسکراتے ہوئے بولی۔

''ہاں۔ بہت''۔ یاور خان نے کہا۔

''لیکن ـــ مجھے کچھ یاد پڑتا ہے کہ کچھ عرصہ پہلے آپ نے مجھ سے فون پر کسی ڈاکٹر نادیہ کا بھی ذکر کیا تھا۔'' شاداب اُسے چھیڑتے ہوئے بولی۔

وہ ہنس دیا۔ خوبصورتی سے۔



''تم نے خود پوچھا تھا۔ کہ کسی ڈاکٹر واکٹر کا چکر تو نہیں چل رہا۔ سو میں نے بتا دیا۔ میں نے اُس سے شادی کا بالکل نہیں کہا تھا۔''

''تو... شندی سے شادی کریں گے۔'' وہ پھر معنی خیز انداز میں بولی۔

''ہاں۔''

''کیوں؟''

''کیونکہ اُس میں ہر وہ بات ہے جو ایک اچھی بیوی میں ہونی چاہیئے۔''

''مثلاً؟''

''مثلاً فرمانبرداری ... گھر داری ...'' وہ بھی اُسے تنگ کرنے کو بات چبا چبا کر کہہ رہا تھا۔

''نوٹ کرتی جائیں باجی۔'' وہ بھی کم شریر نہ تھی۔

اور نایاب اور یاور خان بے اختیار ہنس دیئے۔

''اچھا تم یاور بھائی کو تنگ کرنا بند کرو۔ اور کام کی بات کرو۔'' نایاب نے کہا۔

''ٹھیک ہے''۔ وہ سنجیدہ ہو گئی۔ ''لیکن امی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے گا؟''

''بڑی بدتمیز ہو۔ امی کو پتہ چلا نا...''

''میں تو اُس خوبصورت سی کیوٹ سی سفید سفید لمبے لمبے بالوں والی بلی کی بات کر رہی ہوں...''

تینوں پھر ہنس دیئے۔

''ویسے ـــ آپ بات کر سکتی ہیں امی سے؟ خالہ نفیسہ کی بیٹی ... وہ بھی امی کے لاڈلے اکلوتے بیٹے کے لئے ...''

''ویسے ـــ اب تو زمانے گزر گئے ہیں۔ نہ چھوٹی نانی زندہ ہیں نہ خالہ نفیسہ۔ نا ہی خالو عالمگیر باقی رہے ہیں۔ لے دے کر ننھیال میں ایک شندی رہ گئی

ہے۔ ددھیال تو دیکھ ہی لیا...'' نایاب کہہ رہی تھی۔

''ننھیال میں صرف شندی نہیں۔ ایک ماموں بھی ہیں ہمارے۔ جو شندی کو زہر دے رہے تھے۔'' شاداب نے یاد دلایا۔

''باپ رہے۔ لیکن... شندی بچاری تو خود مظلوم ہے۔'' نایاب بولی۔

''بہت بے ضرر ہے''۔ یاور خان کے منہ سے نکلا۔

''بہت اِنوسنٹ ہے۔'' شاداب نے یاور خان کی [illegible] رو میں کہی چند لمحے پہلے کی بات دہرائی۔

اور ــــ شاداب کے ساتھ نایاب کو بھی موقعہ مل گیا۔

''بہت چارمنگ ہے''۔ اُس نے بھی یہ پوائنٹ نوٹ کیا تھا۔

''بہت چھوٹی ہے۔ ابھی ابھی اے لیولز کیا ہے''۔ شاداب نے کہا

''شٹ اَپ۔'' یاور خان نے دونوں کو چپ کرایا۔

''ہم آپ کی سفارش نہیں کریں گے۔'' شاداب ناراض ہوگئی۔

بس اب سیریس ہو جاؤ سب۔ سوچو کہ امی سے بات کیسے کریں گے۔ اُنہیں راضی کیسے کریں گے؟ نایاب نے سنجیدگی سے کہا۔

''یہ ہوئی نا بات''۔ یاور خان خوش ہوگیا۔ ''ویسے ــــ میرا خیال ہے جب میں واپس چلا جاؤں۔ تو تم لوگ امی سے بات کرو۔ ورنہ خواہ مخواہ میرا Stay خراب ہوگا۔''

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔ اب چلتے ہیں سوتے ہیں جا کر۔ یاور بھائی واپس چلے جائیں گے تو پھر امی سے بات کریں گے۔'' نایاب بولی۔

اور ــــ دونوں بہنیں یاور خان کو ''شب خیر'' کہتیں اپنے اپنے کمروں کی طرف ہولیں۔

✲ —— ✲



اُس کی فلائیٹ لیٹ تھی رات دیر سے گھر پہنچا تھا۔

ڈنر کے بعد سونے کے لئے بستر میں لیٹا تھا۔ تو دل بہت چاہا تھا شندی سے بات کرے۔ اُس سے پوچھے اُس سے تین دن بات کئے بغیر اُس کا وقت کیسے گزرا تھا؟ کتنا یاد کیا تھا اُسے؟

مگر ــــ رات کافی ہو چکی تھی۔ اُس کی نیند ڈسٹرب ہو جانی تھی۔ یہی سوچ کر اُس نے ارادہ بدل لیا تھا۔

آج ہفتہ تھا۔ اُس کا O.P.D تھا۔ مریض پر مریض چلے آ رہے تھے۔ موقعہ ہی نہیں مل رہا تھا۔ اُس سے بات کرنے کا۔

ایک بجے بریک ہوتے ہی وہ گھر کے لئے چل پڑا۔

بہت خوش تھا وہ۔ ایوننگ سیشن بھی نہیں تھا۔ کل چھٹی بھی تھی اور ___ شندی سے باتیں بھی تو کرنی تھیں۔

پھر ___ اُس نے سوچا۔ گھر پہنچنے کا ہی انتظار کیوں؟ اپنا سیل فون اٹھایا اور شندی کا نمبر ملالیا۔

بہت ساری نیوز ملیں اسے۔ اِن دنوں اُسے بہت تیز بخار ہوا تھا۔ ماما نے آنٹی نور جہاں کو بلوالیا تھا۔ وہ اپنی سی کوششیں کرتی رہیں۔ دو ایک ڈاکٹرز کو جو وہ جانتی تھیں۔ اُن میں سے ایک بھی دستیاب نہیں تھا۔ پھر اُنہیں ڈاکٹر نادیہ کا خیال آیا۔ یاور خان نے اُنہیں ایک دفعہ ہوسپٹل میں اُس سے ملوایا تھا۔ فون کر کے انہوں نے گاڑی بھجوا کر اُسے بلالیا۔ نادیہ نے اُس کا چیک اپ کیا، دوائیاں لکھ کر دیں۔ جن کے استعمال سے اب وہ کافی سنبھل گئی تھی۔ اور ___ وہ ڈاکٹر نادیہ کی بہت ممنون تھی وغیرہ...

شندی سے باتیں کر کے اُسے جیسے دنیا بھر کے خزانے مل گئے تھے۔ کتنا چاہتا تھا وہ اُسے!

اُس نے گاڑی بستی کی طرف موڑی۔ تو خیال آیا۔

نادیہ نے اُس دن کے بعد سے اُس سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ اُسے حیرت سی ہونے لگی۔ دونوں میں اس قدر تلخ کلامی کے بعد بھی وہ کیسے شندی کو دیکھنے آ گئی تھی؟

ایک ڈاکٹر ہونے کے ناطے شاید...

No way. اُس نے فوراً اپنے خیال کی نفی کی۔ وہ ایسا کوئی فرض، کوئی اصول نہیں جانتی تھی۔ شاید کیوریاسٹی لیکر آئی تھی۔ کہ وہ کون تھی؟ کیسے رہ رہی تھی؟ وغیرہ۔ اُس کی عادت تھی یہاں وہاں کی خبریں اکٹھا کرنے کی۔

موسم قدرے کھل گیا تھا۔ ہریالیوں میں سے جھانکتے خودرو پھل پھول نظروں کو بھلے لگ رہے تھے، بھیڑ بکریوں کے منے منے بچے یہاں وہاں چر رہے



تھے۔ ہاں ٹھنڈ اب بھی تھی، بادل اب بھی یہاں وہاں ڈیرہ جمائے تھے!

پھولوں، جھرنوں اور ہلکورے لیتی ہواؤں کی خوشبوئیں من میں سموتا وہ اپنے گیٹ کے پاس رک گیا۔

آج گیٹ حمید نے کھولا۔ وہ گاڑی اندر لے گیا۔

لاؤنج میں قدم رکھا ہی تھا کہ میوہ خان پاس آ گیا۔

''صاحب۔ بڑی بیگم صاحبہ تشریف لائی ہیں۔ پیچھے گیسٹ روم میں بیٹھی ہیں۔ آپ کو یاد کیا ہے۔'' پھر وہ اُس کے قدرے قریب ہوا۔ ''بہت غصے میں ہیں صاحب۔'' وہ آواز نیچی کر کے بولا۔

باپ رے ___ نایاب اور شاداب نے یقیناً بات پہنچا دی تھی مگر ___ اتنی جلدی؟ رات کو وہ پہنچا تھا اور صبح امی پہنچ گئیں!

'جل تُو جلال تُو' پڑھتا وہ گیسٹ روم میں آ گیا۔

''اُسے حویلی سے نکالتے نکالتے کوئی تمہیں گولی مار دیتا تو؟ ویسے تم وہاں گئے ہی کیوں تھے؟ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اُس کی نانی تمہاری ماں کی سوتیلی ماں تھی؟ اور اُس کی ماں تمہاری ماں کی سوتیلی بہن تھی؟ سوتیلے بھی کبھی اپنے ہوئے ہیں؟ اور پھر تمہارا خیال ہے کہ میں نفیسہ کی بیٹی سے تمہاری شادی کرادوں گی؟ یہ خیال ذہن سے نکال دو۔ میں تو حیران ہوں تم نے اُسے اُس کے گھر سے لا کر یہاں کیوں ڈال دیا ہے؟ مجھے نور جہاں پر حیرت ہے۔ ہم دونوں بچپن کی دوست ہیں۔ کیا وہ نہیں جانتی کہ میرا نفیسہ سے کیسا رشتہ ہے؟ اُس کی بیٹی کو اپنے یہاں پناہ دی ہی کیسے؟...''

انیسہ بیگم دیر تک دل کی بھڑاس نکالتی رہیں۔ یاور خان خاموشی سے سنتا رہا۔

پھر ___ اُس نے گہری سانس لی۔

''امی۔'' وہ وہیں کھڑے کھڑے اُن کی کرسی پر جھک آیا۔ ''اوپر بیڈ

روم میں چلیں۔ آپ تھکی ہوئی ہیں۔ اور یقیناً کچھ کھایا پیا بھی نہیں ہوگا۔''

اُسے پتہ تھا۔ امی کے دو Extremes تھے۔ پیار کرنے پر آتی تھیں تو شفقت کے خزانے لٹا دیتی تھیں۔ اور غصہ آجاتا تھا تو کھانا پینا بھی بھول جاتی تھیں۔

''جب سے نایاب نے بات بتائی ہے میں اپنے آپ کو بھی بھول گئی ہوں۔'' وہ غصے سے بولیں۔

''پلیز امی! اوپر چلیں۔ منہ ہاتھ دھو کر فریش ہوں''۔ اُس نے اُنہیں ہاتھ سے تھاما۔

اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ کمرے سے نکلتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف بڑھنے لگیں۔

یاور خان بھی پیچھے پیچھے چلا۔ وہ تو اُس کی توقع سے کہیں زیادہ ناراض تھیں۔ کیا بنے گا؟

وہ واش روم میں گئیں۔ تو یاور خان نیچے کچن میں آ گیا۔ لنچ تیار ہونے میں ابھی وقت تھا۔ امی کے لئے حمید نے کھانے میں مزید کچھ چیزیں شامل کر لی تھیں۔ جس کی وجہ سے دیر ہو رہی تھی۔ اُس نے حمید سے چائے اور سینڈوچز لانے کو کہا۔ اور واپس اوپر آ گیا۔ اپنے واش روم میں گیا۔ ہاتھ منہ دھوئے، کپڑے تبدیل کئے اور دوبارہ امی کے کمرے میں آ گیا۔

چائے آ گئی تو یاور خان امی کو سرو کرنے لگا۔

''دیکھو بیٹا۔'' امی چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے گویا ہوئیں۔ سوتیلے کبھی اپنے نہیں ہوتے۔ تم باہر پیدا ہوئے، وہیں پلے بڑھے۔ میں جانتی ہوں تمہاری خواہش ہوگی کہ اپنوں سے ملو جلو۔ اپنے گاؤں، ددھیال، ننھیال گھومو پھرو مگر... یہ سب دور سے اچھے لگتے ہیں۔ پاس جاؤ تو سوائے مایوسی کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ تم نے دیکھ لیا اپنے چچا، پھوپھیوں اور اُن کی اولاد کا رویہ۔ کتنی بار



ہم گئے۔ مگر سوائے نایاب کی شادی میں شرکت کے اُنہیں شاداب کی شادی تک میں آنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ پھر نایاب بتا رہی تھی کہ شاندانہ کو اپنا ماموں Slow poison کر رہا تھا۔ اپنا چچا دولت ہتھیانے کے چکر میں مار پیٹ کر اپنے پہلے سے شادی شدہ بیٹے سے بیاہنے کی فکر میں تھا۔ تو جب سگوں کا یہ حال ہے تو سوتیلوں سے کیا توقع کی جا سکتی ہے؟ یہ تو بھلا ہو میری نانی کا کہ وہ مجھے فوراً اپنے پاس لے آئیں ورنہ جانے کیا حشر کرتے سوتیلے میرا...''

امی کے ذہن پر سگے اور سوتیلے کا اس قدر خوف سوار تھا۔ کہ بھول ہی گئی تھیں کہ سوکنیں تو کب کی خاک میں مل چکی تھیں۔ اُن کی بہن بھی اب اِس دنیا میں نہیں رہی تھی۔ اور پھر___

شندی کے ساتھ سگوں نے کیا کیا تھا؟

یہ رشتے بھی عجیب ہوتے ہیں۔ کچھ بھی وثوق سے نہیں کیا جا سکتا اِن کے بارے میں!

اچھے رشتے شاید وہی ہوتے ہیں جو خلوص اور محبت سے جنم لیں اور بس۔ پھر چاہے وہ اپنوں میں ہوں چاہے غیروں میں۔ سگوں میں ہوں چاہے سوتیلوں میں!

امی دیر تک اُسے سمجھاتی رہیں۔ دنیا کی اونچ نیچ۔ خاص طور سے سوتیلے رشتوں سے باز رہنے پر زور دیتی رہیں۔

وہ سنتا گیا۔ چپ چاپ۔ کہ اُن سے خود شندی کی سفارش کرنا جلتی پر تیل کا کام کرنا تھا۔

وہ سب کہہ چکیں۔ تو اُس نے گہری سانس لی۔ اپنا خالی کپ میز پر رکھا۔

''امی کل پکنک پر جائیں گے۔ بہت خوبصورت spots ہیں یہاں۔ کراچی سے تو لوگ پہاڑ پر آنے کو ترستے ہیں۔''

اتنی سیریس باتوں کے جواب میں یاور خان کی بات پر نہ چاہتے ہوئے

بھی انیسہ بیگم مسکرا دیں۔ اُس پر بہت سارا پیار آ گیا۔ اُس کا سر دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے اُسے ماتھے پر بوسہ دیا۔

''میری جان۔ میں جو کچھ بھی کہہ رہی ہوں تمہارے بھلے کے لئے کہہ رہی ہوں۔'' وہ شفقت سے بولیں۔

''مجھے پتہ ہے امی۔''

''اُس کی سوچوں میں پڑ کر خود کو ہلکان مت کرو۔ نکال دو اُس کا خیال ذہن سے۔'' وہ مزید بولیں۔

یاور خان دہل سا گیا۔ کیسے اُس کا خیال ذہن سے نکال دے؟ وہ تو اتنا آگے نکل چکا تھا اُس کے پیار میں۔ کہ پیچھے ہٹنا ممکن ہی نہ رہا تھا۔

''امی۔ آنٹی نور جہاں آپ کا بہت پوچھتی رہتی ہیں۔'' اُس نے بات بدلنے کی خاطر کہا۔

''ارے ہاں۔ رات ڈنر پر بلایا ہے نور جہاں نے مجھے اور تمہیں''۔ اُنہیں اچانک یاد آیا۔

''اچھا۔'' موضوع بدلا تو وہ ریلیکس محسوس کرنے لگا۔ ''اُنہیں کیسے پتہ چلا کہ آپ آئی ہیں۔''

''میں نے کراچی سے فون کیا تھا اُسے''۔

اوہ___ تو اُس کے ساتھ ساتھ امی سب کی خبر لینے آئی تھیں!

رات ڈنر کے بعد انیسہ بیگم نے نور جہاں کو سب بتا دیا۔ کہ یاور خان کراچی کس مقصد سے آیا تھا۔ اُن کو تو یاور خان نے سب سے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ شاندانہ کون تھی اور کس طرح وہ اُسے اُن لوگوں سے بچا کر یہاں لایا تھا۔ ہاں یہ ذکر کبھی نہیں کیا تھا۔ کہ خود بھی اُس میں دلچسپی لیتا تھا۔ تبھی تو وہ ابراہیم کی بات شندی کے کان میں ڈالنے خاص طور سے اُس کے پاس گئی تھیں۔ بہرحال___



''انیسہ۔'' نور جہاں بانو بولیں۔ ''تمہارا یہ کہنا کہ یاور وہاں گیا ہی کیوں؟ تو چلو لڑکا ہے۔ مدتوں بعد اپنے وطن لوٹا تھا۔ رشتوں کی پیاس اُسے وہاں لے گئی۔ اور پھر موت پر تو میں کہتی ہوں تمہیں بھی وہاں جانا چاہئے تھا۔ ہر تلخی بھلا کر۔ رہی یہ بات کہ شاندانہ کے جھگڑے میں کیوں ہاتھ ڈالا؟ تو میرا خیال ہے یاور نے بڑے ثواب کا کام کیا ہے۔ ایک بے بس اور لاچار لڑکی کو موت کے منہ سے بچا لایا ہے۔ یاور کو معلوم تھا کہ اُسے زہر دیا جا رہا ہے تو وہ اُسے مرنے دیتا کہ وہ اُس کی اپنی خالہ زاد نہیں تھی۔ سوتیلی تھی۔ کمال کرتی ہو تم بھی انیسہ۔ میں تمہیں شروع میں ہی کافی سمجھا چکی ہوں کہ اگر تمہارے والد نے دوسری شادی کی تھی تو اُس وقت تمہاری والدہ تو حیات نہیں تھیں۔ بقول تمہارے اُنہوں نے شادی تمہارے لئے نہیں اپنی خوشی کے لئے کی تھی۔ تو بھی پہلے نہ سہی اب تو تمہیں اتنی عقل ہے کہ سوچ سکو کہ اُس وقت اُن کی عمر صرف بتیس، تینتیس سال تھی۔ تو اگر انہوں نے دوسری شادی کر لی تو کون سا جرم کر لیا۔ تمہاری والدہ کی زندگی میں ایسا کرتے تب الگ بات تھی۔ تب ضرور دکھ ہوتا۔ تم پتہ نہیں کیوں اُسی بات کو لئے بیٹھی ہو۔ والد تک سے تعلق توڑ دیا تھا۔ اب بس کرو۔ جو ہوا سو ہوا۔ پرانی باتیں بھول جاؤ۔ خود کو خواہ مخواہ پریشانی میں مبتلا رکھتی ہو...''

''لیکن اب یہ بھی تو نہیں کر سکتی نا کہ بیٹے کی شادی نفیسہ کی بیٹی سے کر دوں''۔

''اگر یاور کی خواہش ہے تو میرا خیال ہے اتنی بُری بات بھی نہیں ہے۔ آخر تو دونوں کی رگوں میں ایک ہی نانا کا خون دوڑ رہا ہے...'' انہوں نے اب بھی یاور خان کی حمایت کی۔ اپنی خواہش دل میں ہی دبا دی کہ پہلا حق یاور خان کا ہی بنتا تھا۔

انیسہ بیگم جز بز سی بیٹھی تھیں۔

''اور پھر تم اُس لڑکی کو دیکھو پرکھو۔ تو حیران رہ جاؤ کہ آج کے زمانے

میں پوری جاگیر، بے شمار املاک کی اکیلی مالک لڑکی میں اتنی خاکساری ہے، اتنی شرم وحیا ہے، نماز روزے کی پابندی ہے کہ یقین نہیں آتا۔ اِس کے status کی لڑکیاں تو رائیڈنگ کرتی ہیں، سوئمنگ کرتی ہیں، بوائے فرینڈز رکھنے میں کوئی عار نہیں سمجھتیں۔ میری مانو تو ضد چھوڑ دو۔ اپنالو اسے۔ بے سہارا ہے۔ تمہارا خون ہے...''

مگر—— انیسہ بیگم نے بات ہی بدل دی۔ دوسری باتیں کرنے لگیں۔ عرصہ بعد دونوں دوست ملی تھیں۔ بہتیری اور باتیں تھیں کرنے کو۔ رات گئے تک گپ شپ کرتی رہیں۔ پھر ماں بیٹے نے اجازت لی اور گھر چلے آئے۔

''انیسہ بیگم رات کے کپڑے بدل کر بستر پر لیٹ گئیں۔ یاور خان ضروری کاموں سے فارغ ہوا تو انیسہ بیگم کے کمرے میں جھانکا۔ جاگ رہی تھیں وہ اب بھی۔ یاور خان پاس آ کر اُن کے پاؤں کی طرف بیٹھ گیا۔ آہستہ آہستہ اُس کے پاؤں دبانے لگا۔

''تھکی ہوئی ہوں پر نیند نہیں آ رہی''۔ انیسہ بیگم بولیں۔

''آپ ٹینشن مت لیا کریں نا امی۔ ریلیکس ہوں پلیز!''

''خاک ریلیکس ہوں۔'' وہ اچانک تیزی سے بولیں۔ ''اور نور جہاں کو دیکھو۔ کتنی آسانی سے قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اُس پر آتی تو میں دیکھتی کہ کیا کرتی ہے۔ دوسروں کو سمجھانا بڑا آسان ہوتا ہے۔'' وہ سخت ناراض لگ رہی تھیں۔

یاور خان مجرم سا بنا اُن کے پاؤں دباتا رہا۔

''اچھا ہے آپ آ گئی ہیں۔ کل سنڈے ہے۔ پرسوں آپ کا کمپلیٹ چیک اَپ کروالوں گا۔'' وہ قدرے توقف کے بعد بولا۔

''میں واپس جا رہی ہوں کل''۔ وہ ہنوز ناراض تھیں۔

''بالکل نہیں۔ آپ ہفتہ دس دن کم از کم میرے پاس رہیں گی''۔



''اور تم نے اِس لڑکی کو لا کر اپنے پہلو سے کیوں لگا رکھا ہے؟ وہ تو نور جہاں سے دور تمہارے احاطے میں گھسی ہوئی ہے۔'' وہ اُس کی اَن سنی کرتے ہوئے بولیں۔

نادیہ نے بھی ایک بار یہی کہا تھا۔ اُسے ہنسی آ گئی۔

''امی اینکسی اِسی طرح بنی ہوئی ہے۔'' اُس نے قدرے ہمت کی۔

''چپ کرو۔'' اُنہوں نے دیکھا۔ یاور خان نے اِس تمام دوران ایک بار بھی شندی کو چھوڑ دینے کا اشارہ نہیں دیا تھا۔ ڈٹا ہوا تھا جیسے اپنی بات پر، چپ چاپ۔ اُنہیں اور بھی غصہ آ گیا۔

پھر—— بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھے جگ میں سے گلاس میں پانی ڈالتے ہوئے گھونٹ بھرا۔

''وہ... تم نے بہنوں سے کسی لیڈی ڈاکٹر کا بھی ذکر کیا تھا شاید''۔ اُن کا اشارہ ڈاکٹر نادیہ کی طرف تھا۔ شندی سے تو وہ اچھی تھی!

''میں نے ذکر کیا تھا۔ لیکن شادی کے خیال سے نہیں۔ اُس کے اور میرے مزاج میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اور پھر میں کسی ڈاکٹر سے شادی کروں گا بھی نہیں۔ میاں بیوی دونوں صبح سے رات تک گھر سے باہر ہوں۔ تو گھر سرائے بن کر رہ جاتا ہے۔ آیاؤں کی گود میں پل کر بچے سائیکو کیس بن جاتے ہیں۔ میں کسی گھریلو لڑکی سے شادی کروں گا۔ جو گھر اور بچوں کا خیال رکھ سکے...''

''اِسی لئے تو فاخرہ کی بیٹی کا سوچا ہے میں نے۔'' اُنہوں نے اپنی دوست کا نام لیا۔ ''اور میں آخری بار کہہ رہی ہوں۔ نفیسہ کی بیٹی کا خیال چھوڑ دو۔ ایسا کچھ نہیں ہونے والا۔''

اور—— یاور خان دم بخود رہ گیا۔ کیسے اُس کا خیال چھوڑ دے؟

چند پل دونوں طرف خاموشی چھائی رہی۔ انیسہ بیگم نے خالی گلاس واپس سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

"آپ نے اپنی دوائیاں لی ہیں؟" وہ اٹھتے ہوئے اُن کے سرہانے آ گیا۔ وہیں بیڈ سائیڈ ٹیبل پر اُن کی بلڈ پریشر کی دوائیاں رکھی تھیں۔

"ہاں لے لی ہیں"۔ اُن کے لہجے میں اب بھی تناؤ تھا۔ "اب تم سو جاؤ جا کر"۔

"خاک سو جاؤں جا کر"۔ اُس نے بالکل اُن ہی کے کچھ دیر پہلے کے انداز میں کہا۔ "آپ خفا ہیں تو مجھے نیند آ جائے گی"۔

وہ پہلی بار پسیج گئیں۔ اُسے اپنی نقل اتارتے دیکھ کر اُنہیں ہنسی آ گئی۔ آخر تو ماں تھیں!

"جا میرا بچہ سو جا اب۔" اُنہوں نے شفقت سے کہا۔ "ماں بھی کبھی بچوں سے خفا ہو سکتی ہے"۔

اور ـــ قدرے مطمئن ہوتے ہوئے اُنہیں 'شب بخیر' کہکر وہ اپنے بیڈ روم میں آ گیا۔

بستر میں لیٹا تو جسم کے ساتھ ذہن بھی بہت تھکا تھکا محسوس ہوا۔

گہری سانس لیتے ہوئے اُس نے گھڑی پر نگاہ کی۔ بارہ بج چکے تھے۔ خاصی دیر تھی۔ پھر بھی اُس کا ہاتھ فون پر گیا۔

"یاور بول رہا ہوں۔" اُس نے شندی سے کہا۔

"جی۔ کیسے ہیں آپ؟" اُس کی آواز میں نیند کا خمار تھا۔

"جگا دیا نا میں نے۔ سوری شندی۔ لیکن میں بہت Exhausted فیل کر رہا تھا۔ فزیکلی بھی، مینٹلی بھی، سوچا تم سے بات کر لوں گا۔ تو ریلیکس ہو جاؤں گا۔"

وہ مسکرا دی۔ خاموشی سے۔

پھر دونوں باتیں کرنے لگے۔ یاور خان نے اُسے بتایا کہ کس طرح کراچی جا کر اُس نے اپنی بہنوں سے بات کی۔ اور اب وہ امی سے بات کریں

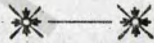


گی وغیرہ۔ مگر یہ نہیں بتایا کہ امی کو وہ لوگ بتا بھی چکی ہیں اور امی اُس کی اچھی خبر لینے خود بہ نفس نفیس یہاں پہنچ بھی چکی ہیں۔ رات تھی۔ وہ اُسے ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اور پھر ـــ اُسے زیادہ بتاتا بھی کیا؟ اُس کے پاس کوئی اچھی خبر تو تھی نہیں۔ اُس کی آواز سن لی۔ یہی بہت تھا۔

"اچھا اب سو جاؤ۔ Love you۔ گڈ نائیٹ۔"

"Love you too گڈ نائیٹ۔"

وہ مسکرا دی۔ پہلے نیند سے جگایا۔ اب کہہ رہا تھا۔ سو جاؤ۔ نیند کی جگہ تو اُس نے لے لی تھی۔ اُس کو آنکھوں میں سموتے ہوئے اُس نے ہولے سے پلکیں بند کر لیں۔ دیر تک اُسی کو سوچتی رہی۔



یاور خان کے کہنے پر انیسہ بیگم رک گئی تھیں۔ اُس میں تو اُن کی جان تھی۔ اُس کا کہنا کہاں رد کر سکتی تھیں۔ اگر اُسے شندی سے روک رہی تھیں تو اُس کے ہی بھلے کے لئے کر رہی تھیں۔

دن کے بارہ بج رہے تھے۔ صبح سے وہ یاور خان کے ساتھ ہوسپٹل گئی ہوئی تھیں۔ اپنا چیک اَپ کروانے۔ ابھی ابھی میوہ خان اُنہیں گھر لیکر آیا تھا۔ گاڑی سے اترتے ہوئے وہ کچن کے راستے اندر آ گئیں۔ حمید کو چائے بنانے کا کہا۔ اور خود لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئیں۔

انیسہ بیگم پانچ سال کی تھی جب اُن کی والدہ انتقال ہو گیا تھا۔ اُن کے والد نے اُن کی دیکھ بھال کے لئے دوسری شادی کر لی تھی۔ مگر اُن کی نانی اُنہیں



شادی کے اگلے ہی دن اپنے گھر لے آئیں۔ کہ بقول اُن کے وہ سوتیلی ماں کا سایہ بھی اُن پر پڑنے نہیں دینا چاہتی تھیں۔ اُن کی نانی کے مطابق اُن کے ابا جان نے دوسری شادی اُن کی دیکھ بھال کے لئے نہیں بلکہ اپنی عیاشی کے لئے کی تھی۔

''سوتیلی ماں چڑیل ہوتی ہے۔ وہ تمہارے باپ کو بھی اپنے قبضے میں کر لے گی۔ اور تمہیں بھی نوکرانی بنا کر مارا پیٹا کرے گی۔'' نانو اُن سے کہا کرتی تھیں۔

انہوں نے انیسہ بیگم کو ارد گرد کی کئی مثالیں بھی دی تھیں۔ کہ کیسے فلاں کو سوتیلی ماں کنوئیں میں الٹا لٹکایا کرتی تھی۔ کیسے فلاں کی زبان پر سوتیلی ماں نے جلتے کوئلے رکھ دیئے تھے وغیرہ...

یہ سن کر وہ دہل جاتی تھیں۔ تب سے ہی اُن کو اپنے ابا جان ایک جلاد لگتے تھے اور سوتیلی ماں ایک خوفناک چڑیل۔

سال بھر بعد ہی نفیسہ بیگم پیدا ہوئیں۔ تو اُنہیں لگا اُن کی بدترین دشمن آ گئی تھیں دنیا میں۔ جنہوں نے اُن سے اُن کا باپ اور گھر بار سب چھین لیا تھا۔

یہ باتیں اُن کے ناپختہ ذہن میں کچھ اس طرح گھر کر گئی تھیں۔ کہ ابا جان کی لاکھ کوششوں کے باوجود وہ یہ زہر اُن کے دل سے نکال نہیں پائے تھے۔

نفیسہ بیگم نے ہوش سنبھالا تو بڑی بہن سے جا کر ملنے کی خواہش بیدار ہوئی جسے انیسہ بیگم نے سختی سے رد کر دیا۔ انیسہ بیگم جوان ہوئیں، ڈاکٹر علی خان کے ساتھ شادی کے بعد کینیڈا گئیں۔ تو نفیسہ بیگم نے خطوط کا سہارا لیا۔ پہلے ہی خط پر اُنہیں اس قدر برا بھلا کہا گیا کہ کچھ عرصے کے لئے وہ خاموش ہو گئیں۔ مگر بھانجے کی پیدائش کا علم ہوا تو رہا نہ گیا۔ ایک بار پھر مبارکباد کا خط بھیج دیا۔ جس پر انیسہ بیگم نے آخری بار متنبہ کیا کہ وہ اپنے باپ، سوتیلی ماں اور سوتیلے بہن بھائی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتیں۔ اِس لئے آئندہ اُن سے کوئی رابطہ نہ کیا

جائے۔اُس کے بعد نفیسہ بیگم خاموش ہوگئی تھیں۔اور انیسہ بیگم سکون سے رہنے لگی تھیں۔

پھر۔۔۔ پلک جھپکنے میں بچے جوان ہوگئے۔یاور خان U.S.M.L.E. کے لئے امریکہ چلا گیا۔اور انیسہ بیگم اور علی خان، نایاب، شاداب سمیت کینیڈا میں ہی اپنی دنیا بسائے رہے۔ ماہ وسال گزر رہے تھے کہ اچانک علی خان کو ہارٹ اٹیک ہوا۔اور پہلے ہی اٹیک میں چل بسے۔

انیسہ بیگم وطن واپس لوٹ آئیں۔اپنے سسرالی شہر کراچی میں قیام پذیر ہوگئیں۔ بیٹیاں وہیں اپنے گھر بار کی ہوگئیں اور یاور خان کو اس شہر سے جاب کی آفر ہوئی۔تو وہ اِس بستی میں چلا آیا مگر۔۔۔

اُنہیں کیا معلوم تھا کہ یہاں اُس کی مڈبھیڑ نفیسہ کی بیٹی سے ہوگی۔ وہ رشتوں کا اتنا پیاسا ہوگا کہ سگے اور سوتیلے میں فرق نہ کرسکے گا۔ یہ اندازہ نہیں تھا اُنہیں!

ماضی میں گم وہ کھڑکی کے اُس پار خلاؤں میں تک رہی تھیں۔حمید نے کچن کا دروازہ کھولا۔تو کراکری اور کٹلری کی کھنک سے اُن کی سوچوں کا تانا بانا ٹوٹ گیا۔

حمید نے اُن کے آگے میز پر چائے لگائی۔اُنہوں نے تھرمس سے گرم گرم چائے کپ میں ڈالی۔اور گھونٹ بھرتے ہوئے ایک بار پھر سوچنے لگیں۔۔۔

کس طرح یاور خان کو شندی سے چھٹکارا دلائیں؟

رات بھر بھی اِسی سوال نے اُنہیں چین نہیں لینے دیا تھا۔

کیا کریں؟

ذہن ماؤف ہوا جارہا تھا کہ یکایک اُنہیں شاداب کی بات یاد آگئی۔

'یاور بھائی کہتے تھے۔جلدی کرو ورنہ آنٹی نور جہاں اپنے بیٹے ابراہیم کے لئے تیار بیٹھی ہیں۔'



تبھی۔۔۔ اُنہوں نے فیصلہ کرلیا۔وہ نور جہاں بانو سے بات کریں گی۔ شاندانہ اُنہیں پسند تھی۔ ابراہیم بھی اچھا خاندانی اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکا تھا۔عام حالات میں تو شاید عالمگیر حیدر اپنی بیٹی کا ہاتھ اُس کو نہ تھماتے۔ کہ وہ ایک عام انجینئر تھا۔لیکن اس وقت حالات پلٹا کھا چکے تھے۔ اُسے ایک اچھے مرد کے سہارے کی ضرورت تھی اور بس۔لہٰذا ابراہیم میں بھی کوئی کمی نہیں تھی۔اور پھر نور جہان بانو کی خواہش بھی یہی تھی۔

سوچتے سوچتے ہی اُنہوں نے قریب رکھے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

پھر۔۔۔ وہ چائے بھی پیتی جارہی تھیں اور نور جہان بانو کے ساتھ گپ شپ بھی کرتی جارہی تھیں۔ آخر میں اُنہیں اپنے دل کی بات کہنے شام پانچ بجے اپنے یہاں چائے پر مدعو کرتے ہوئے اُنہوں نے فون بند کردیا۔

سر صوفے کی پشت سے ٹکاتے ہوئے وہ چوڑی خوبصورت کھڑکی میں سے باہر گھنی ہریالیوں کو دیکھنے لگیں۔ ڈیڑھ بج چکا تھا۔یاور خان نے لنچ اُن ہی کے ساتھ کرنے کا کہا تھا۔بس پہنچنے ہی والا تھا۔

لنچ پر یاور خان کے پسندیدہ بلیک پیپر چکن اور ایگ فرائیڈ رائیس تھے۔ انیسہ بیگم کے لئے الگ اُبلی ہوئی سبزی بھی تھی۔ دونوں اِدھر اُدھر کی باتوں کے دوران کھانا کھا رہے تھے۔یاور خان آن گارڈ سا تھا۔مبادا امی کا دھیان شندی کی طرف جائے اور پھر اُسے آڑے ہاتھوں لیں مگر ایسا نہیں ہوا۔

وہ تو کسی اور ہی سوچ میں گم تھیں۔شندی کو ابراہیم سے بیاہ کر یاور خان کا اُس سے پیچھا چھڑانے کی!

شام ٹھیک پانچ بجے نور جہاں بانو آ گئیں۔ کچن کے باہر ڈھلتی دھوپ میں گھاس پر کرسیاں ڈلوا کر دونوں بیٹھ گئیں۔ وہیں کئی لوازمات کے ساتھ چائے آ گئی۔ جنت نظاروں سے لطف اندوز ہوتیں گپ شپ کرتیں وہ چائے پینے لگیں۔

"ابراہیم کے لئے کوئی لڑکی ہے نظر میں کیا؟" وہ جلدی ہی اپنے مطلب پر آگئیں کہ پونے سات، سات بجے تک یاور خان نے بھی آجانا تھا۔

نور جہاں بانو مسکرادیں۔

"تم برا نہ مانو تو ایک بات کہوں"۔

"کہو۔ میں کیوں برا مانوں گی"۔

"تمہیں پتہ ہے جب تک مجھے یاور کا پتہ نہیں تھا میں شاندانہ کو ابراہیم کے لئے پسند کیے بیٹھی تھی"۔

"تو اب کیا ہو گیا ہے۔ شاندانہ کہیں گئی تو نہیں"۔

"نہیں۔ اب تو یاور کی بات بیچ میں آگئی ہے۔"

"خواہ مخواہ یاور کی بات آگئی ہے۔ میں اُس کی شادی اُس سے کرواؤں گی تو ہو گی نا۔"

"کہیں... یاور کو جو وہ پسند ہے"۔

"اُس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کچھ دن پہلے اُس کی ڈاکٹر نادیہ کے ساتھ گپ شپ تھی۔"

"پھر؟" وہ قدرے چونکتے ہوئے بولیں۔ ڈاکٹر نادیہ کو تو وہ جانتی تھیں

"چھوڑ چھاڑ دیا اور کیا۔"

"اچھا"۔

"ہاں"۔ وہ مسکرائیں۔ "تم ایسا کرو۔ ابراہیم کے انگلینڈ واپس جانے سے پہلے پہلے اُس کی منگنی شاندانہ سے کرادو..."

"اِس سے زیادہ اور خوشی کی بات کیا ہو گی لیکن یاور..."

"پھر یاور۔ سچ پوچھو نور جہاں تو یاور کو شاندانہ سے بچانے کا بس یہی ایک راستہ ہے۔ اگر تمہیں شاندانہ پسند ہی ہے تو مجھ پر یہ احسان ضرور کردو۔ میرا بچہ میرے دشمنوں سے بچ جائے گا۔" اُن کے لہجے میں التجا تھی۔



"لیکن یاور سے بھی تو بات کرلیں"۔

"یاور سے بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ دو ہفتے کے لئے لنڈن جانے والا ہے۔ بس اُنہی دنوں میں یہ کام کرلو۔"

"لیکن یاور..."

"بھول بھال جائے گا چند دنوں میں۔ جیسے ڈاکٹر نادیہ کو بھول گیا ہے۔ جیسے پڑھائی کے دوران ایک امیریکن لڑکی کو بھول گیا تھا۔"

"اچھا"۔ نور جہاں بانو خوشگواری سے ہنس دیں۔

اندھے کو کیا چاہئے دو آنکھیں۔ نور جہاں بانو کا بھی کچھ یہی حال تھا۔ شاندانہ صورت اور سیرت سے تو مالا مال تھی ہی۔ مگر نور جہاں بانو اُس کے املاک سے بھی متاثر تھیں۔ اُن کا بیٹا بیٹھے بٹھائے جاگیردار بن جاتا تو اِس میں کوئی حرج تو نہیں تھا!

اور پھر___ اُنہوں نے اپنی سی کوشش تو کر دیکھی تھی۔ انیسہ بیگم کو شاندانہ کے حق میں قائل کرنے کی، اب جب وہ خود ہی اُسے راستے سے ہٹانے کی فکر میں تھیں۔ تو کسی اور کے بجائے خود اُن کا ابراہیم شاندانہ کے ساتھ ساتھ اتنی ساری خوبیوں کو کیوں نہ سمیٹ لے۔ دہلیز پر آئی نعمتوں کو ٹھکرانا کفرانِ نعمت ہی تھا!

شروع میں جج صاحب بھی کہہ رہے تھے کہ کسی بھی قانونی چارہ جوئی سے پہلے شاندانہ کی شادی کسی اچھی جگہ ہو جاتی۔ تو بہت سے مسائل خود بخود حل ہو جاتے۔ اور وہ اِس عمر میں کورٹ کچہری اور بے حد فعال میڈیا میں کیچڑ اچھلنے سے بچ جاتی۔ جس میں کہ حویلی سے اُس کی کسی گارڈ کے ساتھ رات گئے فرار ہونے کا ذکر آنا تھا۔ آج تک اُس کے ساتھ غائب رہنے کا چرچا ہونا تھا۔ اور کورٹ میں جو غیر اخلاقی سوالات ہونے تھے وہ الگ۔ مگر بقول جج صاحب کے شادی بھی تو کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہوتا۔ سوچ سمجھ کر ہی قدم اٹھانا پڑتا ہے۔ یاور خان اُس کا

خالہ زاد تھا۔ اُس سے شادی کر لیتا تو اچھا تھا۔ اِس پر جب نور جہاں بانو نے کہا تھا۔ کہ انیسہ بیگم کبھی ایسا نہیں ہونے دیں گی۔ مزید کہ اِس سلسلے میں جج صاحب کا اپنے ابراہیم کے بارے میں کیا خیال تھا؟ تو اُنہوں نے کہا تھا۔ ابراہیم کے لئے شاندانہ جیسی لڑکی کو پا کر وہ خود کو خوش قسمت سمجھیں گے...

''کیا سوچ رہی ہو؟''

''کچھ نہیں۔ بس سوچ رہی تھی کہ شاندانہ کا کیا ہوگا؟ وہ بھی تو یاور کی پسند سے واقف ہوگی''۔ سوچوں سے ابھرتے ہوئے اُنہوں نے بات بنائی۔

''اول تو بات ابھی اتنی دور گئی نہیں۔ اور اگر کچھ بھنک پڑی بھی ہو شاندانہ کو تو وہ میں ٹھیک کر لوں گی سب۔'' انیسہ بیگم اپنے بیٹے کو اپنی سوتیلی بہن کی بیٹی سے بچانے کے لئے کچھ بھی کرنے کو تیار تھیں۔

یوں دونوں سہیلیاں دیر تک آئندہ کی پلاننگ کرتی رہیں۔ یاور خان کو فی الحال کوئی خبر نہیں ہونی چاہئے۔ جج صاحب کو یاور خان کی پسند کا بالکل نہیں بتانا چاہئے۔ باقی کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہئے۔ وغیرہ وغیرہ۔

تبھی ـــ یاور خان کی گاڑی موڑ کاٹتی سامنے آتی دکھائی دی۔

دونوں دوستوں نے باتوں کا موضوع بدل دیا۔ یاور خان گاڑی گیراج کے آگے روکتے ہوئے وہیں آ گیا۔ تھوڑی دیر اُن کے پاس بیٹھا باتیں کرتا رہا، چائے پی، اور پھر معذرت کرتا اوپر اپنے بیڈروم میں ریسٹ کرنے آ گیا۔

اُس کی شاید آنکھ لگ گئی تھی۔ لینڈ لائن پر کال آئی تو نیند کھل گئی۔

ہوسپٹل سے کال تھی۔ اُس کے آج ہی آپریشن کردہ مریض کے متعلق نرس نے اُسے کونٹیکٹ کیا تھا۔ اُس نے پیشنٹ کا حال دریافت کیا۔ کچھ ضروری انسٹرکشنز دیں اور فون بند کر دیا۔

بستر سے اٹھتے ہوئے اُس نے بالکنی کے پردے ہٹائے۔ نیچے وادی میں، قد آور درختوں میں، رات کی تاریکیاں اتر آئی تھیں۔ آکاش پر تاروں



کے چراغ، دھرتی پر دیپ جل اٹھے تھے۔

ہمیشہ کی طرح مسحور ہوتے ہوئے اُس نے پردے دوبارہ برابر کر دیئے۔ گھڑی کی جانب دیکھا۔ نو بجنے کو تھے۔ وہ امی کی طرف آ گیا۔

''امی۔ میں اپنے ایک کولیگ کے پاس جا رہا ہوں۔ دیر ہو گئی تو آپ کھانا کھا لیجئے گا۔ میں واپس آ کر کھا لوں گا''۔

''نہیں بیٹا۔ میں انتظار کروں گی۔ تم زیادہ دیر مت کرنا۔ راستے محفوظ نہیں ہوتے آج کل۔''

''جلدی آ جاؤں گا امی۔ آپ فکر مت کریں۔ میں تیار ہوتا ہوں جا کر''۔

''جاؤ بیٹا۔ اللہ حافظ''۔

''وہ کہیں اور نہیں جا رہا تھا۔ شندی کے پاس جا رہا تھا۔ کراچی سے آنے کے بعد اُسے دیکھا جو نہیں تھا۔

ڈارک بلو قیمتی سوٹ میں وہ بہت سٹننگ لگ رہا تھا۔ نیچے اترتے ہوئے وہ گاڑی میں چلدیا۔ کہ مبادا پیدل جائے تو امی کو شک پڑ جائے۔

موڑ کاٹتے ہوئے اُس نے روڈ پر عین شندی کی بالکنی کے نیچے گاڑی کھڑی کر دی۔ ڈھلان چڑھتا اوپر آیا۔ اور پچھلے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔

شندی نے ہی دروازہ کھولا تھا۔ کئی دن بعد یاور خان کو دیکھا تھا۔ چہرے پر حیا کی لالی دوڑ گئی۔ سیاہ جھالریں پلکیں گرنے اٹھنے لگیں۔

اُس نے آہستہ سے اُس کے حسین چہرے پر گھر آئی بالوں کی لٹ پیچھے ہٹائی۔ پرکشش ہونٹوں سے اُس کے ماتھے کو چھوا۔

''کیسی ہو؟'' وہ اُسے بغور دیکھ رہا تھا۔

''ٹھیک ہوں۔'' وہ آہستہ سے بولی۔

''ماما کہاں ہیں؟'' چور جو دل میں ہر وقت بیٹھا رہتا تھا۔

"نور محمد کے گھر گئی ہیں"۔

"اوہ۔" اُس نے جیسے نجات کی سانس لی۔

پھر— چپ چاپ اُسے سینے سے لگا لیا۔ دھیرے دھیرے پیار کرنے لگا۔

شندی اندازِ خود سپردگی لئے اُس کے مضبوط بازوؤں میں گھری بے خود سی کھڑی تھی۔ وہ اُس کے بہت قریب تھا۔ اتنا کہ وہ اُس کے دل کی دھڑکنیں صاف سن رہی تھی، اُس کی مہکتی سانسیں اپنے چہرے پر منڈلاتیں محسوس کر رہی تھی، اُس کے مخصوص پرفیوم کی مدھرتا اُس کے تن من میں ہلچل مچا رہی تھی!

کتنے سارے پل بیت گئے۔ وہ دونوں یوں ہی کھڑے رہے۔

پھر— جیسے یاور خان کو ہوش آ گیا۔ آہستہ سے اُسے اپنے سے الگ کیا۔ کہ کہیں ماما آ جاتیں تو؟

"تمہیں پتہ ہے میں نے تمہیں کتنا مس کیا ہے؟" اُس کے بال سنوارتے ہوئے وہ ہولے سے بولا۔ آواز اب بھی جذبات سے بھاری ہو رہی تھی۔

وہ خاموش تھی۔ جھکی جھکی پلکیں، بھیگے بھیگے ہونٹ لئے سر جھکائے کھڑی تھی۔

"چلو۔ تمہاری بالکنی میں بیٹھتے ہیں۔" اُس کا شرمایا لجایا سراپا اُس کے دل میں اتر رہا تھا۔

"چلیں"۔ وہ اُسے اپنے بیڈ روم میں سے گزارتے ہوئے بالکنی میں لے جانے لگی۔

دونوں کین کی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ نیچے گاؤں کی اونچی نیچی بہت ساری بتیاں اور اوپر ٹم ٹم کرتے اَن گنت تارے! جادوئی ماحول تھا!!

"آج سارا دن کیا کرتی رہیں؟" اُس نے ابتدا کی۔ وہ اُس کا پل پل



جاننا چاہتا تھا، اپنانا چاہتا تھا۔

"میں ..." وہ سوچنے لگی۔ "دن میں یہاں بیٹھی ایک ناول پڑھتی رہی۔ اِس وقت اندر... اپنا فون اِنڈیکس ڈھونڈ رہی تھی۔ پتہ نہیں کہاں غائب ہو گیا ہے۔ مل ہی نہیں رہا۔"

"ویسے— حضور کو بتایا تھا کہ اپنے فون سے کسی کو کونٹیکٹ نہیں کرنا"۔

"کونٹیکٹ نہیں کر رہی تھی ویسے ہی ڈھونڈ رہی تھی۔"

"اچھا— اور— اور کیا کر رہی تھیں؟" وہ اب بھی اُسے بغور دیکھ رہا تھا۔

"اور...؟" وہ مسکرا دی۔ "ماما سے کہا تھا مجھے چپاتی بنانا سکھائیں۔ وہ آئیں گی تو سکھائیں گی۔"

"اوہ نو"۔ وہ خوبصورتی سے ہنس دیا۔ "ویسے اچھی بات ہے۔ میرے یہاں تمہاری حویلی کی طرح نوکروں کی ریل پیل نہیں ہوگی۔ کک چھٹی جائے گا تو تم ہی کو سب کرنا پڑیگا..."

وہ سرخ سی ہو گئیں۔

"مجھے بہت اچھا لگے گا۔" وہ آہستگی سے بولی۔ "میں ماما سے تھوڑا تھوڑا سیکھ بھی رہی ہوں۔"

"مجھے تمہارے ہاتھ کی بنائی ہوئی چیزیں بہت اچھی لگیں گی"۔ اُس نے اُس کے ہاتھ پر پیار کرتے ہوئے کہا۔ "چاہے کیسی بھی بنی ہوں"۔

"کیسی بھی بنی ہوں؟" اُس نے خشمگیں نظروں سے اُسے دیکھا۔

"ظاہر ہے۔ کیسی بنی ہوں گی۔" اُس کے لہجے میں شرارت تھی۔

"آپ مجھے چیلنج مت کریں۔ میں ٹھیک ٹھاک چیزیں بناؤں گی"۔

"اچھا۔ آج چپاتی دیکھ لیتے ہیں..."

"اوہ نو"۔ اُس نے اپنی بہت خوبصورت آنکھیں میچ لیں۔

کتنی دلکش ادا تھی۔ وہ دیکھتا رہ گیا۔

پھر۔۔۔ جیسے اُسے کچھ خیال آیا۔ سنجیدہ ہو گیا۔

''تمہیں ایک بات بتاؤں؟'' وہ دھیرے سے بولا۔

''جی''۔ اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔

''امی آئی ہوئی ہیں''۔

''کب؟'' وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔

''پرسوں''۔

''آپ نے مجھے بتایا ہی نہیں''۔

اُس نے گہری سانس لی۔

پھر۔۔۔ شندی کو سب بتا دیا۔ کہ اُس کی امی شندی کی امی کی سوتیلی بہن تھیں۔ چند سال قبل وہ لوگ کینیڈا سے کراچی شفٹ ہوئے۔ پھر اُسے خالو عالمگیر کے انتقال کا علم ہوا۔ اور وہ تعزیت کے لئے حویلی گیا۔ اُس وقت وہ شندی کو یہی بتانے گیا تھا کہ وہ اُس کا سوتیلا خالہ زاد تھا۔ اُس سے تعزیت کرنے آیا تھا۔ دوستی کا ہاتھ بڑھانے آیا تھا۔ مگر۔۔۔ وہاں پہنچا تو حالات ہی کچھ اور تھے۔۔۔

حویلی آسیب زدہ اور ماحول پتھرایا ہوا لگ رہا تھا۔ اور پھر۔۔۔ جب اُسے معلوم ہوا اپنا سگا چچا اور سگا ماموں ہی اُسے ختم کرنے پر تلے تھے۔ تو اُس نے اپنی شناخت کروانے کا خیال ہی ذہن سے نکال دیا۔ کہ شندی کا تو سگے رشتوں سے ہی اعتبار اٹھ گیا تھا۔ سوتیلے رشتوں کا کیا بھروسہ کرتی۔ اور تبھی خیال آیا کہ جس طرح انیسہ بیگم اپنے سوتیلے رشتوں سے متنفر تھیں۔ اُسی طرح شاید نفیسہ بیگم کا بھی رویہ رہا ہوگا۔ شندی بھی ظاہر ہے ماں کی ہم خیال ہوگی تو چونکہ وہ مصیبت میں تھی۔ اِس لئے بہتر تھا کہ وہ اُسے فی الحال کچھ نہ بتاتا مبادا اُس کی مدد لینے میں اُس کی خودداری مجروح ہو جاتی۔ اُسے اور تکلیف ہوتی یا پھر مزید متنفر ہو



جاتی اُس سے۔

پھر۔۔۔ جوں جوں وہ اُس سے ملنے لگا۔ اُسے پیاری سی دوست سمجھنے لگا۔ اُس کے پاس آ کر اُسے سکون ملنے لگا۔ تو اُس نے اُسے اپنا رشتہ بتانے کا ارادہ ہی ترک کر دیا۔ بعد میں جب اُس نے محسوس کیا وہ تو اُسے چاہنے لگا تھا۔ تب اُسے فکر پڑ گئی کہ اب بات سے پردہ اٹھائے گا تو کیسے؟ شندی تو خود بھی اُسے پیار کرنے لگی تھی۔ اور پیار میں انسان دشمن بھلا دیتا ہے۔ مگر۔۔۔ امی کو کیسے راضی کرے گا؟ یہ قریباً ناممکن لگ رہا تھا اُسے ...

شندی ہکا بکا سب سن رہی تھی۔ اُس کی طرف بے اختیار کھچنے کی وجہ سمجھ میں آ رہی تھی۔

"And this is the whole story, my most precious cousin." یاور خان نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''تبھی آپ میرے گارڈ بنے تھے''۔ وہ آہستہ سے بولی۔

اور۔۔۔ یاور خان کا ایک شگاف قہقہہ بلند ہوا۔

''ہاں۔ رشتے کا جذبہ ہی کارفرما تھا۔ ورنہ اگر ایسے موقعے پر مجھے کسی اور کی مدد کرنا پڑتی تو کم از کم اُس کا گارڈ بالکل نہ بنتا۔'' اُسے اکثر اپنا بہروپ بھرنے پر حیرت ہوتی، ہنسی بھی آتی۔

''آپ مجھے پہلے سے کئی گنا زیادہ اچھے لگنے لگے ہیں۔''

''کیوں؟''

''میرے کزن جو ہوئے''۔

''میں پہلے ہی بتا دیتا مجھے پتہ ہوتا تو''۔

''آپ اکیلے ہی مجھے کزن سمجھتے ہوئے مزے لیتے رہے۔ میں بھی حیران تھی کہ آپ شروع دن سے ہی مجھ سے اتنے بے تکلف کیوں تھے۔ اتنی اپنائیت کیوں ہوتی تھی آپ کی ہر بات میں''۔

"ہاں۔ مجھے شروع دن سے تم پر پیار آتا تھا۔ تم سے گپ شپ کرنے کو دل کرتا تھا۔ تمہارے لئے پیزا، بہت سارے چوکلیٹس اور ڈھیر ساری مارزی پان لانا چاہتا تھا۔ جبھی تو تمہارے ساتھ مل کر کھانا کھاتا تھا۔ تم سے فون پر گپ شپ کرتا تھا۔ ورنہ کسی غیر لڑکی کے ساتھ میں اِس طرح Odd hours میں بات کرسکتا تھا؟"

"اور میں سمجھتی رہی کہ آپ میرے محسن ہیں اِس لئے۔ پھر میرے ڈاکٹر بھی رہے ہیں شاید اِس لئے"۔

"اور یہ سوچا ہی نہیں کہ میں تم سے پیار کرتا ہوں شاید اِس لئے"۔ وہ اُس کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

اچانک اُس کی آنکھوں میں کہانیاں جنم لینے لگی تھیں، یاد دہانیاں منڈلانے لگی تھیں۔

شندی اُس کی بولتی آنکھوں کا سامنا کبھی نہ کر پائی تھی۔ اب بھی لمبی سیاہ پلکیں تیورا کر گر گئیں۔

وہ بے طرح محظوظ ہوا۔ چند پل یوں ہی اُسے دیکھتا رہا۔

پھر___ جیسے کچھ یاد آیا۔ سنجیدہ ہوگیا۔

"تم دعا کرتی ہو؟"

اُس نے جھکی پلکیں اوپر اُٹھائیں۔

"کس بات کی؟"

"کہ امی مان جائیں"

"اوہ۔ ہاں۔ کرتی ہوں" وہ دھیرے سے بولی۔

"ماما سے بھی کہو دعا کریں"۔ ماما کو ڈھلان پر اوپر آتے دیکھتے ہی اُس کی شوخی لوٹ آئی۔

"اُن سے آپ کہیں"۔



وہ خوشگواری سے ہنس دیا۔

"کھانا میرے ساتھ کھائیں گے؟" آنٹی انیسہ چونکہ گھر پر تھیں۔ اس لئے اُس نے صرف پوچھ لیا۔ اصرار نہیں کیا۔

"نو تھینک یو۔ امی نے کہا ہے وہ کھانے پر میرا انتظار کریں گی"۔

"او کے۔ ماما..." اُس نے پاس سے گزرتی ماما کو آواز دی۔

اُنہیں کوفی بنانے کو کہا۔ اور دونوں پھر سے باتوں میں مصروف ہو گئے۔

ماما نے کوفی لگائی۔ تو دونوں اندر لِونگ روم میں ٹیبل پر آ گئے۔

شندی کا قرب تھا، خوبصورت لِونگ روم کا خواب آور ماحول تھا، مزیدار کوفی اور ڈھیر سارا ڈرائے فروٹ تھا، مگر___

یاور خان سوچوں میں ڈوبا تھا۔ امی شندی کا ذکر تک سننا نہیں چاہتی تھیں۔ آج ہوسپٹل میں اُن کے چیک اَپ کے دوران اُس نے ہمت کر کے اپنی مدعا اُن کے سامنے پیش کر دی تھی مگر___ وہ یوں سامنے دیکھنے لگی تھیں جیسے کچھ سنا ہی نہیں تھا۔ اُن کے ماتھے پر کی شکنیں اور گھمبیر خاموشی صاف بتا رہی تھیں کہ وہ اِس معاملے میں ایک لفظ بھی سننے کو تیار نہیں تھیں___ شندی کو پانا اُن کو ناراض کرنا تھا اور اُن کو خوش کرنا شندی کو کھونا تھا۔ وہ دونوں باتوں میں سے ایک بھی نہیں چاہتا تھا۔ نہ امی کو ناراض کرسکتا تھا۔ نا ہی شندی کو کھونا چاہتا تھا۔ پھر___

کیا کرے گا؟ ماں کو ناراض___ No way۔ شندی کو چھوڑنا___ یہ بھی مشکل!

شندی سے پہلے جو دو ایک لڑکیاں اُس کی زندگی میں آئی تھیں چلی گئیں تو اُسے دو چار دن سے زیادہ پریشانی نہیں ہوئی تھی۔ شندی میں جانے کیا بات تھی؟ اُس کے چھٹ جانے کا تو وہ تصور ہی نہیں کرسکتا تھا۔ آتی جاتی سانس بن گئی تھی وہ تو اُس کی۔ اور سانس لئے بغیر جیا تو جا نہیں سکتا!

''کیا سوچ رہے ہیں؟'' شندی اُس کی دلی کیفیت سے بے خبر دھیرے سے بولی۔

اُس نے گہری سانس لی۔

''شندی۔ تمہاری امی میری امی کو کیسا سمجھتی تھیں؟'' میرا مطلب ہے امی سوتیلی تھیں نا۔'' اُس نے جاننا چاہا۔

''اوہ''۔ وہ جیسے یاد کرنے لگی۔ ''مجھے تو زیادہ یاد نہیں کیونکہ میں چھوٹی تھی تب۔ بس اتنا یاد ہے کہ وہ اکثر کہا کرتی تھیں کہ اُن کی ایک بڑی بہن بھی ہیں اور اُنہیں اُن سے ملنے کی شدید خواہش ہے...''

وہ حیران سا اُسے دیکھنے لگا۔

تو___ اِن لوگوں کے دلوں میں امی کے لئے کوئی مَیل نہیں تھا!

میل امی کے دل میں تھا اِن لوگوں کے لئے۔ لیکن ___ بقول امی باپ اور گھر تو شندی کی امی نے اُن سے چھینا تھا۔ میل بھی ظاہر ہے امی کے ہی دل میں آنا تھا۔ پر___

کیا یہ میل دھویا نہیں جا سکتا تھا؟ صاف نہیں کیا جا سکتا تھا؟ یاور خان اور شندی کی خاطر ہی سہی!

وہ اُداس سا نظر آنے لگا۔ آہستہ آہستہ کوفی پینے میں مصروف رہا۔

''آپ نے یہ کیوں پوچھا؟'' اُسے شک سا گزرا۔ کوئی بات تھی ضرور۔

''بس ویسے ہی۔ تم ذہن پر بوجھ مت ڈالو''۔ اُس نے اپنائیت سے اُس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

تو بات تھی۔ اُس کا دل بیٹھ سا گیا۔

''آنٹی نے کچھ کہا ہے کیا؟''

''نہیں.. تم کوفی پیو۔'' اُس نے بھی بشاش بننے کی کوشش کی۔



شندی نے کرسٹل کی خوبصورت ٹرے میں سجی کیٹھو یاور خان کی طرف کھسکائی۔ مگر اب کے___ شندی کی آنکھوں میں بھی اندیشے منڈلانے لگے تھے۔

''او کے میَم''۔ یاور خان خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''اب چلوں گا۔ امی نے جلدی آنے کو کہا تھا۔''

''آنٹی کو آپ نے بتایا ہے آپ یہاں آئے ہیں''۔

''میرا دماغ خراب ہے کہ اُن کو بتاؤں۔'' وہ خوشگواری سے کہتا کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ بھی مسکرا دی۔

''آپ کی بات سے مجھے یہی لگا...''

''تمہارے اندازے اکثر...'' وہ شرارت سے کہتا چپ کر گیا۔

وہ مسکرائی، کرسی پیچھے کھسکائی، اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں نیکسٹ سنڈے کو دو ہفتے کے لئے لنڈن جا رہا ہوں۔ ایک سیمینار میں شرکت کرنے۔'' اُس نے خبر سنائی۔

''دو ہفتے...''

''ہاں۔ کم ہیں تو اور بڑھا لوں اپنی Stay۔''

اور___ اُس نے اپنے نازک سے مکے سے اُس کے مضبوط سینے پر وار کیا۔ پھر___ جانے کیسے؟ پہلی بار اُس کی دونوں بانہیں بے اختیار اُس کی گردن کے گرد حمائل ہو گئیں۔

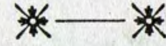
"I love you more than ever before, and this is perhaps because of the blood we share."

یاور خان نے اُسے دونوں بازوؤں میں بھر لیا۔ سینے سے بھینچ لیا۔

"I feel the same, my dear cousin."

ماما کے قدموں کی آہٹ پر دونوں چونکنے ہو گئے۔

''اچھا۔۔۔ ٹیک کیئر۔۔۔ گڈ نائیٹ''۔ وہ دروازے کی طرف بڑھا۔
''گڈ نائیٹ''۔ شندی بولی اور۔۔۔
اپنے بیڈروم کی طرف چلدی۔





یاور خان لنڈن سدھار گیا۔ انیسہ بیگم کراچی چلدیں۔ اور۔۔۔
نور جہاں بانو شندی کے پاس آ گئیں۔ بہت پیاری اور شفقت سے اپنی مدعا بیان کی۔ اُن کے پیار اور شفقت میں کوئی کھوٹ نہیں تھی۔ اُنہوں نے تو خلوصِ دل سے انیسہ بیگم کو شندی کو یاور خان سے بیاہنے کا کہا تھا۔ اپنی دلی خواہش دل میں دبا کر۔ لیکن وہ کسی طور ایسا کرنے کو تیار نہیں تھیں۔ پھر شندی کی شادی تو بہر حال کسی سے ہونی تھی۔ تو کیوں نہ وہ اُسے اپنے ابراہیم کے لئے لے آتیں۔ اگر اُس کے پاس جاگیر تھی۔ تو وہ بھی کسی نہ کسی کے پاس تو جانی تھی۔ ابراہیم کے پاس آ گئی تو اُس کی قسمت۔ اِس میں اُنہیں کوئی عیب یا زیادتی نظر نہیں آئی۔ یہی املاک نفیسہ بیگم کے ذریعے عالمگیر حیدر کو ملی تھیں۔ عالمگیر حیدر بھی تو خود ایک عام

آدمی تھے۔ ہوتا ہے ایسا۔ کبھی کبھی ہو جاتا ہے!

شندی پہلے بھی اُن کی خواہش سمجھ رہی تھی۔ مگر ـــــ اِس قدر صاف الفاظ میں سن کر دم بخود رہ گئی۔

وہ تو ـــــ یاور خان کو چاہتی تھی۔ اُس کے علاوہ کسی اور سے شادی کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ بہرحال ـــــ آنٹی نے اُسے سوچنے کو دو چار دن کی مہلت دی۔ بہت اپنائیت سے دنیا کی اونچ نیچ اور جس سچویشن میں وہ اِس وقت تھی، سب سمجھائی۔ ڈھیر ساری تسلیاں دیں اور ـــــ نیک خواہشات کے ساتھ اپنے گھر چلدیں۔

لنچ کے بعد شندی سب بھول بھال آرام سے سوگئی۔ آنکھ کھلی تو پانچ بج رہے تھے۔

وہ واش روم گئی۔ ہاتھ منہ دھوئے۔ خوبصورت بالوں میں برش کیا اور ـــــ کل ہی منگوایا۔ Dorothy Carlock کا "On tall pine lake" لیکر اپنی بالکنی میں آکر بیٹھ گئی۔

سورج دُور اُس پار پہاڑوں کے پیچھے چھپ رہا تھا۔ دن بھر کے تھکے پنچھی اپنے اپنے آشیانوں کی سمت چلدیئے تھے۔ آس پاس کے گھروندوں سے حسبِ معمول شام کی پکوان کے دھوئیں اٹھنے لگے تھے اور ـــــ سیاہ بادل کا ایک ٹکڑا اپنی کنگریوں میں ڈھلتے سورج کا سیندور سجا رہا تھا!

مدہوش کن ماحول سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اُس نے کتاب کھول لی۔

ماما اُس کی اور اپنی چائے وہیں لے آئیں۔ اُس کے مقابل والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے اُس کے لئے چائے بنانے لگیں۔ کچھ سوچوں میں گم تھیں جیسے۔ نور جہاں بانو کے جاتے ہی شندی نے اُنہیں اُن کے آنے کا مقصد بتا دیا تھا۔ خود تو بے فکر ہوگئی تھی مگر ـــــ ماما کو اندیشوں میں مبتلا کر گئی تھی۔



ماما جانتی تھیں شندی اور یاور خان ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ بال دھوپ میں تو سفید نہیں کیئے تھے۔ سب سمجھتی تھیں آپس میں دونوں کی دلچسپی۔ شندی نے خود اقرار نہیں کیا تھا تو کیا ہوا؟

بہت پریشان لگ رہی تھیں۔ متفکر بھی۔

''شندی بیٹے۔'' اُنہوں نے چائے کا کپ اُس کے آگے رکھا۔

''جی ماما۔'' کپ اُٹھاتے ہوئے وہ اب بھی کتاب پر نظریں جمائے تھی۔

''تم سے ایک بات کرنا تھی''۔

''جی ماما''۔ اب اُس نے کتاب بند کر کے میز پر رکھ دی۔ ''کیا بات کرنا تھی؟''

وہ جیسے ہمت نہ کر سکیں۔ آہستہ آہستہ اپنے کپ میں چمچ چلاتی رہیں۔ چائے پر نظریں جمائے رکھیں۔

''بتائیں نا ماما''۔ پتہ نہیں کیا کہنے والی تھیں وہ؟ اتنی سنجیدہ وہ پہلے کبھی نظر نہیں آئیں تھیں۔

''کل سے سوچ رہی ہوں کہوں نہ کہوں مگر...''

''مگر کیا؟''

''آج تم نے جج صاحب کی بیگم صاحبہ کی بات بتائی۔ تو سوچتی ہوں کہہ ہی دوں...''

''بیٹا... میری بات کا برا مت ماننا مگر... ڈاکٹر صاحب کے بارے میں کچھ مت سوچنا...''

''ڈاکٹر صاحب کے بارے میں...؟'' وہ کچھ اَپ سیٹ سی نظر آنے لگی۔

''بیٹا... مجھے لگتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب تم میں دلچسپی لیتے ہیں''۔ اُنہوں

نے شندی کا کہا ہی نہیں۔ ''مگر ... اُن کی والدہ ... ایسا نہیں چاہتیں ...''
اُنہوں نے کہہ ہی دیا۔

''میں کچھ سمجھی نہیں۔ اُن کی والدہ ...؟ یہ سب کیا بات ہے؟'' اُس نے کپ واپس میز پر رکھ دیا۔

اور ___ ماما نے اُسے سب بتا دیا۔

کس طرح کل یاور خان کے چلے جانے کے بعد کراچی جانے سے قبل انیسہ بیگم نے ماما کو گھر بلوایا تھا۔

''نفیسہ کی بیٹی سے کہہ دو۔ یاور سے شادی کا جو خواب وہ دیکھ رہی ہے وہ کبھی پورا نہیں ہوگا۔ نفیسہ نے مجھ سے میرا باپ میرا گھر چھینا۔ اب اُس کی بیٹی مجھ سے میرا بیٹا چھیننے کے درپے ہے۔ مگر اب میں پانچ سال کی ایک کمزور بچی نہیں ہوں۔ ایک جوان بیٹے کی ماں ہوں۔ یاور کو میں نے جنم دیا ہے۔ وہ وہی کرے گا جو میں کہوں گی۔ لنڈن سے واپسی پر وہ سیدھا کراچی آئے گا۔ اُسی دن میں اپنی دوست کی بیٹی سے اُس کا نکاح کرواؤں گی۔ اُس کے بعد ہی وہ یہاں آ کر اپنی ڈیوٹی سنبھالے گا۔ بہت ہو چکا ... میرا خیال ہے یہ پیغام نفیسہ کی بیٹی کے لئے کافی ہوگا۔''

شندی کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ اردگرد کی ہر چیز گھومتی محسوس ہو رہی تھی۔

''بہت غصے میں لگ رہی تھیں ڈاکٹر صاحِب کی والدہ''۔ ماما مزید بولیں۔

شندی خود کو سہار نہ سکی۔ سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔ پتھرائی آنکھوں سے ماما کو تکنے لگی۔

اُس کی یاور خان سے صرف محبت کی بات تو نہ تھی۔ وہ تو اُس پر پورا تکیہ کئے بیٹھی تھی۔ اب تو وہ ہی تھا اُس کا سب کچھ۔ وہ آج کیا کرے گی؟ کل کیا ہوگا؟ یہ



سب تو اُس کے لئے یاور خان ہی Manage کرتا تھا۔ خود وہ تو کچھ بھی نہیں تھی۔ اُسی نے اُس کو اپنی املاک دلوائی تھیں، اُسے اپنی حویلی میں دوبارہ بسوانا تھا۔ اُس کے چچا اور ماموں کے آگے وہ ہی تو اُس کی ڈھال تھا ___ اُس کا گارڈ تھا!

اب یہ سب کون کرے گا؟ اُسے لگا وہ اچانک آسمان کی اونچائیوں سے زمین کی عمیق گہرائیوں میں جا دھنسی تھی۔ اتنے زور سے گری تھی کہ روح تک چیخ اٹھی تھی!

یاور خان کو اُنہوں نے ہی جنم دیا تھا وہ مانتی تھی۔ اُس نے وہی کرنا تھا جو وہ کہتی تھیں یہ بھی وہ مانتی تھی پر ___ وہ کیا کرے گی؟

اِس بھری دنیا میں تن تنہا اپنے دشمنوں کا مقابلہ کیسے کرے گی؟ اُسے تو دنیا کا تجربہ ہی نہیں تھا۔ اور ___ ایسے میں انکل ذوالفقار نے بھی ایجنسی خالی کرنے کو کہہ دیا تو؟ یاور خان کی فیملی کی دوستی میں ہی تو اُنہوں نے اُسے یہاں رکھا تھا۔ بھلے وہ کرایہ دے رہی تھی مگر رہ وہ تو یاور خان کے ہی توسط سے رہی تھی۔ کہیں اور جا کر اکیلی کیسے رہ پائے گی؟ وہ تو بے فکر ہو کر دن گزار رہی تھی۔ گو ___ نظر بندی ہی تھی۔ باہر آنا جانا، کسی سے کسی بھی قسم کا رابطہ یاور خان نے بند کروایا ہوا تھا۔ اپنے علاقے سے کوئی بھی خبر نہ آتی تھی نہ جاتی تھی۔ ایسے میں گھبرا بھی جاتی کبھی کبھی وہ۔ مگر ___ اپنے دشمنوں تو محفوظ تھی۔ یہی سب کچھ تھا اُس کے لئے۔ اب وہ کیا کرے گی؟ کہاں جائے گی؟

یہاں سے نکلتے ہی کہیں چچا نے دھر لیا تو؟ ماموں نے پھر کوئی سازش کی تو؟

وہ کانپ کانپ اُٹھی ___ آج اُسے یقین ہو گیا۔ پیسہ ہی سب کچھ نہیں تھا۔

'باپ، بھائی یا پھر شوہر۔ ہمارے معاشرے میں یہی تین رشتے ایک

عورت کی حفاظت کے ضامن ہوتے ہیں۔ اور پھر تمہارے تو تمہاری اپنی املاک ہی دشمن بنی ہوئی ہیں۔ تمہیں فوری طور پر ایک محافظ کی ضرورت ہے۔ جو تمہیں صرف ایک اچھے شوہر کی صورت میں میسر آ سکتا ہے ...' پہلی ہی ملاقات میں انکل ذوالفقار کی کہی بات اُس کے کانوں میں گونجی۔

ماما نے بھی یہی کہا تھا۔ کوئی اچھا بَر مل جائے تو اُسے شادی کر لینی چاہئے۔ تاکہ اُس کا شوہر اُس کا بوجھ سنبھال لے۔ بالکل ایسے ہی جیسے اُس کی ماں نے کیا تھا!

آنٹی نور جہاں بھی یہی کہا کرتی تھیں۔ اُسے ایک مرد کے مضبوط سہارے کی ضرورت تھی۔

سو___ اِدھر اُدھر سے سن سن کر وہ بھی یہی سب سوچنے پر مجبور ہو گئی تھی کہ___ اُسے شادی کر لینی چاہئے تھی___ جبکہ کچھ ہی عرصہ قبل___ وہ اپنی پڑھائی مکمل کئے بغیر شادی کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی!

اور پھر___ اُس نے شادی کرنے کا فیصلہ دل میں کر ہی لیا تھا۔ پر___ انتخاب غلط کیا تھا۔ یاور خان کا سوچ لیا تھا۔ یہ جانے بغیر ہی کہ___ وہ تو اُس کی سوتیلی خالہ کا بیٹا تھا۔ لیکن___

اگر اُسے معلوم ہوتا کہ وہ اُس کا سوتیلا خالہ زاد تھا تو کیا وہ اپنا پیار روک پاتی؟ پیار بھی کوئی روکنے کی چیز تھی؟ بندھ باندھنے کی؟

دو آنسو لڑھک کر اُس کے خوبصورت گالوں پر آ رہے۔

''نا میرا بچہ''۔ ماما اُسے ہی دیکھ رہی تھیں۔ اٹھتے ہوئے اُس کے پاس آ کھڑی ہوئیں۔ اُس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

اور___ شندی اُن سے لپٹتے ہوئے بے اختیار رو دی۔ بے حساب رو دی۔

ماما کے بھی آنسو نکل آئے۔ خدا کے بعد اُن دونوں کو یاور خان کا ہی تو آسرا تھا!



دل کی بھڑاس نکال چکی تو شندی نے آنسو پونچھ لئے۔

''ماما ہم کیا کریں گے؟''

ماما کا دل اُس کی بے بسی پر کٹ کر رہ گیا۔

''جن کا کوئی نہیں ہوتا، اُن کا خدا ہوتا ہے۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔ وہی مسبب الاسباب ہے''۔

ماما چائے کے برتن سمیٹنے لگیں۔ شندی ناول دوبارہ اٹھا کر خالی خالی نظروں سے اوراق پلٹنے لگی۔ پھر کتاب بند کر کے واپس میز پر رکھدی۔ تھکی آنکھیں موندتے ہوئے سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔

پاس ہی بید مجنوں کے درخت میں چڑیوں کی جھرمٹ آ کر بیٹھی تو چونکتے ہوئے اُس نے آنکھیں کھولدیں۔

دور پربتوں کے پیڑوں پر شام نے ڈیرے ڈال دیئے تھے، بید مجنوں کی زمین کو چومتی ڈالیوں میں ہوا سرگوشیاں کرنے لگی تھی اور___ خنکی سوا ہو گئی تھی!

گہری سانس لیتی، بوجھل سے قدم اٹھاتی وہ بھی اندر آ گئی۔

وقت گزارے کو ٹی وی آن کی اور بستر میں کروٹ کے بل لیٹتے ہوئے نظریں اُس پر جما دیں۔

'اتنی کہ___ مجھے ڈر لگنے لگے کہ ...' یک دفعہ باتوں باتوں میں یاور خان نے کوئی بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

اُسے تجسس ہوا۔ اور بعد میں فون پر پوچھ لیا۔ کہ اُس وقت وہ کیا کہنے والا تھا؟

'یہی کہ___ مجھے تم نہ ملیں۔ تو میں جیوں گا کیسے؟'

'یاور___ آپ نے یہ نہیں سوچا کہ میں آپ کے بغیر کیسے زندہ رہوں گی؟'

اُس نے ٹوٹے دل میں کہا۔

'یاور کو میں نے جنم دیا ہے۔ وہ وہی کرے گا جو میں کہوں گی' ماما کی

بات اُس کے کانوں میں گونجی۔

'ٹھیک تو ہے'۔ اُس نے انگلیوں سے اپنے آنسو پونچھے۔ 'انیسہ آنٹی یاور کی ماں تھیں۔ اور وہی ہونا چاہئے تھا جو وہ چاہتی تھیں۔' اُس نے پاگل من کو سمجھانا چاہا مگر___

دل تھا، پاگل تھا، کیسے سمجھتا؟

اُس نے ٹی وی بند کر دی۔ ہمیشہ کی طرح کمرے کی لائیٹ آف کرتے ہوئے باہر بالکنی میں آ کھڑی ہوئی۔ مگر___

یہاں وہاں بکھرے جلتے بجھتے دیپ اُداس تھے، ہوا کی سرگوشیاں افسردہ تھیں اور___ بیدِ مجنوں رو رہی تھی!

وہ بھی رونے لگی۔ کہ وہ بھی بہت اُداس تھی!





آج شام پانچ بجے شندی نے چپ چاپ ابراہیم کے نام کی انگوٹھی پہن لی۔ کہ___

وہ اپنی جاگیر پر اپنی حویلی میں راج پذیر نہیں تھی۔ اُس کے چچا اور ماموں اتنے فراخدل نہ تھے کہ اُس کے لئے آئے اچھے سے اچھے رشتوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کر کے اُسے دھوم دھام سے وداع کرتے۔ اُنہیں صرف اپنی فکر تھی۔ اپنے شادی شدہ اوباش بیٹے سے اُس کی شادی کروا کر اُس کی جاگیر ہڑپنے کی۔ یا پھر اُسے زہر دے کر خود جاگیردار بن بیٹھنے کی!

اُس نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا تھا۔ گو دل بہت رویا تھا!
مگر ــــ چاند کے لئے بچہ روئے تو کیا چاند اُسے مل جاتا ہے؟
یاور انیسہ آنٹی کا بیٹا تھا۔ اُنہوں نے اُسے جنم دیا تھا۔ وہ اُن ہی کی ملکیت تھا۔
'نفیسہ نے مجھ سے میرا باپ چھینا۔ اب اُس کی بیٹی مجھ سے میرا بیٹا چھیننے کے درپے ہے۔'
اُن کا خوف بجا تھا۔ وہ اُن سے اُن کا بیٹا کبھی نہیں چھیننے لگی۔ اُنہیں اتنا بڑا دکھ ہرگز نہیں دے گی!
اپنے فیصلے سے وہ قدرے مطمئن بھی لگنے لگی تھی۔ یاور خان کے چھٹنے کا بہت دکھ تھا۔ بہت درد تھا۔ لیکن ــــ یاور خان کو پالینا ممکن بھی تو نہیں تھا۔ پھر ــــ یہی وقت تھا۔ کوئی نہ کوئی فیصلہ تو اُسے کرنا ہی تھا۔ یوں دربدر، گھر میں مقید، باقی دنیا سے کٹی ہوئی، گمنامی کی زندگی وہ کب تک بسر کر سکتی تھی؟
اور پھر ــــ ابراہیم کو قبول نہ کرتی۔ تو یاور لوگوں سے رابطہ ختم ہو جانے کے بعد جج فیملی سے تو خود بخود اُس کا تعلق ٹوٹ جانا تھا۔ پھر کون اُس کے سر پر ہاتھ رکھتا؟ کون اُس کی مدد کرتا؟ ایسے میں ــــ کہ یقیناً اُس کا چچا اُس کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ یہاں سے قدم باہر نکالتے ہی اُسے دشمنوں نے پھر آلینا تھا۔
اِس تصور سے ہی وہ کانپ کر رہ گئی۔
دنیا میں ہزاروں لڑکیوں کے دل ٹوٹتے ہیں۔ ایک اُس کا بھی ٹوٹ گیا تو کونسی اَن ہونی ہو گئی!
'ٹرررن... ٹرررن...' دفعتاً اُس کا سیل بج اٹھا۔
''جی... کون بول رہا ہے؟'' یاور خان تھا۔ پہچاننے کے باوجود وہ بوکھلا کر بولی۔



''تمہارا اگارڈ۔ کیا میری آواز بدلی بدلی لگ رہی ہے؟'' وہی اپنائیت وہی کیئر، وہی Concern!
''نن... نہیں تو...''
''پھر کیوں پوچھ رہی ہو کہ کون بول رہا ہے؟''
وہ خاموش رہی۔ کم از کم آج وہ اُس سے بات کرنے کے قابل نہیں تھی!
''شندی''۔
''جی''۔ وہ جو اُس نے سوچا تھا۔ کہ اُس سے کہے گی کہ انیسہ آنٹی کی مرضی کے خلاف اُس سے تعلق قائم رکھ کر وہ اُنہیں دکھ دینا نہیں چاہتی تھی۔ کہہ نہ سکی۔ کہ ایسا کہنے سے بات آنٹی پر آجاتی تو؟
''تم ٹھیک تو ہو نا؟''
''ٹھیک ہوں''۔ وہ کمزور پڑنے لگی۔
''اچھا سناؤ۔ کیا گپ شپ ہے؟''
اور ــــ وہ گھٹی گھٹی آواز میں رو دی۔
''کیا ہوا؟'' وہ اَپ سیٹ سا بول پڑا۔ ''کیا بات ہے شندی؟''
''وہ... وہ...'' آواز کی بجائے سسکیاں تڑپنے لگیں۔
''شندی پلیز! ہیلو... شندی...'' وہ دور بیٹھا بے بسی سے بول رہا تھا۔
شندی خود پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔
''کچھ نہیں... آپ... آپ کیسے ہیں؟'' وہ بمشکل کہہ سکی۔
''میں ٹھیک ہوں۔ تم کیسی ہو؟ رو کیوں رہی ہو؟'' اُس کی آواز میں سخت تشویش تھی۔
''ٹمپریچر ہو گیا تھا... اکیلی تھی بس...'' اُس نے بات بنائی۔
''اوہ''۔ اُس نے نجات کی سانس لی۔

''تم نے مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ بخار کی ٹیبلٹس لو۔ کل تک نہ اترے تو آنٹی نور جہاں سے کہو ڈاکٹر کو دکھا دیں۔ تمہاری ڈاکٹر نادیہ کو نہیں کسی اور کو''۔

'تمہاری ڈاکٹر نادیہ' کہکر اِس وقت پھر وہ اُسے چھیڑ رہا تھا۔ وہ کیسے اُسے بتاتی کہ اب یاور خان کو نہ اُسے فون کرنے کا کوئی حق تھا نہ ہی اُس سے چھیڑ چھاڑ کرنے کا۔ وہ کسی اور کی ہو چکی تھی۔ اور اب اُن دونوں کو اِس حقیقت کا احترام کرنا چاہئے تھا!

''I love you.'' یاور خان بولا۔

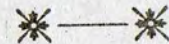
مگر وہ ___ حسبِ سابق 'I love you too.' نہ کہہ سکی۔ کہ اب اُن دونوں کے درمیان اجنبیت کی دیوار کھڑی ہو چکی تھی۔

فون بند ہو گیا۔ اور وہ سوچنے لگی۔ اُس کا خیال غلط تھا۔ کہ دنیا میں ہزاروں لڑکیوں کے دل ٹوٹتے ہیں۔ ایک اُس کا بھی ٹوٹ گیا تو کون سی انہونی ہو گئی؟ اَن ہونی ہی ہوتی ہے۔ اور ہر لڑکی کے ساتھ ہوتی ہے۔ دل ٹوٹتے ہیں۔ تو بہت درد ہوتا ہے۔ روحیں تک چیخ اٹھتی ہیں۔

اُس کی بھی روح چیخ اٹھی تھی۔ بہت درد اُٹھا تھا دل میں۔ بہت یاد آنے لگا تھا یاور!

تکیوں میں سر دے کر وہ بے اختیار رو دی۔ بلک بلک کر رو دی۔

رات نماز پڑھی، دعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے۔ تو اپنے رب کے حضور اپنی استقامت اور سکون کی دعا مانگی۔ گو ___ چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ ٹوٹا ہوا دل کراہ رہا تھا!





یاور خان لنڈن سے کراچی ایئرپورٹ پر اترا۔ تو ڈرائیور کے بجائے نایاب اُسے لینے آئی کھڑی تھی۔

وہ خوشی خوشی گاڑی میں اُس کے ساتھ پسنجرز سیٹ پر بیٹھا۔ نایاب ڈرائیو کرتی سڑک پر گاڑی دوڑاتی رہی۔

''امی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔'' نایاب گویا ہوئی۔

''کیا ہوا اُنہیں؟'' وہ پریشان ہو گیا۔

''ڈاکٹرز کا خیال ہے کہ ہارٹ اٹیک ہے۔ C.C.U میں ہیں۔ کل

سے انڈرابزرویشن رکھا ہوا ہے ...''

''کوئی سیریس بات تو نہیں؟ تم کچھ چھپا تو نہیں رہیں؟''

''نہیں نہیں۔ آپ خود ڈاکٹر ہیں آپ سے کیا چھپاؤں گی؟'' وہ مسکرادی۔ ''دراصل ڈرائیور اُن کے پاس ہے اِس لئے میں آپ کو لینے آ گئی۔''

''ہوں''۔ وہ فکرمند سا بولا۔ ''پھر ہمیں ہوسپٹل امی کے پاس جانا چاہئے''۔

''ہاں وہیں جارہی ہوں۔ امی آپ کو یاد بھی بہت کررہی تھیں''۔

چند موڑ موڑتی ___ وہ گاڑی ہوسپٹل کے پارکنگ میں لے گئی۔

انیسہ بیگم پہلے سے بہتر تھیں۔ البتہ کچھ کمزور لگ رہی تھیں۔ یاور خان کو دیکھ کر کِھل اُٹھیں۔

تبھی ___ ڈاکٹرز راؤنڈ پر آ گئے۔ اُن کے مطابق انیسہ بیگم ٹھیک تھیں۔ بس E.C.G میں معمولی سا فرق تھا۔ کل E.T.T ٹسٹ ہونا تھا۔ جس کے لئے وہ گھر سے بھی آ سکتی تھیں مگر آج شام تک اُن کا یہاں رہنا ضروری تھا۔

''بیٹا اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ گھر لے چلو۔ ہوسپٹل میں دل گھبرا رہا ہے''۔ انیسہ بیگم ڈاکٹرز کے سامنے ہی بولیں۔

کل سے چند فٹ جگہ میں لیٹے لیٹے تنگ آ گئی تھیں۔ پھر یاور خان بھی آیا تھا۔ جلد سے جلد گھر جانے کو دل کرنے لگا۔

یاور خان اُن کی بچوں کی سی بے تابی پر دھیرے سے مسکرادیا۔

''امی۔ ڈاکٹر صاحب ٹھیک کہتے ہیں۔ اور پھر شام تک ہی تو رہنا ہے۔ میں آپ کے ساتھ رہوں گا۔'' اُس نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

ڈاکٹرز آگے بڑھ گئے۔ نایاب اور یاور خان انیسہ بیگم کے پاس بیٹھ گئے۔

دونوں بہن بھائی آہستہ آہستہ آپس میں بات کررہے تھے۔ انیسہ بیگم



آنکھیں بند کئے لیٹی تھیں۔

''یاور بیٹا۔ تم گھر چلو۔ تھکے ہوئے ہو۔ نایاب ہے میرے پاس۔'' انیسہ بیگم بولیں۔

''ہاں یاور بھائی۔ آپ جائیں۔ نہا دھو کر ریسٹ کریں تھوڑی دیر میں شاداب بھی امی کے پاس آ جائے گی تو میں آپ کے پاس آ جاؤں گی''۔

''ٹھیک ہے''۔ یاور خان اٹھ کھڑا ہوا۔

ڈرائیور باہر موجود تھا۔ وہ اُسے گھر لے آیا۔

یاور خان اوپر اپنے کمرے میں گیا۔ نہا دھو کر فریش ہوا۔ پھر نیچے آتے ہوئے لاؤنج میں صوفے پر بیٹھ گیا۔

امی کی طرف سے اُس کی پریشانی کم ہو گئی تھی۔ کل کا ٹسٹ بھی امید تھی کہ ٹھیک ہی آنا تھا۔

اُس نے کل صبح اپنی ڈیوٹی پر پہنچنا تھا۔ مگر اب صورتِ حال بدل گئی تھی۔ امی کے کل والا ٹسٹ بھی ہو جاتا۔ سب ٹھیک ہوتا تو وہ اگلے دن ہی روانہ ہوسکتا تھا۔

ہاتھ بڑھاتے ہوئے اُس نے فون کا ریسیور اٹھا لیا۔ ہوسپٹل سے ایک چھٹی اور لے لی۔ پھر ___ شندی کا خیال آ گیا۔ اُسے بھی فون کرے؟ نو ___ وہاں پہنچ کر ہی اُسے سرپرائز دیگا!

وہ اُسی کے متعلق سوچ رہا تھا۔ کہ ملازم چائے لے کر آ گیا۔ ساتھ میں چکن سینڈوچز اور چیز کیک بھی تھا۔

چائے پیتے ہوئے وہ کھڑکی میں سے اُس پار دیکھ رہا تھا۔

معاً ___ شاداب کی گاڑی گیٹ کے اندر آتی دکھائی دی۔ وہ خوش ہو گیا۔

''السلام علیکم یاور بھائی''۔ اندر آتے ہی وہ اُس سے لپٹ گئی۔

"کیسی ہو؟ تمہارے چھوٹے شیطان کیسے ہیں اور — تمہارے جواد صاحب بہادر کیسے ہیں؟" اُس نے بہت پیار سے اُس کے بچوں اور شوہر کی خیریت دریافت کی۔

"سب ٹھیک ٹھاک ہیں"۔ وہ قریبی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگی۔ "ابھی ابھی نایاب کا فون آیا۔ کہ امی کے پاس کس وقت آرہی ہو۔ تاکہ میں یاور بھائی کے پاس چلی جاؤں۔

میں نے کہا۔ آپ وہیں رہیں۔ میں چلتی ہوں یاور بھائی کے پاس۔ جل کر رہ گئیں۔"

یاور خان دونوں کی نوک جھونک پر خوشگواری سے ہنس دیا۔

ملازم شاداب کے لئے بھی کپ لئے آیا۔ دونوں چائے پینے لگے۔ شاداب جیسے کسی سوچ میں، گومگو میں الجھی تھی۔

"یاور بھائی آپ کو پتہ ہے۔ شاندانہ کی منگنی ہوگئی۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"چند پل تو جیسے یاور خان کے دماغ نے میسج ہی نہیں لیا۔ اطمینان سے چائے کا گھونٹ حلق سے اتار رہا تھا۔

"آنٹی نورجہاں کے بیٹے ابراہیم سے ہوئی ہے شاندانہ کی منگنی"۔ شاداب نے دہرایا۔

"کیا مطلب؟" اب اُس کے ذہن نے میسج ریسیو کرلیا۔ کپ واپس میز پر رکھ دیا۔ یقین اُسے اب بھی نہیں آرہا تھا۔

"پچھلے دنوں آنٹی نورجہاں کا امی کے پاس فون آیا تھا۔ کہ ابراہیم نے شاندانہ کو منگنی کی انگوٹھی پہنا دی ہے۔ اُن کو وہ بہت پسند تھی۔ ابراہیم بھی اُسے پسند کرتا تھا۔ مگر اُس کے خاندانی جھگڑوں کی وجہ سے جھجک رہا تھا۔ بہرحال آنٹی نے اُسے آمادہ کیا اور منگنی ہوگئی۔" شاداب نے مختصراً بتایا۔



گو اُسے یہ خبر سناتے ہوئے وہ بہت پریشان تھی۔ وہ شاندانہ کے لئے سیریس تھا وہ جانتی تھی۔ شاداب کو بھی بہت دکھ تھا اِس بات کا، مگر — امی کے سامنے کسی کی ایک نہ چلتی تھی!

یاور خان چند ثانیے دم بخود سا بیٹھا رہا۔ شندی امی کو پسند نہیں تھی۔ خود وہ موقعہ پر موجود نہیں تھا۔ آنٹی نورجہاں نے موقع سے فائدہ اٹھایا تھا۔ امی کے سامنے تو وہ فریاد نہیں کرسکتا تھا۔ کہ اُن کی حالت اِس قابل ہی نہیں تھی۔ آنٹی نورجہاں سے بھی وہ کیا شکایت کرتا۔ کہ خود امی جو شندی کو اپنانے سے گریزاں تھیں تو کسی نہ کسی نے تو شندی کو اپنانا تھا۔ ہاں —

شندی نے کیسے حامی بھری؟ یہ بات ضرور انوکھی تھی!

جبھی اُس دن فون پر رو رہی تھی۔ ٹمپریچر کا بہانہ بنایا تھا، اکیلے پن کا بھی۔ مگر — رونا کوئی ایکسکیوز نہیں تھا!

غصے سے اُس کا چہرہ تمتما اٹھا۔ آنکھیں غضبناک ہوگئیں۔

ہاتھ بڑھا کر اُس کا نمبر ڈائیل کرنے لگا۔

"جی۔ شاندانہ بول رہی ہوں"۔ اُس طرف سے آواز آئی۔

"تم نے ابراہیم سے منگنی کرلی ہے؟" وہ گرجا۔

"میں... میں..." وہ اس اچانک وار کے لئے تیار نہیں تھی۔

"تمہیں اتنی جلدی تھی کہ میری واپسی کا انتظار بھی نہ کرسکیں"۔ اُس کی آواز میں دھاڑ تھی۔

"آپ... آپ میری بات تو سنیں..."

"میں کچھ نہیں سننا چاہتا۔ غلطی مجھ سے ہوئی ہے۔ تمہیں بہت انوسنٹ سمجھا تھا۔" "I hate you—I simply hate you." اور کھٹاک سے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔

شاداب چپ چاپ سہمی سی بیٹھی تھی۔ اِس قدر غیض وغضب میں اُس

نے یاور خان کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

یاور خان بے کل تھا۔ نادانستگی میں انگلیاں آپس میں پھنسا پھنسا کر کھول رہا تھا۔

شاداب اٹھی۔ اُس کے لئے پانی لے کر آئی۔

اس نے دو گھونٹ پی کر گلاس میز پر رکھ دیا۔

''یاور بھائی۔ منگنی شادی ... یہ تو سب قسمت کے فیصلے ہوتے ہیں۔ اُس کی قسمت ابراہیم کے ساتھ ہوگی۔ آپ کی کہیں اور لکھی ہوگی۔ ہوسکتا ہے اُس سے بھی کوئی اچھی لڑکی آپ کی منتظر ہو ...''

وہ خاموش تھا۔ اِس وقت اُسے کچھ سوجھائی نہ دیتا تھا۔

لنچ کے بعد شاداب امی کے پاس ہوسپٹل چلی گئی۔ اور نایاب اپنے میاں اور بچوں کی خیر خبر لینے اپنے گھر۔

یاور خان کا پل پل عذاب میں کٹ رہا تھا۔ اُس کی زندگی میں شاندانہ پہلی لڑکی تھی جس کے اُس نے باقاعدہ سپنے دیکھے تھے۔ اُس کی دلکش باتیں دل میں اتر گئی تھیں، اس کے شرمیلے انداز دھڑکنوں میں سما گئے تھے، اُس کی ہر ادا سانسوں میں بس گئی تھی!

وہ تو اُس کے رگ وپے میں سرایت کر گئی تھی۔ کہاں کہاں سے الگ کرتا اُسے؟

جبھی تو اُسے اُس پر غصہ آ رہا تھا۔ امی پر بھی آیا تھا مگر ـــــ وہ ماں تھیں اور ماں کے سامنے اُف کرنا اُسے گوارا نہ تھا!

اُسے آنٹی نور جہاں پر بھی رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا۔ کیسے تاک میں بیٹھی تھی۔ جب دیکھا کہ امی شاندانہ کے خلاف ہیں اُس کے لنڈن سدھارتے ہی بیٹے کی منگنی کر بیٹھیں۔ اور ابراہیم ـــــ ابراہیم تو اُسے شروع دن سے ہی زہر لگتا تھا۔



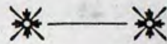
پر ـــــ سب سے زیادہ برہم وہ شاندانہ پر تھا۔ وہ حیران تھا کیسے اُس نے اتنی آسانی سے ابراہیم کو قبول کر لیا۔ کیا اتنی مہلت بھی اُن سے نہیں لے سکتی تھی کہ وہ لنڈن سے واپس آ جاتا؟

بہر حال ـــــ شام کو خود جا کر وہ امی کو گھر لے آیا۔ شاداب بھی ساتھ تھی۔

امی سے کچھ کہنے سننے کی گنجائش نہیں تھی کہ اُنہیں مکمل آرام کی ضرورت تھی۔ اور کسی بھی قسم کی پریشانی سے اُنہیں دور رکھنا تھا۔ اور پھر بات ہو بھی جاتی تو حاصل کیا ہونا تھا؟ وہی سگے سوتیلے کا لاحاصل سلسلہ!

اگلے دن یاور خان نے امی کا E.T.T ٹسٹ کروایا۔ اللہ کے فضل سے وہ بھی ٹھیک ٹھاک تھا۔ مطمئن ہو کر دونوں گھر آ گئے۔

نایاب اور شاداب بھی آج امی کے گھر آئی تھیں۔ یاور خان اب بھی بیقرار تھا۔ نایاب اور شاداب نے بہتیرا سمجھانے کی کوشش کی مگر تازہ تازہ لگا زخم تھا۔ اتنی جلدی تو مندمل نہیں ہوسکتا تھا۔ زیادہ تر وقت اُس نے دونوں بہنوں کے بچوں کے ساتھ گزارا۔



صبح صبح ایئر پورٹ پر اترا۔ تو لگا اُس کا سب کچھ لٹ چکا تھا۔ نہ اُسے گھر پہنچنے کی خوشی ہوئی، نہ ہوسپٹل کی۔ کہ نہ اُس کے پڑوس میں کوئی اُس کا منتظر تھا۔ اور نا ہی ہوسپٹل سے اُس کی آمد کی کوئی راہ دیکھ رہا تھا!

آج وہ باقی کولیگز سے بھی نہیں ملا۔ سارا دن ہوسپٹل میں خود کو جیسے گھسیٹتا رہا۔

شام سات بجے بستی کے قریب پہنچا۔ مین روڈ سے دائیں ٹرن لیا۔

حسب عادت شیشہ قدرے وا کیا۔ پھولوں، باغوں اور جھرنوں کی خوشبوئیں بہت اداس تھیں۔ شبنم کی آنکھ نم سی اور ـــــ نرم خرام ہوائیں ماتم کناں!



اُس نے شیشہ بند کر دیا۔ اوپر جاتے ہوئے موڑ کاٹا۔ بستی کے گھروندوں کے دیئے بجھے بجھے سے تھے۔ آسمان کے چراغ بے نور سے۔

اُس نے گہری سانس لی۔ درد تھا جس میں۔ کرب تھا جس میں۔

نگاہ اوپر شندی کی بالکنی پر گئی۔ کوئی نہیں تھا وہاں۔ آگے بڑھتے ہوئے اُس نے آخری موڑ کاٹا۔ اپنے گیٹ پر جا کر کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ تو نہ چاہتے ہوئے بھی نظریں ویومرر پر گئیں۔

وہیں شندی اپنے درَوازے کے پاس کھڑی تھی۔ جانے کیوں کھڑی تھی؟

کیا اِسی طرح ہوا کرے گا؟ وہ یوں اُسے نظر آتی رہے گی۔ تو بھول پائے گا وہ اُسے؟

نظریں واپس پھیرتے ہوئے اس نے گیٹ پر جما دیں۔

گیٹ کھلا۔ تو وہ اندر داخل ہوگیا۔ اوپر اپنے بیڈ روم میں گیا۔ کپڑے تبدیل کئے اور ـــــ

بالکنی میں آ کھڑا ہوا۔ شندی اب بھی حواسوں پر چھائی ہوئی تھی۔

گھر کے دروازے کے پاس کھڑی آج پہلی بار وہ اُسے اجنبی اجنبی سی لگ رہی تھی۔ کسی اور کی ہوگئی تھی نا!

نو ـــــ ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا۔ وہ کیا کریگا؟ کیسے رہے گا اُس کے بغیر؟

اُس کا دل کسی کمسِن lover کی طرح مچلا۔

تبھی حمید اُس کے لئے کوفی لے آیا۔ وہیں بالکنی میں ٹیبل پر رکھ گیا۔

گھونٹ گھونٹ کر کے پیتا وہ خالی خالی نظروں سے سامنے تک رہا تھا۔

'یاور خان اداس ہے' بے نور سے تارے نے اپنے ساتھی سے کہا۔

پُرنم آنکھ لئے شبنم نے بھی سن لیا۔ چپکے سے رو دی!

وہ اور بھی اداس ہوگیا۔ جی میں آیا۔ اُس سے بات کرے۔ پوچھے کہ یہ سب کیوں اور کیسے ہوا؟ اُس نے ابراہیم کو یاور خان پر کیوں ترجیح دی؟ سب

اُس کی عدم موجودگی میں کیوں ہوا؟ مگر پھر ــــ

خودداری آڑے آئی۔ یہ سب دریافت کرنا ایسے ہی تھا جیسے اسے اُس کی بہت پرواہ تھی۔ اور وہ اُس کی پرواہ اِس لئے نہیں کرنا چاہتا تھا کہ یہ سب کر کے اُس نے اُس کی انسلٹ کی تھی۔ اور اپنی انسلٹ وہ کسی طور برداشت نہیں کر سکتا تھا!

وقت نے بڑے بڑے گھاؤ بھرے تھے۔ اُس کا زخم بھی مندمل ہو جاتا!

کوفی کا خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے وہ اندر کمرے میں آ گیا۔ سخت تھکا ہوا تھا۔ اِس کے باوجود نیچے جا کر گاڑی میں بیٹھتے ہوئے ڈاکٹر نادر کی طرف چلدیا۔ کچھ تو وقت کٹ جاتا!

رات دیر سے گھر لوٹا۔ تو آنٹی نور جہاں کا فون آ گیا۔

''بیٹے۔ میں نے تمہارے گھر پتہ کروایا تو تم نکل چکے تھے۔ میرا خیال تھا کہ تم ڈنر ہمارے ساتھ کر لیتے''۔ وہ شفقت سے بولیں۔

اُسے تیرت ہوئی۔ وہ تو یوں بات کر رہی تھیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ شاید اُن کی دانست میں سب ٹھیک تھا۔ کہ امی تو شاندانہ کو ویسے بھی نہیں اپنا رہی تھیں۔ سو اُنہوں نے اپنالی۔

''تھینک یو آنٹی۔ بس میں اپنے ایک کولیگ کے یہاں چلا گیا تھا۔'' اُس نے بھی کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔

''ماں کیسی تھی تمہاری؟ نایاب اور شاداب۔ سب ٹھیک تو تھے نا؟''

''امی کو تھوڑی پرابلم ہو گئی تھی۔ مگر اب ٹھیک تھیں''۔ اُس نے مختصراً امی کی پرابلم بتائی۔

''اوہ۔ شکر ہے خیریت گزری۔ میں کل فون کروں گی اُسے ...''

تھوڑی دیر دونوں باتیں کرتے رہے۔ پھر فون کر دیا۔

آنٹی کی باتوں سے تو کسی عناد کی بو نہیں آ رہی تھی۔ پھر؟ شاندانہ نے



کیوں نہیں کہا کہ وہ یاور خان کے ساتھ Committed تھی اس لئے کسی اور کے ساتھ منگنی نہیں کر سکتی تھی؟ ایک بار پھر اُسے سارا غصہ شاندانہ پر آ گیا۔

اُس کی باتوں سے، اُس کی آنکھوں کی ہر جنبش سے، اُس کی ہر ادا سے اُس کے لئے پیار ٹپکتا تھا۔ پھر کیسے وہ اتنی جلدی سب پسِ پشت ڈال گئی؟

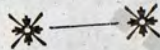
اُس کا ہاتھ فون کی طرف بڑھا۔ اپنا غصہ اُس پر نکالنے کو۔ لیکن ــــ

پھر خود کو کنٹرول کر لیا۔ کہ اِس کا یہی تو مطلب تھا کہ اُسے اُس کی پرواہ تھی۔ کبھی نہیں۔ نہیں کرے گا وہ اُس کی پرواہ!

اور پھر ــــ وہ بھی تو اُسے فون کر سکتی تھی۔ وہ کیوں نہیں کر رہی تھی اُس کو فون؟

اوہ ــــ اُسے فوراً خیال آیا۔ اب وہ ابراہیم کی امانت بن چکی تھی اور وہ اِس امانت کی حفاظت کر رہی تھی۔ ہہہ ــــ ابراہیم!

رات دیر تک اُسے نیند نہیں آئی۔ کروٹوں پر کروٹیں بدلتا رہا۔ اُس پر غصہ ہونے کے باوجود وہ اُسے یاد آ رہی تھی۔ وہ کب اُسے بھول پائے گا؟ کتنا عرصہ لگے گا؟ اور اب وہ وقت جلدی جلدی گزرنے کی تمنا کرنے لگا۔



موسم بہت خوبصورت ہو رہا تھا۔ آسمان پر بگلہ سے سفید بادل منڈلا
رہے تھے۔ نوخیز ہریالیوں میں قدرت سرگوشیاں کر رہی تھی اور___
یخ بستہ شام گھر آئی تھی!
چھٹی کے بعد وہ گھر کی طرف رواں دواں تھا۔ وائنڈنگ پتلی سڑک
کے بائیں جانب آبادی اور چھوٹی چھوٹی ٹیرسڈ کھیتیوں میں اُگی فصلیں، دائیں
جانب ہری بھری پہاڑیاں اور اکا دُکا گھر۔ پھر___
وہ دائیں طرف جج صاحب کی پرائیویٹ روڈ پر مڑا۔



پچھلے چند دنوں سے شاندانہ اُسے اپنی بالکنی میں نظر نہیں آتی تھی۔ جانے
کیا وجہ تھی؟ بہر حال___
وہ دھیمی رفتار سے آگے ہی آگے بڑھ رہا تھا۔ شاندانہ کی بالکنی کے نیچے
والی سڑک پر سے ہوتے ہوئے وہ گھوم کر سامنے آ گیا۔ گاڑی اپنے گیٹ کی
طرف لے جانے لگا تو نظریں غیر ارادی طور پر شندی کے گھر کی طرف اٹھیں۔
اِس وقت پھر پچھلے دروازے کے پاس شندی اور ابراہیم کھڑے تھے۔
ابراہیم اُسے ایک پیکٹ تھمانے آگے بڑھاتا تھا۔ مگر جوں ہی شندی
لینے کو ہاتھ بڑھاتی وہ پیکٹ اپنے سر سے اوپر لے جاتا۔ شندی آگے بڑھنے سے
جھجک کر رک جاتی۔ وہ پھر پیکٹ اُس کی طرف بڑھاتا۔ پھر وہ لینے کو بڑھتی۔ پھر
وہ پیکٹ سر سے اونچا لے جاتا۔ پھر شندی رک جاتی...
اِس وقت واقعی اُس کا دل چاہا اپنے پستول کی ساری گولیاں ابراہیم
کے سینے میں اتار دے۔ مگر___
''ہہہ۔'' اُس نے تلخی سے وہیل پر ہاتھ مارا___ شندی اُس سے یہ
اختیار چھین چکی تھی۔ کتنا بے بس ہو گیا تھا وہ!
جانے کیا سوجھی اُسے؟ گیٹ میں ہی میوہ خان سے ڈنر باہر کھانے کا کہا
اور گاڑی واپس موڑ لی۔ دوبارہ نیچے مین روڈ پر آ گیا۔ اب پھر وہ شہر کی طرف جا
رہا تھا۔ ڈاکٹرز ہوسٹل میں اپنے دوستوں کے پاس۔
کیوں نہ وہ بھی ہوسٹل شفٹ ہو جائے؟ روز روز کے یہ سین تو نظر نہیں
آئیں گے۔ اینکسی کا پچھلا دروازہ، شاندانہ اور ابراہیم___ پچھلا دروازہ،
شاندانہ اور ابراہیم۔ اپنے آگے، دائیں، بائیں___ اُسے یہی کچھ نظر آنے لگا
اور___
گاڑی سامنے موڑ میں سے نکلتی گاڑی سے ٹکرا دی۔
اُسے ہوش آیا۔ تو وہ اپنے ہوسپٹل کے V.I.P روم میں تھا۔ بایاں بازو

فریکچر ہونے کی وجہ سے اُس کی سرجری ہوئی تھی۔ جگہ جگہ زخموں پر ڈریسنگ ہوئی تھی اور ڈاکٹر نادر بھی اُس کے کمرے میں موجود تھا۔

"Damn it ... I'm telling you, I won't lie down on the bed." یاور خان نے جھنجھلاتے ہوئے ڈاکٹر نادر سے کہا۔

وہ مسکرا دیا۔

''سَر شکر کریں جان بچ گئی ہے۔ اتنا خوفناک ایکسیڈنٹ ہوا ہے کہ... دو چار دن تو بیڈ پر رہنا ہی پڑیگا''۔

''میں اکیلا نہیں رہوں گا۔ تم بھی میرے ساتھ رہو گے اِسی کمرے میں۔'' ہاتھ پاؤں سیدھے کیئے چھت کو گھورتے وہ کیسے پڑا رہتا اتنے دن؟

"O kay. I'll convey your message to Dr. Nadia."

اور ــــ اُس کا بے ساختہ قہقہہ بلند ہوا۔

بہت ساری چوٹوں کی وجہ سے اُس کی ہنسی بھی مضمحل سی پڑ گئی تھی۔

''میں نے جج صاحب کو اطلاع کر دی ہے آپ کے ایکسیڈنٹ کی۔'' نادر نے اُسے مطلع کیا۔

''میرا خیال ہے کوئی خاص ضرورت نہیں تھی''۔ اُس کی آواز بھی کمزور پڑتی جا رہی تھی۔

''سَر آپ کی گاڑی کو بھی وہاں سے اٹھوانا ہے۔ اور پھر وہ میاں بیوی آپ کے بزرگوں کی حیثیت رکھتے ہیں''۔ اُسے یاور خان اور جج صاحب کے فیملی Terms کا پتہ تھا۔

معاً اُس کی نظروں میں ابراہیم، پھر شاندانہ اور پھر ــــ ایکسیڈنٹ کا وقت گھومنے لگا۔

اُس نے تھکی تھکی آنکھیں موندلیں۔ غالباً دواؤں کا اثر تھا۔ اُسے غنودگی آنے لگی۔



اُسے کمرے میں شفٹ ہوئے گھنٹہ بھر ہوا تھا۔ کہ آنٹی نور جہاں اور انکل ذوالفقار پہنچ گئے۔ دونوں دیر تک اُس کے پاس رہے۔ اُس کا ڈنر آیا۔ تو آنٹی نے اُس کا سرہانا اونچا کیا تکیے درست کیئے، اور شفقت سے سُوپ پلاتی رہیں۔ انکل تو چلے گئے۔ مگر وہ باوجود یاور خان کے کہنے کے گھر نہیں گئیں۔ وہیں اُس کے پاس رہیں۔ ماں کی طرح اُس کی دیکھ بھال کرتی رہیں۔ اِس دوران اُس کے دوست بھی آتے رہے۔ بارہ بجے کے قریب اُس کا کولیگ ڈاکٹر فیاض آ گیا۔ تو وہ گھر چلی آئیں۔

نور جہاں بانو نے رات کو ہی بہت سوچ بچار کے بعد نایاب کو فون پر یاور خان کے ایکسیڈنٹ کا بتا دیا تھا۔ تسلی بھی دی تھی کہ کوئی پریشانی کی بات نہیں تھی۔ انیسہ بیگم کو بھی طریقہ سے بتا دینے کا کہہ دیا تھا۔ کہ ماں تھیں۔ کل کو اُن ہی سے گلہ کرتیں کہ اُنہیں اطلاع نہیں کی۔ یہ بھی کہا تھا کہ اُن کے آنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یاور خان کی ٹھیک ٹھاک کیئر ہو رہی تھی۔

صبح ہوئی تو نایاب نے فون پر ماں سے یاور خان کے ایکسیڈنٹ کا یوں ہی ساذ کر کیا۔ کہ اُنہیں پتہ بھی چل جائے۔ اور گھبرا بھی نہ جائیں مگر ــــ

انیسہ بیگم کو تو ہول اٹھنے لگے۔ فوراً ایئر لائن فون کیا۔ خوش قسمتی سے ساڑھے نو بجے کی فلائیٹ میں سیٹ مل گئی۔ اور ــــ

دن کے گیارہ بجے ایئرپورٹ پر اترتے ہوئے سیدھی ہوسپٹل پہنچ گئیں۔ ڈاکٹر نادر اُنہیں یاور خان کے کمرے میں لے آیا۔

''ہائے میرا بچہ''۔ جگہ جگہ پٹیاں، کمزور چہرہ، آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے دیکھتے ہی وہ تو بیچ کمرے میں کھڑی کی کھڑی رہ گئیں۔

یاور خان نے آہستہ سے آنکھیں کھولدیں۔ امی کو دیکھ کر خوشی بھی ہوئی حیرت بھی۔

"امی آپ کو کس نے بتایا؟ خواہ مخواہ تکلیف کی۔" اُس نے کروٹ اُن کی طرف لینا چاہی مگر ابھی زخموں میں تکلیف خاصی تھی ایسا نہ کرسکا۔

"خواہ مخواہ تکلیف کی؟" وہ رو رہی تھیں۔ پاس آ کر بستر کی پٹی پر بیٹھتے ہوئے اُسے بے اختیار چومنے لگیں۔ "اللہ تیرا شکر ہے میرے بچے کی جان بچ گئی۔ یا اللہ تیرا کتنا بڑا احسان ہے مجھ پر۔ اِسے کچھ ہو جاتا تو میں تو جیتے جی مر جاتی..." اُن کے آنسو تواتر سے بہہ رہے تھے۔

"امی پلیز! میں ٹھیک ہوں ... آپ اِن سے پوچھ لیں۔" اُس کا اشارہ ڈاکٹر نادر کی طرف تھا۔

"آنٹی! یہ بالکل ٹھیک ہیں۔ سرسری زخم آئے ہیں۔ جلدی ٹھیک ہو جائیں گے"۔

"ارے بیٹا۔ بازو میں فریکچر ہے اتنے سارے زخم ہیں تیز بخار ہے۔ ٹھیک کیسے ہے؟" وہ برابر رو رہی تھیں۔

"اِن کو دوا دی ہے۔ بخار ابھی اتر جائے گا۔ پھر یہ ٹھیک ٹھاک نظر آئیں گے"۔ ڈاکٹر نادر مسکراتے ہوئے بولا۔

"ڈاکٹر صاحب۔ امی کے لئے چائے ..." یاور خان نے ڈاکٹر نادر سے کہا۔

"ہاں سر۔" ڈاکٹر نادر کمرے سے باہر نکل گیا۔

اور ___ امی اکیلے میں اور زیادہ رو دیں۔

یاور خان پریشان سا اُنہیں دیکھا رہا۔ اُٹھ کر اُنہیں تسلی بھی نہیں دے سکتا تھا۔

امی دل کا بھڑاس نکال چکیں تو اٹھیں۔ کرسی اٹھا کر اُس کے قریب رکھی اور اُس پر بیٹھ گئیں۔

غور سے ایک بار پھر اُس کے چہرے کو تکنے لگیں۔ آنکھ کے اوپر ماتھے پر



بھی سٹچز آئے تھے۔ چہرہ کس قدر زرد اور آنکھوں کے نیچے حلقے کتنے نمایاں تھے۔ لگتا تھا بہت خون نکل گیا تھا۔

وہ اُس کے چہرے پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنے لگیں۔ آنکھیں ایک بار پھر نم ہوگئیں۔ کہیں اُسے کچھ ہو جاتا تو؟ وہ کانپ کر رہ گئیں!

"امی"۔

"جی بیٹا"۔

"آپ مجھ سے بہت پیار کرتی ہیں نا؟" اِس وقت وہ بھی جذباتی ہونے لگا۔ اُسے معلوم تھا وہ اُس سے بہت پیار کرتی تھیں۔ پھر کیوں اُس کی خواہش پوری نہیں کی تھی؟

"میری جان۔ یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔" اُنہوں نے اُس کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے بوسہ دیا۔

وہ چند پل خاموش رہا۔

"میں دکھی ہوتا ہوں تو آپ بھی دکھی ہوتی ہیں نا؟" وہ پھر بولا۔

"تم دکھی ہوگے تو میری جان چلی جائے گی۔" وہ بار بار اُس کا ہاتھ چوم رہی تھیں۔

"امی۔ مجھے اگر کوئی چیز پسند آجاتی تھی۔ تو آپ ہزاروں میل دور سے میرے لئے منگوا دیتی تھیں ... جب میں چھوٹا تھا۔ تو ایک برگر کی فرمائش پر آپ رات گئے میلوں گاڑی بھگا کر میری خواہش پوری کرتی تھیں مگر ..."

اُس کی باتوں میں دکھ تھا، اداسی تھی ___ شکوے تھے، شکایتیں تھیں!

وہ جیسے کچھ کچھ سمجھنے لگیں۔

"مگر کیا؟ میری جان"۔ وہ بہت شفقت سے بولیں۔

"مگر... اب... ایسا نہیں کرتیں..."

انیسہ بیگم کا دل کٹ کر رہ گیا۔

معاً... دروازہ کھلا۔ اور وارڈ بوائے اُن کے لئے چائے لیکر آ گیا۔
ارے پریشانی کے اُنہوں نے صبح ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔ اِسی طرح چل پڑی تھیں
یک کپ چائے کی اِس وقت اُنہیں واقعی طلب ہو رہی تھی۔

امی سارا دن اُس کے پاس رہیں۔ شام چار بجے نور جہاں بانو اور
براہیم آ گئے۔ اُس کے دلی جذبات سے بے خبر ابراہیم نے یاور خان سے ہاتھ
لایا۔ خیریت دریافت کی اور ___

یاور خان کو ایک مختصر سی خواہش ہوئی۔ بس اُس کی گردن مروڑ کر اُس کا
رخ دوسری طرف کر دے کہ اُسے اُس کی منحوس شکل نظر نہ آئے!

نور جہاں بانو کے اصرار پر انیسہ بیگم گھر چلی گئیں۔ خود نور جہاں بانو نے
اُن کی جگہ سنبھال لی۔ رات کو انیسہ بیگم نے دوبارہ آنا تھا۔ مگر یہ فیصلہ یاور خان پر
چھوڑا گیا کہ رات کو امی اُس کے پاس رہیں یا نرس کافی تھی۔ کہ بقول یاور خان
امی کے لئے آج کی Exertion ہی کافی تھی!

انیسہ بیگم گھر آ گئیں۔ اوپر اپنے کمرے میں گئیں۔ نہا دھو کر کپڑے
تبدیل کئے۔ حمید سے چائے لانے کا کہا اور ___ باہر کھلے ٹیریس میں آ کر ریلنگ
کے قریب کرسی پر بیٹھ گئیں۔

کراچی میں ان دنوں زبردست حبس ہو رہی تھی مگر ___ یہاں واقعی
جنت کا سا سماں تھا۔

جج صاحب کا گاؤں قدرتی حسن سے مالا مال تھا۔ اونچی نیچی ہری بھری
پہاڑیاں، اوپر تلے کچے پکے گھروندے، گنگناتے جھرنے، بل کھاتی پگڈنڈیاں،
سیاہ گھٹائیں، بارش کی پھواریں یا پھر بادلوں سے آنکھ مچولی کھیلتا سورج!

اِس وقت بھی آسمان پر بادلوں کا راج تھا۔ اور بارش اب برسی کہ اب!

یاور خان کو رم جھم پڑتی پھواریں بہت اچھی لگتی تھیں، سورج اور بادلوں
کے دھوپ چھاؤں کا کھیل بہت پسند تھا...



'امی۔ مجھے اگر کوئی چیز پسند آ جاتی تھی۔ تو آپ ہزاروں میل دور سے
میرے لئے منگوا دیتی تھیں...' یاور خان کی صبح کہی بات اُن کے کانوں میں
گونجی۔

اُس کی پسند کے عین مطابق یہاں سے کچھ فاصلے پر پہاڑی کی چوٹی پر
گھر بنانے کے لئے پلاٹ اُنہوں نے ہی تو یاور خان کے لئے خریدا تھا۔

'جب میں چھوٹا تھا تو ایک برگر کی فرمائش پر آپ رات گئے میلوں
گاڑی بھگا کر میری خواہش پوری کرتی تھیں مگر ___'

اُس کی باتوں میں دکھ تھا، اداسی تھی ___ شکوے تھے، شکایتیں تھیں!
وہ کچھ کچھ سمجھنے لگی تھیں۔ اُس کا اشارہ نفیسہ کی بیٹی کی طرف تھا۔

'مگر کیا؟ میری جان۔' اُنہوں نے کہا تھا۔

'مگر... اب... ایسا نہیں کرتیں...'

انیسہ بیگم کا دل اب بھی کٹ کر رہ گیا۔ آنکھیں نم ہو گئیں ___ اُن کا لاڈلا،
اکلوتا یاور ___ زندگی میں پہلی بار اُن سے شکوہ کیا تھا۔ بہت تکلیف میں تھا نا، دل
کی بات زبان پر آ گئی تھی۔ ورنہ تو اتنا عرصہ تو اُف تک نہیں کی تھی۔ نایاب اور
شاداب ہر بات صاف کہہ دیتی تھیں۔ مگر یاور، اُن کی جان، بہت صابر تھا۔ آج
جسمانی تکلیف حد سے بڑھ گئی تو زبان پر بھی شکایت آ گئی!

اُن کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ غصے کی تو وہ سخت تھیں وہ مانتی تھیں مگر ___ ایک
بے مثال ماں بھی تو تھیں۔ آج اُن کی جان کو تکلیف تھی ___ روح کو کیسے قرار
آ گیا؟

معاً ___ دائیں جانب کچھ آہٹ سی ہوئی۔

اُنہوں نے دیکھا۔ اینکسی سے دو چار گز پرے مسٹرڈ رنگ کے کپڑوں
میں ملبوس اُن کی طرف پیٹھ کئے ایک لڑکی تار پر سے کپڑے اتار رہی تھی۔
ک... کہیں... یہی تو نفیسہ کی بیٹی نہیں تھی؟ جانے کیوں وہ عینک

درست کرتے ہوئے غور سے اُسے دیکھنے لگیں۔ آج پہلی بار وہ بغیر کسی عداوت کے اُس کو دیکھ رہی تھیں۔

کپڑے بازو پر ڈال ـــ اُس نے رخ موڑا۔

لمبا قد، نہایت متناسب جسم، پرکشش نقوش، بڑی بڑی حسین آنکھیں اور بہت خوبصورت بال۔

اردگرد سے بے خبر وہ اینکسی کے پچھلے دروازے سے اندر چلی گئی۔

یہ شکل تو بہت جانی پہچانی سی تھی۔ غیر نہیں لگ رہی تھی بالکل بھی!

تبھی ـــ حمید چائے لے آیا۔ ساتھ میں بسکٹ بھی۔

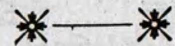
سوچوں میں گم ـــ وہ دھیرے دھیرے چائے پیتی رہیں۔

مغرب کی اذان ہوئی۔ تو اُنہوں نے وہیں ٹیرس میں نماز پڑھ لی۔ دیر تک شکرانے کے نفل پڑھتی رہیں۔ اللہ کے حضور شکر کر کر کے روتی رہیں، گڑگڑاتی رہیں۔ کہ خدانخواستہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ راستے میں انہوں نے اُس کی ابھی بھی وہیں پڑی چکنا چور گاڑی دیکھ لی تھی۔ جس میں سے اُس کا زندہ بچ نکلنا کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔

خنکی خاصی بڑھ گئی تھی۔ جائے نماز تہہ کرتے ہوئے وہ اندر آ گئیں۔

رات ڈنر کے بعد دوبارہ یاور خان کے پاس چلی گئیں۔ گھر میں قرار ہی نہیں آ رہا تھا۔

پھر ـــ یاور خان کے منع کرنے کے باوجود رات وہیں صوفے پر پڑ رہیں۔





انیسہ بیگم فجر کی نماز کے لئے اٹھیں تو سارا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ زبردست فلو ہوا ہوا تھا۔ کل شام دیر تک کھلے ٹیرس میں بیٹھی رہی تھیں۔ ٹھنڈ لگ گئی تھی۔

نماز پڑھنے کے بعد دیر تک جائے نماز پر بیٹھیں آیاتِ شفا پڑھ پڑھ کر بے خبر سوئے یاور خان پر دم کرتی رہیں۔

پھر اُٹھیں۔ اپنے لئے ایک کپ چائے بنائی۔ گرم گرم پی لی تو طبیعت قدرے بحال ہوگئی۔ دوبارہ بستر میں لیٹ گئیں۔

آٹھ بج رہے تھے۔ ہوسپٹل کا عملہ حرکت میں آ چکا تھا۔ یاور خان کی بھی

آنکھ کھل گئی۔ امی کو دیکھا تو چونک اٹھا۔ اتنی دیر تک وہ کبھی بستر میں نہیں رہتی تھیں۔

''امی۔آپ ٹھیک تو ہیں نا؟'' اُس نے پوچھا۔

''ہاں بیٹا۔فلو ہو گیا ذرا۔ چائے پی لی ہے ٹھیک ہو جائے گا''۔ وہ شال سے منہ ڈھانپتے ہوئے بولیں۔

اُنہیں معلوم تھا۔ کوئی اور ان سے فلو لے نہ لے، یاور خان کے تو جیسے پیچھے فلو بھاگتی تھی۔

''امی ۔ بیمار کر دیا نا خود کو۔ صوفے پر لیٹیں الگ بے آرام ہو رہی ہیں۔ پلیز گھر چلیں۔''

''مجھے چھوڑو۔ تمہاری طبیعت کیسی ہے جان؟'' وہ بستر میں بیٹھتے ہوئے بولیں۔

پاس نہیں آ رہی تھیں کہ ___ اُنہیں ڈر تھا وہ اُن سے فلو کیچ کر لیتا۔

''میں ٹھیک ہوں۔ بس آپ گھر چلیں۔ میوہ خان اِدھر ہی ہے۔ آپ کو لے جائے گا۔''

ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے اُس نے سائیڈ ٹیبل پر سے اپنا سیل فون اٹھایا۔ اور میوہ خان کو اوپر بلا لیا۔

پیڈ پر کچھ دوائیاں لکھیں۔ میوہ خان کو نسخہ پکڑایا اور ___ امی کو دوائیاں سمجھاتے ہوئے اُس کے ساتھ گھر روانہ کر دیا۔

انیسہ بیگم نے بھی اصرار نہیں کیا۔ کہ وہ پہلے ہی ٹھیک نہیں تھا۔ اوپر سے فلو بھی ہو جاتا۔ تو اور مشکل ہو جاتی۔

انیسہ بیگم اور میوہ خان گھر کے لئے رواں دواں تھے۔ ایک Mitsubishi کار آگے آگے جا رہی تھی۔ نہ راستہ دے رہی تھی، نہ سپیڈ کر رہی تھی۔



''بیگم صاحبہ میں نے مُسّابیش چلائی ہے۔ بہت شاندار گاڑی ہے...''

وہ اپنے آگے چلتی مِتسوبیشی کو دیکھتے دیکھتے گویا ہوا۔

اور ___ مِتسوبیشی کو مسّابیش کہتے سن کر انیسہ بیگم نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روکی۔

وہ اِسی طرح کچھ کا کچھ بنا کر بول لیتا تھا۔

''ہاں ہے تو۔ اچھا سنو۔ میں نے تم سے کہا تھا۔ شمیم کو ہوسپٹل لیجا کر چیک اَپ کرواؤ۔ کروایا تم نے؟'' انہوں نے میوہ خان سے پوچھا۔

ابھی چند روز قبل ہی میوہ خان نے فون پر انیسہ بیگم کو خوشخبری سنائی تھی کہ اُن کی بہو، یعنی میوہ خان کی بیوی اُمید سے تھی۔ اور اُنہوں نے اُسی وقت اُسے کہہ دیا تھا۔ کہ وہ اُس کا باقاعدہ چیک اپ کرواتا رہے۔ تاکہ آگے جا کر کوئی پیچیدگی پیدا نہ ہو۔

میوہ خان شرما گیا۔ فوراً مفلر سے چہرہ چھپا لیا۔

''جی بیگم صاحبہ''۔

''سب ٹھیک ٹھاک تو ہے نا؟''

''جی بیگم صاحبہ۔ اور ___ آپ کو پتہ ہے آپ کی بہو کیا کہتی ہے؟''

''کیا کہتی ہے؟''

''ٹی وی میں اشتہار دیکھ دیکھ کر کہتی ہے کہ ایسے ہی ڈمپر بچے کے لئے لانے ہوں گے...''

ڈمپر ___ ایک پل کو انیسہ بیگم نے سوچا۔ اور پھر بے اختیار ہنس دیں۔

گاڑی چلاتے چلاتے اُس کا بھی بس دھیان کبھی گاڑیوں میں اور کبھی گاڑیوں کے کل پرزوں میں اٹکا رہتا تھا۔

''ڈمپر نہیں۔ ڈائپر۔ بیوقوف ...'' اُن کے لب و لہجے میں اُس کے لئے شفقت تھی۔

"بس بیگم صاحبہ۔ بہت دل چاہتا ہے کہ انگریزی بولوں۔ لیکن کیا کروں آتی جو نہیں ہے۔ ہمارے ڈاکٹر صاحب کیا انگریزی بولتے ہیں۔ بہت زبردست لگتے ہیں۔ اُس وقت۔ ویسے بھی ہمارے صاحب کی پرس... نل... ٹ بہت شاندار ہے..."

'پرسنیلیٹی' کو کیا جوڑ جوڑ کر آخر میں 'ی' ہی غائب کر دی تھی۔ اُنہیں پھر ہنسی آ گئی۔

"آتی ہے یا نہیں۔ مطلب تو سمجھا لیتے ہو نا۔ یہی کیا کم ہے"۔ وہ ہنستے ہنستے بولیں۔

"اِسطرح تو مجھے بے شمار لفظ آتے ہیں۔" وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔ "شمیم کے ساتھ ہر وقت بولتا رہتا ہوں"۔

"اچھا؟"

یوں ہی باتیں کرتے وہ بستی پہنچ گئے۔ میوہ خان اوپر ہی اوپر بڑھ رہا تھا۔ آخری موڑ کاٹا۔ تو انیسہ بیگم کی نظریں سیدھی شندی کی اینکسی پر گئیں۔ وہیں اینکسی کے باہر شندی زمین پر بیٹھی ایک چھوٹے سے میمنے کی پیٹھ پیار سے سہلا رہی تھی۔ اور___ ابراہیم پاس کھڑا اُسے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

پتہ نہیں کیوں؟ انیسہ بیگم کو ابراہیم، اور اُس کا شندی کو دیکھ دیکھ کر مسکرانا ایک آنکھ نہیں بھایا۔

اچانک جیسے شندی اُنہیں اپنی سی اور وہ غیر لگنے لگا۔

"یہ دیکھو۔ یہ مشٹنڈا یہاں کیا کر رہا ہے؟ دن دھاڑے جوان لڑکی کے ساتھ کھڑا ہے"۔

میوہ خان کی بھی بائیں جانب اُن دونوں پر نظر گئی تھی۔ مگر فوراً ہی رخ واپس موڑ لیا تھا۔

قدرے آگے بڑھتے ہوئے وہ گاڑی گیٹ کے اندر لے گیا۔



"یہ پہلے بھی آیا ہے اِس طرح اِس کے پاس؟" وہ گاڑی سے اترتے اترتے جیسے کچھ تشویش سے پوچھنے لگیں۔

وہ تو اکثر آتا رہتا تھا۔ کوئی نئی بات تو نہیں تھی!

"آنے دیں بیگم صاحبہ۔ آپ کیوں فکر کرتی ہیں..."

"ارے کیسے آنے دوں۔" وہ اُس کی اَن سنی کرتے ہوئے قدرے تیزی سے کہنے لگیں۔ "کیسے فکر نہ کروں..."

تبھی___ اُن کا سیل بج اٹھا۔

کان سے لگائے لگائے وہ اندر کی طرف بڑھیں۔ نایاب کا فون تھا۔ بھائی کی خیریت ہوسپٹل میں تو پوچھ چکی تھی۔ اب اُن سے تفصیلاً بات کرنا چاہتی تھی۔

"ابھی ابھی ہوسپٹل سے آ رہی ہوں۔ اوپر بیڈروم میں جاتی ہوں۔ تم بند کرو۔ بستر میں لیٹ کر میں خود فون کرتی ہوں۔ دراصل فلو ہو گیا ہے مجھے۔ سارے جسم میں درد ہو رہا ہے..."

نایاب نے فون بند کر دیا۔ انیسہ بیگم کچن میں حمید کو اپنے اور میوہ خان کے لئے ناشتے کا کہتے ہوئے اوپر چلی گئیں۔ کچھ کھا لیتیں تو دوائی بھی لے لیتیں۔

بستر میں لیٹیں تو قدرے آرام آنے لگا۔

پھر نایاب کو فون ملایا۔ اور سارا حال احوال بتا دیا۔

حمید اُن کے لئے ناشتہ لایا۔ میوہ خان نے دوائیاں دیں۔ اور انیسہ بیگم سر منہ لپیٹ کر پڑ رہیں۔

آدھے گھنٹے بعد ہی آہستہ آہستہ بہتر ہونے لگیں۔ جسم کا درد معدوم ہونے لگا۔ اور طبیعت ہلکی محسوس ہونے لگی۔

آہستہ سے بستر سے اٹھیں۔ الماری سے کلامِ پاک نکالا اور تلاوت کرنے لگیں۔

دھوپ ڈھل رہی تھی۔ خنکی بڑھ رہی تھی اور ___ سیندوری شام فسوں گر وادی کو اپنے سیندور میں رنگ رہی تھی۔

اپنی بالکنی میں کھڑی شندی یاور خان کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ جب سے اُس کے ایکسیڈنٹ کا سنا تھا۔ بیقرار تھی۔ بہت دل چاہتا تھا اُس کی خیریت معلوم کرنے کو۔ کہ باقی باتیں ایک طرف، وہ اُس کا کزن بھی تو تھا لیکن ___ ہمت نہیں کر پا رہی تھی۔ ایک تو اُس کے غصے سے خائف تھی، دوسرے ___ اُس کی آواز سن کر یادوں نے مزید یلغار کر دینی تھی۔

بھولی تو وہ اُس کو ایک پل بھی نہیں تھی۔ سانس لینا کیسے بھول جاتی وہ؟ اُس کو تو اُس نے زندگی مان لیا تھا!

گہری سانس لیتی وہ کمرے سے کچن میں آ گئی۔ وہیں ماما رات کا کھانا بنانے کی تیاری کر رہی تھیں۔

''ماما۔''

''جی بیٹا۔''

''ماما... وہ... ڈاکٹر صاحب کی خیریت تو پوچھنی چاہئے''۔ وہ کچھ جھجکتی سی بولی۔

''صبح سے میں بھی یہی سوچ رہی ہوں ... لیکن پھر خیال آتا ہے۔ آگے سے پتہ نہیں کیا جواب دیں''۔

''نہیں۔ آپ کے ساتھ وہ کبھی ایسا نہیں کریں گے۔ میں جانتی ہوں اُنہیں ...'' کہتے کہتے وہ اُداس سی نظر آنے لگی۔

''ٹھیک ہے۔ میں فون کرتی ہوں''۔ اُنہوں نے ہاتھ دھوئے، تولیے سے خشک کئے۔ اور کچن سے باہر نکل آئیں۔

شندی کی نظر کچن کی کھڑکی سے باہر گئی۔ نور محمد کی بھیڑ کا منا سا سفید بچہ اُس طرف آ نکلا تھا۔



ہڈیوں کی چیرتی سردی کی شدت کم پڑتے ہی جہاں بستی کے مکینوں نے سکھ کا سانس لیا تھا۔ وہاں اُن کی بھیڑ بکریوں نے بھی آس پاس چرنا شروع کر دیا تھا۔

شندی کو بھیڑ بکریوں کے یہ ننھے منے بچے بے حد پیارے لگتے تھے۔ لپک کر کچن سے نکلتے ہوئے کوریڈور میں سے ہوتی پچھلے دروازے سے باہر نکل آئی۔

پاس جا کر روئی کے گالوں جیسے بچے کو گود میں اٹھایا۔ اور پیار کرنے لگی۔

معاً ___ اُس کی نظر میوہ خان کے گھر سے نکلتے ہوئے اوپر آتیں انیسہ بیگم پر پڑی۔ میوہ خان بھی پیچھے پیچھے تھا۔

زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا تھا۔ کہ شندی کسی کو دیکھ کر گھبرا گئی تھی۔ پہلے تو جی میں آیا، بھاگ کر اندر گھر چلی جائے۔ مگر ___ پھر خیال آیا کہ وہ تو صرف چند قدم کے فاصلے پر تھیں۔ اُسے دیکھ بھی رہی تھیں۔ ساتھ میں میوہ خان بھی تھا۔ اچانک اندر چل پڑتی تو کیسا لگتا؟

تبھی اُس نے ارادہ بدل دیا۔ وہیں کھڑی رہ گئی۔

انیسہ بیگم ہانپتی کانپتی ___ اُس کو ہی تکتی چلی آ رہی تھیں۔

شندی نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ اُن کے چہرے پر ناگواری، بیزاری یا غصہ کہیں نہیں تھا۔ بلکہ ___ کچھ نرمی سی تھی، شفقت سی تھی۔

بالکل قریب آئیں۔ تو ایک تو اُن کی عمر، دوسرے اتنا نزدیک۔

اُس نے اُنہیں مؤدب طریقے سے سلام کیا۔

پھولی سانسوں کے درمیان وہ قدرے رکیں۔

''وعلیکم السلام۔ جیتی رہو...'' ایک نظر بغور اُسے دیکھتیں و ملائمت سے بولیں، اور پھر ___

آگے بڑھ گئیں۔

شندی کی آنکھیں بالکل اُن کے ابا جان کے جیسے تھیں۔ گرے بلو، بڑی بڑی اور بہت خوبصورت!

انیسہ بیگم اور میوہ خان آگے بڑھے ہی تھے۔ کہ نیچے سے شارٹ کٹ کرتا ابراہیم اوپر آتا دکھائی دیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ شندی کے پاس جا پہنچا۔

انیسہ بیگم رخ موڑ کر اُسے دیکھنے لگیں۔

''میوہ خان۔ یہ لڑکا باؤلا ہوا ہے۔ شام کے سائے پھیل رہے ہیں۔ اور یہ جوان جہان لڑکی کے پاس کھڑا ہے...''

میوہ خان کو ہنسی آ گئی۔ کبھی 'دن دھاڑے' پر اعتراض، کبھی 'شام کے سایوں' پر خفگی!

''آپ فکر مند نہ ہوں بیگم صاحبہ''۔ میوہ خان کو صرف اتنا علم تھا کہ شندی یاور خان کی کوئی رشتہ دار تھی اور بس۔ ''دونوں کی منگنی بھی تو ہوئی ہے...'' بات پکی ہونے کے بعد وہ بھی شام ڈھلے ندی کنارے شمیم کی راہ تکا کرتا تھا۔

''ارے چپ۔'' رخ واپس موڑتے ہوئے وہ آگے بڑھنے لگیں۔ ''منگنی ہی ہوئی ہے۔ کوئی نکاح تو نہیں ہوا نا۔''

جبکہ ___ شاداب کی منگنی کے بعد جواد جب بھی آتا تھا۔ شاداب سے بات کئے بنا واپس نہیں جاتا تھا۔ شندی کے بارے میں پتہ نہیں کیوں؟ ___ وہ بہت حساس ہو گئی تھیں!

نہلے پر دہلا۔ نور جہاں بانو بہ نفس نفیس دونوں ہاتھوں میں ایک ڈش تھامے، ڈھلان چڑھتیں، دائیں بائیں ڈولتیں، اُن کے سامنے آ نمودار ہوئیں۔

''ٹہلنے گئی تھیں؟'' نور جہاں بانو رکتے ہوئے بے ترتیب سانسوں کے درمیان بولیں۔



''نہیں۔ میوہ خان کے گھر گئی تھی۔ اور تم کہاں جا رہی ہو؟''

''شاندانہ کو بریانی دینے جا رہی ہوں''۔ وہ خوش خوش بولیں۔

''نوکر نہیں ہے کیا؟'' اُنہوں نے جیسے جل کر کہا۔

''ہے۔ لیکن'' وہ ہنس دیں۔ ''دل کرتا ہے خود دے آؤں جا کر''۔

''ہوں۔'' اُنہوں نے کہا اور ___

آگے بڑھ گئیں۔

''دل کرتا ہے خود دے آؤں''۔ اُنہوں نے نور جہاں بانو کے الفاظ دہرائے۔ ''خواہ مخواہ باچھیں کھلی جا رہی ہیں۔ حیرت ہے بیٹا اور ماں دونوں واری جا رہے ہیں...'' بڑبڑاتے ہوئے وہ آگے بڑھ رہی تھیں۔

''یہ ابراہیم واپس کب جا رہا ہے؟'' وہ ایک بار پھر گویا ہوئیں۔ انجانے میں وہ جیسے اُس سے نجات کی خواہاں تھیں۔

''جج صاحب کراچی گئے ہیں۔ واپس آئیں گے تو ابراہیم صاحب لندن جائیں گے... جج صاحب وہاں ایک شادی پر بھی جائیں گے۔ اُس کے بعد ہی واپس آئیں گے۔''

''ہوں''۔ 'ہوں' کو لمبا کھینچتے ہوئے ___ وہ اپنے گھر کے دروازے میں داخل ہو گئیں۔

''بیگم صاحبہ۔ ڈاکٹر صاحب کے لئے سوپ جلدی بنائیں۔ پہنچانا بھی ہے''۔ میوہ خان نے یاددہانی کرائی۔

لاکھ ہوسپٹل میں یاور خان کی خاطریں ہو رہی تھیں۔ مگر سوپ انیسہ بیگم نے ہی بنا کر بھجوانا تھا۔

تھوڑا دم لینے کے بعد وہ کچن میں آ گئیں۔ یاور خان کے لئے سوپ بنانے!

شام گہری ہونے لگی۔ تو ابراہیم سے معذرت کرتے ہوئے شندی اندر

آ گئی۔

''ماما۔ بات کر لی ڈاکٹر صاحب سے؟'' وہ کچن کے دروازے میں سے جھانکی۔

''ہاں بیٹا۔ کہتے تھے بہتر محسوس کر رہے ہیں اب...''

''ہوں۔ وہ... آپ کو ڈر تھا کہ ٹھیک سے بولیں گے نہیں...''

''نہیں نہیں بیٹا۔ وہی پہلے کی سی نرمی تھی انداز میں۔ کہتے تھے بہت مشکور ہیں میرے پوچھنے کے''۔

شندی کے بارے میں تو ظاہر ہے کیوں پوچھا ہو گا؟ افسردہ سی سانس لیتی وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔

معاً ــــ اُس کا لینڈ لائین بج اٹھا۔ آگے بڑھتے ہوئے اُس نے ریسیور اٹھا لیا۔

''کون بول رہا ہے؟'' وہ ماؤتھ پیس میں بولی۔

''سرفراز ــــ سرفراز جہانگیر۔''

شندی کا رنگ فق ہو گیا۔ فوراً ریسیور واپس رکھ دیا۔

ایک بار پھر رِنگ آئی۔ مگر اُس نے نہیں اٹھایا۔

دھک دھک کرتا اُس کا دل جیسے پنجر توڑ کر باہر آنے لگا تھا۔ پھر ــــ اُسے کوئی ہوش نہیں رہا۔ کھڑے قد سے قالین پر گر گئی۔

دھڑام کی سی آواز سن کر ماما بھاگی آئیں۔

شندی کو قالین پر بے سدھ پڑے دیکھ کر ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

''شندی بیٹا... شندی بیٹا...''

''یا اللہ۔ کس کو بلاؤں؟ کیا کروں؟''

کہ پہلے تو یاور خان ہوتا تھا۔ جی جان سے آ جاتا تھا۔ اب تو وہ خود ہوسپٹل میں تھا۔ اور پھر ... شندی کی منگنی کے بعد اب پتہ نہیں آتا بھی یا نہیں؟



وہ بھاگیں نور محمد کی طرف۔ اُسے نور جہاں بانو کی طرف دوڑایا۔ خود شندی کے پاس آ گئیں۔

تبھی ــــ شندی نے خود ہی آنکھیں کھول دیں۔

''کیا ہوا تھا بیٹا؟'' آنکھوں میں آنسو لئے وہ اُس پر جھک آئیں۔

شندی آہستہ سے اٹھتے ہوئے صوفے پر آ بیٹھی۔

''ماما... سرفراز نے فون کیا تھا''۔

''ک... کون سرفراز؟'' ماما کے کاٹو تو لہو نہیں تھا بدن میں۔

''انکل جہانگیر کا بیٹا''۔

''مگر... اُسے یہاں کا نمبر کیسے پتہ چلا؟''

''یہی تو میں حیران ہوں۔ اِس کا مطلب ہے اُس کو یہ بھی معلوم ہے کہ میں یہاں رہ رہی ہوں''۔

''ہاں لگتا ہے سب پتہ ہے۔ اللہ خیر کرے...''

دفعتاً نور جہاں بانو ماما کو پکارتیں اندر داخل ہوئیں۔

''شندی بی بی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ سخت کمزوری ہو رہی تھی۔ میں نے نور محمد کو آپ کی طرف بھیجدیا۔ کہ شندی بی بی کو تھوڑی تسلی ہو جائے گی''۔

وہ اصل واقعہ گول کر گئیں۔

''آپ انرجائیل بنا کر لائیں شندی کے لئے۔ میں بیٹھتی ہوں اِس کے پاس''۔

وہ شندی کو وہاں سے اٹھا کر بستر پر لے آئیں۔ زبردستی لٹایا۔ خود بھی پاس بیٹھ گئیں۔

''بیٹا تم بہت کم کھانا کھاتی ہو۔ اچھی طرح کھایا پیا کرو۔ اپنی صحت کا خیال رکھا کرو۔ میں چند دن تمہیں دیسی مرغی کا سوپ پلاؤں گی۔ کمزوری جاتی رہے گی...'' وہ شفقت سے اُس کا ماتھا سہلاتیں کہہ رہی تھیں۔

پھر — اُسے انرجائیل پلایا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہیں۔
شندی کی طرف سے کچھ تسلی ہوئی۔ تو گھر چلدیں۔
شندی سے رات کھانا بھی نہیں کھایا گیا۔ طرح طرح کے وسوسے دل میں سر اٹھا رہے تھے۔ ماما اپنا بستر اُس کے کمرے میں لا کر پڑ رہی تھیں۔ شندی سوچ رہی تھی۔ کہ کل ابراہیم سے بات کرے گی۔ جبکہ — ماما کا کہنا تھا کہ اگر سرفراز کا فون دوبارہ آیا تو وہ یاور خان کے آگے رکھیں گی سارا معاملہ!





یاور خان۔ صحت یاب ہو چکا تھا۔ روٹین پھر سے بحال ہو گیا تھا۔
آج پھر چھٹی کے بعد گھر کی طرف چلا جا رہا تھا۔
شام گھِر آئی تھی۔ ٹھنڈ اُتر آئی تھی اور — یہ بڑا چاند جھانکنے لگا تھا۔
وہ آج بھی اداس تھا۔ آج بھی بے کل تھا۔ آج بھی سوچوں میں گم تھا۔
بھتیری کوشش کر رہا تھا۔ کہ شندی کی یاد دل سے نکال پھینکے۔ اُس نے اُس کے ساتھ بیوفائی کی تھی، اُس کی محبت کی توہین کی تھی مگر —
جانے کیا تھا؟ جتنی کوشش کرتا اُسے بھول جانے کی، اُس سے کہیں

زیادہ در آتی وہ یادوں میں!

اُس کی باتوں کی مدھرتا اُس کے کانوں میں رس گھولتی، اُس کی ہنسی کی کوملتا اُسے مسحور کرتی، اُس کی چھیڑ چھاڑ کی چنچلتا اُسے مدہوش کرتی!

وہ تو دیوانہ تھا اُس کی ہر ادا کا۔ کیسے بھول پائے گا اُسے؟

گہری سانس لیتے ہوئے اُس نے بستی کے اوپر کا موڑ کاٹا۔

اپنے گھر کے ساتھ ساتھ جج صاحب اور شندی کے گھر بھی نظر آنے لگے۔

اِس وقت پھر ابراہیم شندی کے ساتھ کھڑا باتوں میں مصروف تھا۔

اچانک شندی نے جانے کیا کیا؟ ابراہیم کا فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا۔

اُس کے کانوں میں جیسے کسی نے پگھلتا سیسہ انڈیل دیا۔

تو ــــ آج اپنی چنچلتا سے شندی ابراہیم کو محظوظ کر رہی تھی!

کتنی آسانی سے اپنے جلوے ابراہیم کے نام کر دیئے تھے!

اُسے شدت سے اپنی توہین کا احساس ہوا۔ اپنی بے لوث محبت کی توہین کا!

اور ــــ یہیں اُس نے فیصلہ کر لیا۔ اب وہ اُسے یاد نہیں کرے گا۔ نوچ کر پھینک دیگا اُس کی یادوں کو۔ اتنا کمزور نہیں تھا وہ۔ اگر آج تک اُسے چاہتا آیا تھا، تو اِس یقین کے ساتھ کہ وہ بھی اب تک اُسے چاہتی تھی۔ مگر ــــ

جس جوش سے ابراہیم کا قہقہہ گونجا تھا۔ کیا صاف نہیں بتا رہا تھا کہ اُس کی یہ خوشی شندی کی کسی خوش کن حرکت کا ہی نتیجہ تھی؟

وہ اُسے خوش کر رہی تھی اور وہ ــــ

خوش ہو رہا تھا!

کبھی نہیں ــــ اب وہ اُس کو اور یاد نہیں کرے گا۔ اُس کا فیصلہ اٹل تھا!

گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے وہ اپنے گیٹ کے اندر چلا گیا۔



امّی کے ساتھ ٹیریس پر بیٹھ کر کوفی پیتے ہوئے وہ گپ شپ کرنے لگا۔ تو دھیان بٹ گیا۔ طبیعت مل گئی۔

رات ڈنر پر امی نے اُس کا پسندیدہ مٹن پلاؤ پکایا تھا۔ کھیر بھی۔

کھانا کھانے کے بعد وہ امی کو اُن کے کمرے تک لایا۔ بالکنی کے پردے برابر کیئے، اُن کی دوائیاں اور جگ میں پانی چیک کیا۔ اور ــــ 'شب بخیر' کہتا اپنے بیڈروم میں چلا آیا۔

حسبِ معمول وہ چند پل کے لئے بالکنی میں آ گیا۔

چاروں اور مکمل سکوت تھا۔ گہرا سناٹا، اور ــــ پورا چاند!

ہر سو پھیلی دودھیا چاندنی میں اُس نے دیکھا۔ بائیں جانب درخت سے ٹیک لگائے کھڑی شندی شاید چاند اور چاندنی سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

وہ اندر آ گیا۔ ڈریسنگ روم گیا، کپڑے تبدیل کر کے نائیٹ سوٹ پہنا، صوفے پر آ کر بیٹھا اور ــــ دنوں بعد رات گئے تک ٹی وی دیکھتا رہا۔

سونے کے لئے بستر پر لیٹا، آنکھیں موندیں مگر ــــ نیند نہیں آ رہی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اُس نے Sleeping pill لے لی۔ کہ وہ خالی ذہن نہیں رہنا چاہتا تھا!

شندی بھی اندر چلی گئی۔ آج رات کا کھانا لیٹ تھا۔ ماما بقول اُن کے ایک خاص ڈش تیار کر رہی تھیں جس میں خاصا وقت لگتا تھا۔ بہر حال ــــ

کھانا میز پر لگ چکا۔ تو دونوں مل کر کھانا کھانے لگیں۔

''بیٹا۔ ابراہیم صاحب سے بات کی تم نے سرفراز کے فون کے بارے میں''۔ ماما نے باتوں کے دوران پوچھا۔

''ہاں ماما... ابھی شام کو ہی کی ہے لیکن ...'' وہ بے اختیار ہنس دی۔

''کر لی بات؟''

''کرتو لی لیکن ... وہ بچارا تو مجھ سے بھی زیادہ گھبرا گیا ...'' وہ ہنوز ہنس رہی تھی۔

''کیا مطلب؟''

''میں نے جب بتایا کہ سرفراز میرے اُنہی چچا کا بیٹا ہے۔ جنہوں نے مجھے مارا پیٹا تھا، جو میری شادی اُس کے ساتھ زبردستی کروانے والے تھے اور جن پر میں نے پاپا کے قتل کی دعویداری کی ہوئی ہے... تو رنگ اِس طرح اُڑ گیا گویا...''

''ہیں؟ یہ کیا بات ہوئی؟'' وہ جیسے کچھ سمجھیں نہیں۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں ماما''۔

''کچھ کہا نہیں کہ وہ کچھ بندوبست کریں گے وغیرہ۔'' اُن کے لہجے میں حیرت سی تھی۔

''نو''۔ شندی نے نفی میں سر ہلایا۔

''کچھ تو کہا ہوگا''۔ ماما نے کھانے سے ہاتھ روک لیا تھا۔

''ہاں۔ کہا تھا۔ کہ وہ ڈاکٹر صاحب سے بات کریں گے ...''

ماما چپ سی ہو گئیں۔ آہستہ آہستہ کھانا کھانے لگیں۔ سوچ میں پڑ گئی تھیں جیسے۔

نور جہاں بانو نے کہہ سن کر ابراہیم کو شندی سے منگنی کے لئے راضی تو کر لیا تھا لیکن ـــ

اُس کے دل سے وہ خوف نہ نکال پائی تھیں۔ جو ابراہیم کو شندی کی خاندانی پیچیدگیوں اور دشمنیوں کی وجہ سے لاحق تھا۔ بقول اُس کے اُس سے رشتہ جوڑ لینے پر ابراہیم کو خطرات کا اندیشہ تھا۔ جو وہ مول لینے کو تیار نہیں تھا۔

''تم بھی تو اُس کے اتنا آگے پیچھے ہو رہے تھے ...'' نور جہاں بانو نے شندی کے ساتھ منگنی کے لئے آمادہ کرتے وقت اُسے کہا تھا۔



وہ زور سے ہنس پڑا تھا۔

''امی اتنی خوبصورت لڑکی ہے۔ کس لڑکے کا دل نہیں چاہے گا۔ اُس کے قریب جانے کو''۔ اُس نے لاپروائی سے کہا تھا۔

''اچھا بس چھوڑو۔ تمہارے ابا کی بھی یہی مرضی ہے۔ والدین کی مرضی سے شادی کرو گے تو سکھی رہو گے۔ ہم نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔''

اور ـــ جب نور جہاں بانو نے اُس کے آگے شندی کی املاک کا نقشہ تفصیل سے کھینچا۔ تو ـــ ابراہیم کے بھی منہ میں پانی آ گیا۔ گو ـــ شندی سے جُڑے خطرات کا دھڑکا اب بھی اپنی جگہ تھا!

شام کو شندی نے اُسے سرفراز کے فون کا بتایا۔ تو اُس کا رنگ واقعی فق ہو گیا تھا۔

فون کا مطلب تھا۔ شندی کے دشمنوں کو اُس کی جائے پناہ کا پتہ چل چکا تھا۔ اور اب شندی کے ساتھ ساتھ اُن سب کی بھی یقیناً خیر نہیں تھی!

اُس نے شندی سے بھی کہا۔ اور خود بھی یہی مناسب سمجھا۔ کہ یاور خان سے بات کی جائے۔ خالہ زاد تھا اُس کا۔ وہ جانے اور اُس کا کام۔ یہ بکھیڑے اُس کے بس کے نہیں تھے!

''امی آپ سے کہا تھا نا۔ اِس مصیبت میں ہاتھ مت ڈالیں''۔ شندی سے واپس آتے ہی وہ کچن میں مصروف نور جہاں بانو پر زور اُتارنے لگا۔

''کس مصیبت میں؟''

''یہی شاندانہ کی مصیبت میں''۔

''کیوں کیا ہوا؟''

''ہونا کیا تھا۔ اُس کے چچا کے بیٹے کو اِس جگہ کا پتہ چل چکا ہے۔ فون کیا تھا اُسے۔''

ایک پل کو تو وہ بھی گھبرا گئیں۔ اپنے لئے نہیں۔ شندی کے لئے۔

’’لیکن بیٹا ایسی حالت میں تمہیں اُس کو تسلی دینی چاہئے۔ ہم سب کو اُس کی مدد کرنی چاہئے...‘‘

’’ہونہہ۔ مدد۔ میں سیدھا سیدھا ڈاکٹر سے بات کروں گا۔ وہ کرے گا مدد۔ پہلے بھی کر چکا ہے‘‘۔ ساری مصیبت یاور خان ہی کی تو لائی ہوئی تھی۔

اور ـــ نور جہاں بانو پچھتائیں۔ ابراہیم شندی کے قابل نہیں تھا۔ اُنہوں نے غلط سوچا تھا۔ منگنی ونگنی تو ایک طرف۔ ایک مظلوم کی مدد کرنا تو فرض بنتا ہی تھا!

اپنے فیصلے پر پشیمان سی وہ کچن سے نکل آئیں۔ اپنے کمرے میں گئیں۔ اور صبح کراچی جانے کی تیاری کرنے لگیں۔ جج صاحِب نے بلوایا تھا۔ اُن کے قریبی دوست کے بیٹے کی شادی تھی۔ جج صاحِب نے بلوایا تھا۔ اُن کے قریبی دوست کے بیٹے کی شادی تھی۔ دونوں کا اٹینڈ کرنا ضروری تھا۔



انیسہ بیگم ابھی یہیں تھیں، یاور خان کے پاس۔ یاور خان ہی اُنہیں جانے نہیں دے رہا تھا۔ اُسے اِن دنوں خاص طور سے اُن کی ضرورت تھی۔ اُن کی شفقتیں شندی کی یاد کو دور رکھنے میں معاون ثابت ہو رہی تھیں۔

دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ ضروری کاموں سے فارغ ہو کر انیسہ بیگم حسبِ معمول کچن کے باہر گھاس پر کرسی ڈلوا کر بیٹھ گئیں۔

’’حمید۔ مٹر لاؤ چھیل دوں‘‘۔ وہ جنت نظیر نظاروں پر نظریں ڈالتے ہوئے کچن میں مصروف حمید سے بولیں۔

فارغ ہوتی تھیں۔ سوسبزی وغیرہ چھیلنے کاٹنے میں حمید کی مدد کر دیا کرتی تھیں۔

''جی ابھی لایا۔'' حمید کی آواز آئی۔

اور جلدی ہی وہ مٹر اور ساتھ میں چھلکوں کے لئے برتن لے آیا۔

وہ مٹر بھی چھیلتی جاتیں۔ اور گاہے گاہے آس پاس بھی نظر ڈالتی جاتیں۔

قریب ہی چند گز پر شندی کی اینکسی کا پچھلا دروازہ تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ رخ موڑ کر اُس طرف دیکھ لیتیں۔

پتہ نہیں کیوں؟ جب سے اُسے نزدیک سے دیکھا تھا۔ اُس کی اپنے ابا جان کے جیسی آنکھیں دیکھی تھیں۔ دل کو جیسے کوئی مسوس رہا تھا۔ سوتیلی ماں، سوتیلی بہن ___ آہستہ آہستہ پیچھے جا رہی تھیں۔ سامنے بس شندی ہی تھی!

عاجز سی، باادب سی، اور پھر ___

'میں دکھی ہوتا ہوں تو آپ بھی دکھی ہوتی ہیں نا؟' اُن کے کانوں سے ہوسپٹل میں ایڈمٹ یاور خان کی آواز ٹکرائی۔

'تم دکھی ہو گے تو میری جان چلی جائے گی۔' وہ بار بار اُس کا ہاتھ چوم رہی تھیں۔

'امی۔ مجھے اگر کوئی چیز پسند آ جاتی تھی۔ تو آپ ہزاروں میل دور سے میرے لئے منگوا دیتی تھیں... جب میں چھوٹا تھا۔ تو ایک برگر کی فرمائش پر آپ رات گئے میلوں گاڑی بھگا کر میری خواہش پوری کرتی تھیں مگر...'

اُس کی باتوں میں دکھ تھا، اداسی تھی ___ شکوے تھے، شکایتیں تھیں!

وہ جیسے کچھ کچھ سمجھ گئی تھیں۔

'مگر کیا؟ میری جان'۔ وہ شفقت سے بولی تھیں۔

'مگر... اب... ایسا نہیں کرتیں...'



تب بھی انیسہ بیگم کا دل کٹ کر رہ گیا تھا۔

اِس وقت بھی بے کل سی ہو گئیں۔

وہ دیکھ رہی تھیں۔ یاور خان بہت اداس رہنے لگا تھا۔ نہ وہ پہلے کی سی گپ شپ رہی تھی، نہ ہنسی مذاق۔ کھانا پینا تک برائے نام رہ گیا تھا۔ افسردگی کی ایک مستقل چھاپ رہنے لگی تھی پُرکشش چہرے پر!

وہ خود کو مجرم سا محسوس کرنے لگیں۔

اپنے بیٹے کی خاطر، اپنی جان کی خاطر، کیا وہ پچھلی باتیں بھول نہیں سکتی تھیں؟ اُنہوں نے خود سے سوال کیا۔

یاور کی خاطر ___ اپنے بہت صابر اور بہت فرمانبردار بیٹے کی خاطر!

وہ خود سے جنگ لڑ رہی تھیں۔ کئی دنوں سے!

'بھول جاؤ پچھلی باتیں۔ بے آسرا ہے، اپنا لو اِسے۔ اپنا خون ہے...'

اُن کے کانوں میں نور جہاں بانو کی بات گونجی۔

'امی۔ یاور بھائی کا بھی سوچیں۔ اُنہیں... بہت پسند ہے شندی۔ اگر آپ بھی...' نایاب کی جھجکتی جھجکتی آواز اُن کے کانوں سے ٹکرائی۔

'امی پلیز! یاور بھائی کا... دل ٹوٹ جائے گا...' بھائی کی محبت میں ڈوبی شاداب کی آواز آئی۔

دفعتاً ___ اُن کے خیالوں کا تانا بانا ٹوٹ گیا۔ کوئی رو رہا تھا!

ایسی تڑپ تھی رونے میں ___ کہ انیسہ بیگم کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا تھا۔ بے چین سی وہ رخ موڑتے ہوئے آواز کی سمت دیکھنے لگیں۔

شندی کی اینکسی کے اندر سے آواز آ رہی تھی۔ وہ بے اختیار اُٹھیں۔

اور ___ قدم اینکسی کی طرف بڑھنے لگے۔

دروازے پر دستک کی۔ ماما نے دروازہ کھولا۔

''یہ کون رو رہا ہے؟'' اُنہوں نے بلاتمہید پوچھا۔

"شندی بی بی رو رہی ہیں"۔

اور۔۔۔ مزید کچھ کہے سنے بغیر وہ اندر داخل ہو گئیں۔

ماما حیرت زدہ سی اُن کے ساتھ ساتھ شندی کے کمرے تک گئیں۔

"کیا ہوا میرا بچہ؟" سیکنڈز میں وہ صوفے پر بیٹھی گھٹنوں میں سر دیئے پھوٹ پھوٹ کر روتی شندی کا سر سینے سے لگائے تھیں۔

جانے کیا ہوا؟ شندی کی چیخیں نکل گئیں۔ انیسہ بیگم کے گرد دونوں بازو لپیٹتے ہوئے وہ بیقراری سے رو دی۔

انیسہ بیگم اُسے چپ کراتی رہیں۔ اُس کے بال سہلاتی رہیں، اُسے پیار کرتی رہیں۔

"پانی لانا ذرا اِس کے لئے۔" اُنہوں نے ماما سے کہا۔

"بس میرا بچہ۔ بس۔ اور نہیں رونا"۔ اپنے آنسو شال کے پلو سے پونچھتے ہوئے وہ شفقت سے بولیں۔

ماما پانی لے کر آ گئیں۔ انیسہ بیگم نے اپنی شال سے شندی کے آنسو خشک کئے۔ گلاس اُس کے منہ سے لگایا۔

"پی لو بیٹا"۔

اور۔۔۔ وہ چپ چاپ پینے لگی۔

"یہ کیوں رو رہی تھی اتنا؟" گلاس میز پر رکھتے ہوئے وہ ماما سے مخاطب ہوئیں۔

"آج شندی بی بی کے والد کی سالگرہ ہے۔ بہت خوشی خوشی منایا کرتی تھیں شندی بی بی اُن کی سالگرہ... اُن کے انتقال کے بعد پہلی بار اُن کی سالگرہ آئی ہے... اُن کی تصویر نکالی۔ اور رونے لگیں..."

"اوہ"۔ انیسہ بیگم دکھ سے بولیں۔ ایک بار پھر اُس کا سر سینے سے لگایا۔ ٹھنڈی سانس لی۔ "اللہ کی آزمائش ہے بیٹا، صبر کرو۔ دکھ آیا ہے تو سکھ بھی آئے



گا۔ ہر رات کی صبح ہوتی ہے۔ اللہ کی ذات بہت بڑی ہے۔ وہ جو کرتا ہے۔ ہم نہیں سمجھ پاتے۔ اُن کی زندگی اتنی ہی تھی۔ سب نے جانا ہے باری باری۔ بس تم دعا کیا کرو اُن کے لئے..."

اُن کے سینے سے لگی شندی کو عجیب سا سکون مل رہا تھا۔ بھری دنیا میں کوئی اپنا ملا تھا۔ ساتھ ہی۔۔۔

اُسے حیرت بھی ہو رہی تھی۔ وہ کیسے اچانک پسیج گئی تھیں؟

انیسہ بیگم کچھ دیر اور وہیں بیٹھی رہیں۔ شندی سنبھلی۔ تو اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"اب چلوں گی بیٹا۔ دل گھبرائے تو میرے پاس آ جایا کرو۔ میں یہیں ہوں ابھی"۔

شندی بھی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"آنٹی پلیز! چائے، کوفی پی کر جائیں"۔

"نہیں بیٹا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے چائے پی ہے۔ یہ تو بس تمہارے رونے کی آواز سنی تو رہا نہیں گیا..." وہ کوریڈور میں نکل آئیں۔

شندی بھی ساتھ ساتھ تھی۔ آگے بڑھتے ہوئے اُن کے لئے دروازہ کھول کر تھام لیا۔

وہ باہر نکلیں۔ تو وہ بھی ساتھ باہر تک آ گئی۔

"بہت شکریہ آنٹی۔" شندی نے کہا۔

"خدا حافظ بیٹا"۔

"خدا حافظ"۔

شندی وہیں کھڑی اُنہیں جاتے دیکھتی رہی۔ خواب سا لگ رہا تھا سب اُسے!

وہ اپنے کچن کے اندر چلی گئیں۔ تو شندی واپس مڑی۔ دیکھا ماما بھی

دروازے میں کھڑی تھیں۔ وہ بھی بہت خوش نظر آ رہی تھیں۔
برسوں پر محیط انیسہ بیگم کی خاموشی ٹوٹی تھی۔ انہونی ہی تو ہوئی تھی!

رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ ہر سُو تاریکیاں گھِر آئی تھیں۔ بستی میں گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔

بس روشنی ہو رہی تھی تو ـــ جج صاحب کے گھر میں۔ یا پھر یاور خان کے یہاں!

یاور خان آن کال تھا اِن دنوں۔ پندرہ بیس منٹ قبل ہوسپٹل کے لئے نکل گیا تھا۔ انیسہ بیگم بستر پر جلدی جانے کی عادی تھیں۔ دس بجے ہی پڑ رہی تھیں بستر پر۔ میوہ خان اور حمید البتہ یاور خان کے انتظار میں باہر گیٹ کے قریب سوکھی ٹہنیوں کی آگ تاپتے گپ شپ کرتے جاگ رہے تھے۔

انیسہ بیگم کو غنودگی آنے لگی تھی۔ منہ ہی منہ میں اب بھی اپنے بچوں کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہی تھیں کہ ـــ

اچانک کچھ غیر معمولی سی آہٹوں پر کان کھڑے ہوئے۔ غنودگی ہوا ہو گئی۔ ہڑبڑا کر اٹھتے ہوئے بستر میں بیٹھ گئیں۔ کان لگایا۔ شندی کی اینکسی کی طرف کچھ ہو رہا تھا۔

گھبرائی گھبرائی وہ سیڑھیاں اترنے لگیں۔ کچن میں آئیں اور دروازہ کھولتے ہوئے باہر نکل آئیں۔

اندھیرا ضرور تھا۔ مگر نظر سب آ رہا تھا۔

اُن کے دیکھتے دیکھتے دو آدمی شندی کے ٹیرس کے دروازے سے باہر نکلے۔ اگلے آدمی کے کندھے پر کچھ گٹھڑی سی تھی اور پچھلا خالی ہاتھ تھا۔

اُنہیں کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ سب کیا تھا؟ کہ سوچنے کا وقت ہی نہیں تھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھنے لگیں۔



تبھی اُنہوں نے شندی کی گھٹی گھٹی آوازیں سنیں۔ اور ـــ وہ معاملے کی تہہ تک پہنچ گئیں۔ یہ لوگ شندی کو اُٹھا کر لیجا رہے تھے۔

یاور خان تو تھا نہیں۔ وہ بھاگیں ابراہیم کو فون کرنے۔

فون ابراہیم نے ہی اٹھالیا۔

''جی آنٹی۔ خیرت تو ہے؟'' ایسے بے وقت انہوں نے پہلے کبھی فون جو نہیں کیا تھا۔

''بیٹا جلدی کرو۔ شندی کو دو آدمی اُٹھا کر لے جا رہے ہیں''۔

''اوہ''۔

اور ـــ دونوں نے فون بند کر دیا۔

لمحہ بھی ضائع کیے بغیر وہ واپس وہیں آ گئیں۔

اب دونوں آدمی تیزی سے اینکسی کے پچھلے دروازے کے پاس سے گزرنے لگے تھے۔

شندی شاید بندھا منہ کھولنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

''ابراہیم، ابراہیم، ابراہیم...'' اُس کی آواز وادی میں گونج رہی تھی مگر ـــ

ابراہیم ندارد تھا!

''میوہ خان، میوہ خان''۔ انیسہ بیگم دوڑتی ہوئی گیٹ کی طرف آئیں۔

''حوصلہ کریں بیگم صاحبہ۔ ہم نے شندی بی بی کی آوازیں سنی ہیں۔ لیکن میوہ ماموں نے گاڑی سٹارٹ ہونے کی بھی آواز سنی ہے۔ وہ شارٹ کٹ کر کے گاڑی کا راستہ روکنے گیا ہے...'' وہ خود بھی بھاگا میوہ خان کی طرف۔

''یا اللہ رحم کر۔ یا اللہ رحم...''

تبھی ـــ فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں۔

انیسہ بیگم دہل کر رہ گئیں۔ بدحواس سی جج صاحب کے گیٹ کی طرف بڑھیں۔ مگر ــــ

وہاں تو جیسے کوئی تھا ہی نہیں۔ نہ چوکیدار، نہ نوکر چاکر اور ــــ نا ہی منگیتر نامدار ابراہیم!

جلتی بتیاں تک بند کر دی تھیں سب!

واہ ــــ کیا سسرال تھی؟ اور کیا منگیتر تھا؟

وہ واپس پلٹ آئیں۔ بلا سوچے سمجھے اُسی طرف بڑھنے لگیں۔ جس طرف میوہ خان اور حمید گئے تھے۔

موڑ کے قریب پہنچیں۔ تو اُنہیں سب نظر آنے لگا۔

جیپ فرار ہو رہی تھی۔ پتلی سی پرائیویٹ روڈ پر دسترس سے باہر نکل رہی تھی۔ اور بیچ سڑک پر بستی کے مرد اکٹھے ہو گئے تھے۔

وہ لوگ یقیناً شندی کو لے گئے تھے۔ انیسہ بیگم وہیں بیٹھ کر واویلا کرنے لگیں۔

پھر اُنہوں نے دیکھا۔ مرد چھٹ گئے تھے۔ حمید اُن کے پاس آیا۔

''بیگم صاحبہ۔ شندی بی بی سڑک پر پڑی ہیں۔ آپ اور ماما جا کر اُنہیں لے آئیں۔ خیریت سے ہیں بالکل۔ میوہ ماموں اُن کے پاس ہے ...'' وہ خود شندی کو ہاتھ لگانا نہیں چاہتے تھے۔ کہ وہ اُن کے لئے بہت قابلِ احترام تھی۔

انیسہ بیگم مارے خوشی کے رونے لگیں۔

''ارے جاؤ۔ ماما کو بلا کر لاؤ''۔

حمید اوپر بھاگا۔ اور تھوڑی ہی دیر میں گرتی پڑتی ماما کو لے آیا۔

''سٹور میں بند کر کے کنڈی لگا دی تھی کم بختوں نے''۔ حمید بولا۔

''خدا غارت کرے۔ آؤ الفت۔ نیچے چلتے ہیں ...'' اُنہوں نے ماما سے کہا۔



''نہیں بیگم صاحبہ۔ آپ لوگ یہیں رہیں۔ سخت چڑھائی ہے۔ نور محمد پاس والے گاؤں سے سوزوکی بس لانے ہی والا ہے۔''

''اچھا اچھا''۔

منٹوں میں ہی سوزوکی آ گئی۔ اور وہ سب شندی کو اُس کی اینکسی میں لے آئے۔

شندی کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ پکڑ دھکڑ، فائرنگ اور ــــ اغوا کا خوف!

انیسہ بیگم اور ماما اپنی سی کوششیں کر رہی تھیں۔ انیسہ بیگم نے یاور خان کو بھی فون کر کے بلوا لیا تھا۔ مگر جگہ قدرے پرے اور راستہ پُر پیچ تھا۔ پہنچتے پہنچتے وقت تو لگنا ہی تھا۔

میوہ خان نے پستول سے فائر کیے تھے۔ جو اندھیرے میں نشانے پر تو نہیں بیٹھ سکے تھے۔ مگر اتنا تھا کہ اُن لوگوں نے گھبرا کر شندی کو سڑک پر پھینکا۔ اور ہوائی فائرنگ کرتے بھاگنے کی کرنے لگے۔ کہ سڑک چکردار تھی۔ سپیڈ کر نہیں سکتے تھے۔ اور تھے گولیوں کی زد میں!

صبح کے دو بجنے کو تھے جب یاور خان گھر پہنچا۔

حمید نے گیٹ کھولا۔ اُس نے گاڑی پورچ میں کھڑی کی۔ اور عجلت سے اندر جانے لگا کہ ــــ

امی نے فون پر کہا تھا ــــ

'گھر آ جاؤ۔ میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے'۔

یقیناً کچھ سیریس تھا۔ ورنہ وہ حتیٰ الامکان اُسے اپنی پریشانیاں نہیں بتایا کرتی تھیں۔

''صاحب۔ بڑی بیگم صاحبہ ... اوپر اینکسی میں شندی بی بی کے پاس ہیں''۔ حمید نے اُسے پورچ میں ہی آ لیا۔

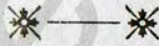
"کیا؟" اُسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔
پھر — حمید نے سارا واقعہ اُس کے گوش گزار کر دیا۔
"اوہ مائے گوڈ!" اُس نے اتنا ہی کہا۔
"شندی بی بی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ زخم بھی آئے ہیں..."
اور — وہ وہیں سے واپس مڑ گیا۔
"میرا فرسٹ ایڈ بوکس لے آنا"۔ اُس نے کہا۔ اور —
تیزی سے اینکسی کی طرف بڑھنے لگا۔
شندی نے اُس کی توہین کی تھی، اُس سے بیوفائی کی تھی۔ یہ سب اُسے
ہیچ لگنے لگا۔

اُس کے حالات نے بہت سنگین صورت اختیار کر لی تھی اور — اُسے
اُس کی مدد کی ضرورت تھی۔ بس یہی حقیقت تھی!
اِس سے زیادہ وہ اِس وقت کچھ نہیں سوچنا چاہتا تھا!
دستک دیتا وہ شندی کے بیڈ روم میں آ گیا۔
شندی تکیوں سے پشت ٹکائے بستر میں لیٹی تھی۔ چہرے سے نقاہت کے
آثار ہویدا تھے۔ انیسہ بیگم اب بھی اُس کے پہلو میں بیٹھی تھیں۔ سخت پریشان لگ
رہی تھیں۔

شیر اور بکری ایک ہی گھاٹ پر پانی پی رہے تھے — اُسے اچھا لگا!
"شکر ہے بیٹا تم آ گئے ہو۔ میری تو جان پر بنی ہے..."
"جی — مجھے حمید نے بتا دیا ہے سب۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ سب
ٹھیک ہو جائے گا۔" موقع واقعی پریشانی کا تھا فکر مندی کا تھا لیکن —
امی کی بے تحاشہ پریشانی — وہ بھی شندی کے لئے!
سورج کہیں مغرب سے تو نہیں نکلا تھا آج؟
سنجیدہ سچویشن کے باوجود ایک غیر محسوس سی مسکراہٹ اُس کے لبوں کو



چھو گئی۔
پھر — اُس نے شندی کو T.T انجکشن لگایا۔ مرہم پٹی کی، دوائیاں
دیں۔
کچھ بھی کہے بغیر، کچھ بھی سنے بنا!
ماما کو ڈھیر ساری تسلی دی۔ میوہ خان و نور محمد کو ہدایات دیتے ہوئے اُن
کے پاس چھوڑا اور — امی کو قدرے ریسٹ کرنے ساتھ لیتا آیا۔



یاور خان کے F.I.R درج کرانے پر پولیس آ چکی تھی۔ چھان بین کر چکی تھی۔ اور ــــ جج صاحب کے نئے بھرتی کردہ بائیس تیئس سالہ کک محمد نعیم کو گرفتار کر کے لیجا چکی تھی!

بہت ہی انوکھی بات سامنے آئی تھی ــــ

محمد نعیم ایک مقامی گریجویٹ لڑکا تھا۔ جس کو ڈاکٹر نادیہ کی تجویز پر سرفراز نے جج صاحب کے یہاں کوئی دس دن قبل خانساماں رکھوایا تھا۔ جو روزانہ ڈاکٹر نادیہ کو اور ــــ وہ آگے سے سرفراز کو یہاں کے حالات سے باخبر رکھتی تھی۔



جج صاحب پہلے سے کراچی میں تھے۔ نور جہاں بانو دو چار روز قبل کراچی سدھاری تھیں۔ ابراہیم کل صبح، رات باہر گزارنے کا کہکر دوسرے شہر کام سے نکل گیا تھا۔ اور ــــ یاور خان آن کال تھا اِن دنوں!

جوں ہی یاور خان ہوسپٹل کے لئے نکلا۔ محمد نعیم نے نادیہ کو اور ــــ نادیہ نے چند روز سے یہیں کہیں مقیم سرفراز کو انفارم کر دیا۔

محمد نعیم چوکیدار کو یہ کہکر کہ اُس کے سر میں شدید درد ہے اور وہ بستی کے نچلے حصے میں رہنے والے اپنے دوست کے یہاں سے گولی لینے جا رہا ہے، چلدیا نیچے۔

دریں اثناء ــــ ابراہیم واپس آ گیا۔ اُس کا کام دن کو ہی ہو گیا تھا۔ سو خواہ مخواہ رات باہر گزارنے کی بجائے اُس نے گھر واپس لوٹنا بہتر سمجھا۔

چوکیدار نے اُسے بتایا کہ محمد نعیم کی طبیعت ٹھیک نہیں، نیچے گیا ہے۔ تو ابراہیم نے خود ہی فریج سے کھانا نکال کر گرم کیا، کھایا، اور اوپر اپنے بیڈ روم میں چلا گیا۔

تبھی ــــ اُسے انیسہ بیگم کی فون کال آئی۔ کہ شندی کو کوئی کِڈ نیپ کر رہا ہے!

سرفراز کے بندے کل شام اندھیرا چھاتے ہی بستی کے اِرد گرد منڈلانے لگے تھے۔ بس انتظار تھا تو صرف یاور خان کے گھر سے باہر نکلنے کا!

سکیم تو بہت زبردست تھی پر ــــ

جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے! میوہ خان نے جان کی پروا کیئے بغیر اغوا کاروں کو پسپا کرتے ہوئے شندی کی جان بچائی اور ــــ سرفراز اور نادیہ کے خواب خاک میں ملا دیئے۔

نادیہ کا سرفراز سے رابطہ کیسے ہوا تھا؟ تفتیش کے دوران محمد نعیم نے ہی بتایا۔ کہ جب شندی بیمار پڑی تھی۔ اور ڈاکٹر نادیہ اُسے دیکھنے آئی تھی۔ تو ساتھ

میں شندی کا چھوٹا سا ٹیلیفون انڈیکس بھی اپنے پرس میں لیتی گئی تھی۔

واہ۔۔۔ یاور خان کو حیرت پر حیرت ہو رہی تھی۔ نادیہ اِس حد تک گر سکتی تھی؟ اتنا دور رس اور گھناؤنا پلین بنا سکتی تھی؟ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا!

'کہیں دوستی سے بات آگے نکل گئی ہو تو؟' یاور خان کو کچھ عرصہ قبل کی نادیہ سے باتوں کے دوران کہی اپنی بات یاد آئی۔

'میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گی'۔ تب بھی اُس کے لب و لہجے میں وارننگ سی تھی! پر۔۔۔ اتنا بڑا انتقام؟ اتنا بھیانک انتقام؟ کہ بھلے شندی کی شادی ایک بدنام زمانہ، شادی شدہ بچوں والے شخص سے ہو جائے۔ جو اُس کی تمام املاک ہڑپ لے۔ جس کے ساتھ وہ تمام عمر روتے سسکتے زندگی گھسیٹتی رہے مگر۔۔۔

نادیہ کی خواہش پوری ہو۔ شندی یاور خان کو نہ ملے۔

لیکن۔۔۔ نادیہ اُس کے ساتھ Sincere تو نہیں تھی۔

پھر۔۔۔ اتنا خطرناک کھیل کیوں کھیلا تھا؟

اوہ۔۔۔ وہ سمجھ گیا۔ انور کے بعد اُس کے خیال میں شاید یاور خان ہی زیادہ پیسے والا تھا!

شام کے دھندلکے گھِر آئے تھے۔ آسماں پر بادل منڈلا رہے تھے۔ ہلکی ہلکی بونداباری ہو رہی تھی۔ اور۔۔۔

یاور خان سوچوں میں گم حسب معمول گھر کی طرف رواں دواں تھا۔

شندی کے حالات گھمبیر سے گھمبیر تر ہوتے جا رہے تھے۔ اُس کے کزن، چچا وغیرہ کو اُس کی جائے پناہ کا پتہ چل چکا تھا۔ پہلے فون پر شندی کی موجودگی کنفرم کرنے کی کوشش کی تھی۔ پھر اٹھوانے تک کی نوبت آ پہنچی تھی۔

اِن لوگوں نے اُسے کسی طور چھوڑنا نہیں تھا۔ اِس بار اٹھوانے کی کوشش کی کل کو کچھ اور بھی کر سکتے تھے۔

ایسے میں اُسے ابراہیم کا خیال آ گیا۔ ان حالات میں اُسے چاہیے



تھا۔ کہ فوراً اُس کے ساتھ نکاح کر لیتا۔ اپنی حفاظت میں لے لیتا۔ مگر۔۔۔

'ارے لعنت بھیجو ابراہیم پر۔ میں نے فون پر بتایا بھی اُسے سب۔ مگر لائٹس آف کر کے چھپ کر بیٹھ گیا گھر میں۔ نوکروں تک کو باہر نہیں بھیجا۔۔۔' اُس کے استفسار پر امی نے بتایا تھا۔

اُسے شدید حیرت ہوئی تھی۔ اگر ایسے وقت میں وہ اپنی منگیتر کی حفاظت نہیں کر پایا تھا۔ تو منگنی ہی کیوں کی تھی اُس سے؟ اچھا مرد تھا؟

'اے چھوڑو۔ نامرد کہیں کا۔ بس میرا منہ مت کھلواؤ'۔ امی سخت ناراض لگ رہی تھیں۔

ویسے۔۔۔ امی شندی پر خاص مہرباں نظر آ رہی تھیں۔ پتہ نہیں کیسے؟

'بائے داوے امی۔۔۔ آپ کی۔۔۔ اوپر والوں سے کیسے دوستی ہوئی؟' وہ چھیڑنے لگا اُنہیں۔

وہ اُس کا اشارہ سمجھ گئیں۔ جُزبُز سی ہوئیں۔

'کون؟ شندی سے؟'

'اچھا یہ نام ہے اُس کا؟' وہ مزید شرارت سے بولا۔

اُنہیں ہنسی آ گئی۔

'بہت مہرباں نظر آ رہی ہیں اُس پر۔۔۔'

'بس چھوڑو۔ اپنا خون ہے میرا۔ کب تک Avoid کرتی'۔

اُس کی سیاہ گھنی بھوئیں اوپر اُٹھ گئیں۔

'واؤ'۔ وہ خوبصورتی سے بولا تھا۔

یکا یک۔۔۔ پیچھے سے ہارن ہوا اور۔۔۔ اُس کے سوچوں کی دھارا بکھر گئی۔

بونداباری تھم گئی تھی۔ بادل دھیرے دھیرے چھٹ رہے تھے۔ شام کا پہلا نوخیز تارہ نظر آنے لگا تھا۔

اُس نے گاڑی آہستہ سے اپنے گھر کی سڑک پر ڈال لی۔ شیشہ نیچے کیا۔ بہت ساری بھیگی بھیگی، بھینی بھینی خوشبوئیں در آئیں۔

پتہ نہیں کیسے؟ اُسے شندی کا خیال آ گیا۔

اُس کی قربت میں بھی تو شبنم میں بھیگے پھولوں کی خوشبوؤں کا احساس ہوتا تھا!

جب سے یہ واقعہ ہوا تھا، اُسے قریب سے دیکھا تھا۔ یاد تو نہیں آنے دی تھی اُس کی لیکن ـــ دل میں ٹیسیں سی ضرور اُٹھ رہی تھیں!

یہ ٹیسیں کیا اُسی کی یاد کی نہیں تھیں؟ اچانک اُس نے خود سے سوال کیا۔

لیکن ـــ وہ کافی حد تک خود کو سنبھال تو چکا تھا۔ دن بھر مصروفیت کی ایک اونچی فصیل اپنے اِردگرد کھڑی کر دی تھی کہ اُس کی یاد کو در آنے کا موقعہ نہ ملے۔

رہی رات ـــ تو وہ آرام سے Sleeping pill لے لیتا تھا! اُس نے خود کو جواب دیا۔

'تو ـــ بھول پائے اُسے؟' اُس نے پھر خود سے پوچھا۔

'ہا... ں'۔ اُس نے جیسے جھجکتے ہوئے خود سے کہا۔

'کس کو دھوکہ دے رہو؟

'لیکن ـــ میں اُسے یاد کرنا نہیں چاہتا'۔

'یہ الگ بات ہے۔' جواب ملا!

میوہ خان نے گیٹ کھولا اور اُس کی محویت ٹوٹ گئی۔ آگے بڑھتے ہوئے گاڑی پورچ میں لے گیا۔

اپنے معمول کی کوفی وہ اِن دنوں امی کے ساتھ ٹیرس پر بیٹھ کر جادوئی اطراف پر نظریں جمائے، امی سے گپ شپ کرتے پیا کرتا تھا۔ اِس وقت بھی دونوں بیٹھے کوفی پی رہے تھے۔

"صبح سے شندی نے ہنگامہ مچایا ہے ..." انیسہ بیگم آہستہ سے گویا



ہوئیں۔

وہ خاموش رہا۔ اُس کے ذکر پر وہ شاذ ہی کوئی کومنٹ دیتا تھا۔

"اپنی ماما کو منگنی کی انگوٹھی دی ہے کہ جا کر ابراہیم کو دے آئے ..."

انیسہ بیگم بات کر رہی تھیں مگر ـــ پتہ نہیں کیوں؟ جیسے اُس کا سامنا نہیں کر پا رہی تھیں۔

اب یاور خان کے کان کھڑے ہوئے۔ استفہامیہ نظروں سے ماں کی طرف دیکھنے لگا۔ بات ہی کچھ ایسی تھی!

"کہتی ہے ایسے بزدل آدمی سے شادی کرتے ہوئے اُسے شرم آتی ہے۔ ساتھ میں یہ بھی کہہ رہی ہے۔ کہ منگنی توڑنے کے بعد وہ اُن کی اینکسی میں ایک پل بھی نہیں رہے گی۔ واپس اپنی حویلی جائے گی۔ آگے جو ہوگا۔ اُس کی قسمت ہوگی ..."

بات تو شندی نے ٹھیک کی تھی۔ بزدل تو وہ تھا۔

شندی تو شندی ـــ وہ تو پوری بستی کی نظروں میں گر گیا تھا!

مگر ـــ واپس حویلی؟

"اُس کا حویلی جانا، وہاں اکیلے رہنا ـــ یہ تو وہی سچویشن ہوئی جو روزِ اول کو تھی ..."

"میں خود پریشان ہوں۔ اُس کی ماما اُسے روکے ہوئے ہے۔ کہتی ہے نور جہاں سے بات کرے گی ..."

"وہ لوگ آ چکے ہیں کیا؟"

"ہاں۔ شام پانچ بجے پہنچے ہیں۔"

"آپ کا کیا خیال ہے اِس پورے معاملے کے بارے میں"۔

"میں تو سخت اَپ سیٹ ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ اِدھر شندی اکیلی اور مصیبت میں۔ اُدھر شاداب کا بار بار فون آ رہا ہے۔ ڈلیوری میں چند دن ہیں

اُس کے ...“

امی اچانک شندی کے لئے اِس قدر موم ہوگئی تھیں۔ اُسے حیرت ہو رہی تھی مگر ـــــ زیادہ پوچھ گچھ اِس لئے نہیں کی۔ کہ مبادا یُوٹرن لے لیں۔ ایسے حالات میں شندی کے لئے اُن کا وجود کسی نعمت سے کم نہیں تھا!

”ابراہیم واپس کب جا رہا ہے؟“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

”اُن کا ڈرائیور کہہ رہا تھا کہ پرسوں کراچی جائے گا۔ وہیں سے فلائیٹ ہے لنڈن کی“۔

یاور خان دو پل خاموش رہا۔ اندر جیسے کچھ ٹوٹ پھوٹ رہا تھا۔

”ابراہیم نکاح کیوں نہیں کر لیتا اُس سے“۔ وہ بڑے ضبط سے بولا۔

”اِس طرح شندی آنٹی اور انکل کے پاس شفٹ ہو کر محفوظ ہو جائے گی۔ بعد میں ابراہیم ڈوکیومنٹس تیار کر کے اُسے بلوا سکتا ہے“۔

اُس کا چہرہ اُس کے دلی جذبات کا آئینہ دار تھا۔ پرکشش چہرے پر سائے اور ـــــ دلنشیں آنکھوں میں کرب اُتر آیا تھا!

انیسہ بیگم ماں تھیں۔ بیٹے کے ایثار پر تڑپ کر رہ گئیں۔

”شندی نہیں مانے گی۔ اُس نے اپنی ماما سے کہا ہے کہ اگر وہ انگوٹھی واپس نہیں کرتیں۔ تو وہ خود جا کر دے آئے گی ...“

”یہ بچوں کا کھیل تو نہیں ہے۔ کہ جب دل چاہا انگوٹھی پہن لی۔ جب چاہا انگوٹھی اتار لی۔ منگنی کا فیصلہ تو اُس نے خود کیا تھا۔ کسی نے دباؤ تو نہیں ڈالا تھا۔ یہ سب سوچنے کا اب وقت نہیں ہے۔ پہلے سوچنا چاہئے تھا اُسے“۔ اُس نے قدرے توقف کیا۔ ”اُس نے حامی بھری۔ اِس کی تو سمجھ آتی ہے۔ اپنی حفاظت کی خاطر کیا جو کچھ کیا۔ لیکن ـــــ اتنی جلدی کیوں کی؟ میرے لنڈن سے واپسی کا انتظار تو کیا ہوتا۔ آخر تو پہلے بھی ہر پرابلم میرے ساتھ ہی ڈسکس کرتی تھی ...

وہ کہتا گیا اور ـــــ انیسہ بیگم مجرم سی بنیں سنتی رہیں۔ کیسے کہتیں کہ ـــــ ایک



طرف تو اُنہوں نے نور جہاں بانو پر دباؤ ڈالا تھا۔ کہ یاور خان کے لنڈن جاتے ہی ابراہیم کی شندی سے منگنی کرا دے۔ دوسری طرف کسی بھی شک وشبہ کا امکان ختم کرنے کے لئے اُنہوں نے شندی کی ماما کے ذریعے شندی کو خبردار کر دیا تھا۔ کہ وہ یاور خان سے شادی کا خواب دیکھنا بند کر دے۔

ایسے میں شندی ایسا نہ کرتی تو کیا کرتی؟

ایک لمحے کو تو جی میں آیا۔ بتا دے سب اپنے یاور کو۔ مگر دوسرے ہی لمحے اِرادہ بدل لیا۔

کیا سوچے گا اپنی ماں کے بارے میں؟ نظروں سے نہ گر جائیں کہیں اُس کی!

تبھی ـــــ میوہ خان اوپر آ گیا۔

”صاحِب۔ ماما نے نور محمد کو بھیجا ہے۔ شندی بی بی کو بخار ہے۔ دوا منگوائی ہے“۔

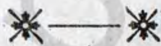
شندی کو چوٹیں آئی تھیں۔ اُسی وجہ سے غالباً بخار نے آ لیا تھا۔

یاور خان خاموشی سے اپنے کمرے میں گیا۔ دوائیاں نکال کر میوہ خان کو دیں۔ استعمال سمجھایا۔ اور امی کی طرف آ گیا۔

”آئیں امی اندر چلتے ہیں۔ سردی بڑھ رہی ہے۔ ٹھنڈ لگ جائے گی آپ کو“۔

”ہاں۔ چلو“۔

دونوں ماں بیٹا اندر آ گئے۔



شندی کے بخار کو تین ہفتے ہونے کو آئے تھے۔کسی طرح ٹوٹتا ہی نہیں تھا۔ٹمپریچر 100°c سے نیچے آ ہی نہیں رہا تھا۔اب تو یاور خان کو بھی فکر پڑ گئی۔زخم تو اُس کو معمولی سے آئے تھے۔اتنے دن ٹمپریچر زخموں کے ساتھ نہیں ہونا چاہئے تھا۔ اُس نے انیسہ بیگم سے شندی کو ہوسپٹل لانے کو کہا ۔ اُس کی Investigations کروائیں۔کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔دوائیاں بدل دیں۔اور ریسٹ کرنے کو کہا۔

چار دن مزید گزر گئے۔مگر وہی ــــ شام اُترتے ہی بخار اوپر چڑھنا



شروع ہو جاتا تھا۔

آج یاور خان اُسے خود دیکھنے گیا۔avoid کر رہا تھا اتنے دن۔پر کیا کرتا۔ڈاکٹر بھی تو تھا!

اب بھی ٹمپریچر تھا۔خاصی کمزور بھی ہو گئی تھی۔انیمک بھی لگ رہی تھی۔

''ماما۔کل ہوسپٹل میں داخل کرواتے ہیں آپ کی شندی بی بی کو''۔وہ واپسی پر ماما سے بولا۔اور ــــ

یوں وہ اگلے دن ہوسپٹل میں ایڈمٹ ہو گئی۔ ماما بھی ساتھ تھیں۔ اتفاق ہی تھا کہ وہی بلاک اور وہی کمرہ ملا تھا۔جہاں کچھ عرصہ قبل یاور خان اُسے حویلی سے لیکر آیا تھا۔

مزید ٹسٹ ہوئے۔ بظاہر سب ٹھیک تھا۔مگر ــــ ٹمپریچر پھر بھی وہی ہلکا ہلکا ــــ چل رہا تھا۔

شام چھ بجے فارغ ہوا۔تو یاور خان اُس کے کمرے میں آ گیا۔آج بھی سسٹر نرگس ساتھ تھی۔

یاور خان نے اُس کے Vital chart پر نظر ڈالی ۔ وہی کل والی حالت تھی۔

اِس وقت پھر اُس نے اُس کی نبض محسوس کی، سٹیتھوسکوپ سے معائنہ کیا، آنکھیں چیک کیں۔

'' سسٹر ۔ بلڈ سیمپل آغا خان لیب بھجوا دیں''۔ شاید وہاں کی Investigations زیادہ accurate ہوتیں!

''جی سر۔''

''اوکے''۔یاور خان نے کہا۔

اور ــــ ہمیشہ کی طرح باوقار چال چلتا کمرے سے باہر نکل گیا۔

نڈھال سی اُس نے کروٹ بائیں جانب کھڑکی کی طرف لے لی۔

اُس پار جنگل کے پیڑوں میں شام بسیرا کرنے لگی تھی۔ درختوں میں سے چھنتی عمارتوں میں روشنیاں جھلمل جھلمل کر رہی تھیں اور ___ پورے آکاش کو گھیرے میں لئے اودی گھٹائیں ___ اب برسیں کہ اب!

اُس نے گہری سانس لی۔

پہلی بار اِسی کمرے میں وہ اُسے کتنی شفقت اور چاؤ سے لیکر آیا تھا۔ اور آج ___

آج جیسے کوئی اجنبی تھی وہ۔ اشد ضروری ہوا۔ تو کوئی بات پوچھ لی ورنہ۔

چپ سادھ لی تھی بالکل!

اچانک اُسے لگا ___ وہ ڈاکٹر خان تھا! یاور خان نہیں تھا!

ڈاکٹر خان ___ ڈیوٹی فل اور اٹل!

وہ حادثہ والے دن اُس کی اینکسی میں آیا تھا۔ شاید اس لئے کہ بڑا حادثہ ہوا تھا۔ پھر کل شام آیا تھا۔ شاید ایک ڈاکٹر کا فرض نبھانے۔ اور ___ آج صبح سے وہ اُس کے کمرے میں تیسری بار آیا تھا۔ شاید اِس لئے کہ وہ اُسی کی پیشنٹ تھی!

مگر ___ بالکل سیریس۔ جبڑے سختی سے جڑے اور ___ ہونٹوں پر گہری سنجیدگی کی مہر ___ کہ بھولے سے بھی مسکراہٹ چھوگئی۔ تو شاید بوس نہیں رہے گا!

اپنی طرف سے وہ اُس سے قطع تعلق کر چکا تھا۔ لیکن بیچ میں ایسا واقعہ رونما ہوا تھا۔ کہ سامنا کرنا مجبوری بن گئی تھی۔ ورنہ شاید وہ اُس کی شکل تک نہ دیکھتا!

وہ حق بجانب تو تھا۔ اُس نے کسی اور سے منگنی کر لی تھی۔ اب وہ اُس کی نظر میں کسی اور کی امانت تھی۔ کیسے پہلے کی طرح شفقت اور پھر دھیرے دھیرے محبت سے پیش آتا؟



کتنا دکھ دیا تھا اُس نے اُسے۔ کتنی انسلٹ کی تھی اُس نے اُس کی!

لیکن ___ اُس نے جان بوجھ کر تو ایسا نہیں کیا تھا، ایسا کرنے میں اُسے کتنا درد ہوا تھا، کتنا تڑپی تھی۔ یہ تو وہ ہی جانتی تھی۔

اُس کا لنڈن سے فون آیا تھا۔ تو تب بھی وہ اُسے اصل حقیقت بتا نہ پائی تھی۔ اور اب ___ اب بھی اپنا آپ کم ظرف لگتا تھا کچھ بتاتے ہوئے!

اور پھر ___ کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ اُس کی دانست میں وہ اب ابراہیم کی ملکیت تھی۔ جبکہ خود شندی نے ___ اُسے اُس کی ماں سے کبھی نہ چھیننے کا اپنے آپ سے وعدہ کیا ہوا تھا!

اُس نے تھکی سی سانس لی۔

ایک میل نرس اُس کا بلڈ سیمپل لینے کمرے میں آیا۔ تو اُس کی سوچوں کی اُدھیڑ بُن تھم گئی۔

"جلدی سے ٹھیک ہوں۔ آپ بستر پر لیٹی اچھی نہیں لگتیں"۔ سسٹر نرگس اُس کا ماتھا سہلاتے ہوئے بہت اپنائیت سے بولی۔

وہ مسکرا دی۔

"پچھلی بار ہم لوگ دنوں آپ کو یاد کرتے رہے۔ مگر اِس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ آپ بخار چڑھا کر آجائیں..."

"اور میں کیسے آتی؟" وہ خوشگواری سے بولی۔

"ڈاکٹر خان سے کہہ کر آپ کسی بھی وقت آسکتی تھیں"۔

"ڈاکٹر خان سے؟" وہ بھی تو گھبراتی تھی ڈاکٹر خان سے۔ کم از کم اِن دنوں!

نرگس کھلکھلا کر ہنس دی۔

"پتہ چل گیا نا ڈاکٹر خان کا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہی تھی کہ سٹاف کی جان جاتی ہے اُن سے"۔

''ہاں چل گیا پتہ''۔ شندی اب بھی مسکرا رہی تھی۔ پتہ نہیں کیوں؟ یاور خان کے بارے میں نرگس کی باتیں اُسے اچھی لگ رہی تھیں۔

''بیٹی۔'' سسٹر کو مخاطب کرتے ہوئے ماما گویا ہوئیں۔ ''میری بچی کا بخار اُتر کیوں نہیں رہا؟'' وہ بہت فکر مند لگ رہی تھیں۔

''اُتر جائے گا۔ آپ فکر کیوں کرتی ہیں۔ بخار ہی تو ہے''۔ وہ مسکراتے ہوئے میڈیکل سٹاف کے Typical انداز میں بولی اور ___

دو چار مزید باتیں کرتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔

لائیٹس آن تھیں۔ ڈنر آچکا تھا۔ ویسے کا ویسا پڑا تھا۔ کہ اُس کی بھوک ہی غائب تھی۔ ماما ٹی وی کی آواز بند کئے سکرین پر نظریں جمائے تھیں۔ شندی آنکھیں نقاہت سے موندے لیٹی تھی۔

معاً ___ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ اور انیسہ بیگم بمعہ نور جہاں بانو اور جج صاحب کے اندر داخل ہوئیں۔

نور جہاں بانو اور جج صاحب کچھ دیر اُس کے پاس بیٹھے رہے۔ پھر ڈھیروں تسلیاں اور دعائیں دیتے چل دیئے۔

انیسہ بیگم البتہ وہیں رہ گئیں۔ اُنہیں بہت تشویش تھی اُس کے بارے میں ۔مگر ظاہر نہیں کر رہی تھیں۔ کہ وہ گھبرا نہ جائے۔

''ماما۔ خالہ جان کے لئے چائے بنائیں''۔ انیسہ بیگم ہی کے کہنے پر اب وہ اُنہیں بہت پیار سے خالہ جان کہہ کر بلاتی تھی۔

ماما چیسٹ پر رکھے الیکٹرک کیٹل کی طرف گئیں۔

''نہیں الفت۔ ایک گلاس پانی دیدو بس''۔ اُنہوں نے منع کر دیا۔

ماما گلاس میں جوس ڈال کر لے آئیں۔

''الفت تم روز بھول جاتی ہو۔ کہ مجھے شوگر ہے۔'' وہ بہت دوستانہ انداز میں بولیں۔



''ہائے بیگم صاحب۔ پھر بھول گئی۔'' پھر دوسرے گلاس میں فریج سے بوتل نکالتے ہوئے منرل واٹر بھرا۔ ''یہ لیجئے۔'' انہوں نے انیسہ بیگم کو گلاس تھما دیا۔

انیسہ بیگم کی ماما سے خوب بنتی تھی۔ خوب خوب گپ شپ کیا کرتی تھیں دونوں۔ اب تو انیسہ بیگم ماما سے نفیسہ بیگم کے بارے میں بھی پوچھا کرتی تھیں۔ غور سے اُن کے حالات سنا کرتی تھیں۔ اُن کے دکھ میں دکھ اور سکھ میں خوشی کا اظہار کرتی تھیں۔

شندی کو یہ سب بہت اچھا لگتا۔ یاور خان بھی کیوں نہیں آ بیٹھتا تھا اُن میں؟ آخر تو اُس کا کزن تھا۔ انیسہ خالہ کا بیٹا تھا۔ اُس سے ناراض سہی ___ رشتہ تو اپنی جگہ تھا۔ وہ اُسے دیکھتی تو ___ سنتی تو!

اُس کے جاندار قہقہے، مسحور کن باتیں، جادو جگاتی آنکھیں! وہ سنتی تو ___ دیکھتی تو!

دس بجے میوہ خان آیا۔ اور انیسہ بیگم اُسے بہت سارا پیار کرتیں، ڈھیر ساری دعائیں دیتیں ___ گھر روانہ ہو گئیں۔

ماما کیفی ٹیریا میں کھانا کھانے چلی گئیں۔ سسٹر نرگس حسب سابق اُس کے پاس اندر آ گئی۔ دیکھا اُس کا کھانا جوں کا توں پڑا تھا۔ اُسے معلوم تھا شندی کا کھانے کو دل نہیں کرتا تھا۔ اشتہا جیسے ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ تبھی تو ویٹ لوز کر رہی تھی، تھکن محسوس کرتی تھی بہت زیادہ۔ بہر حال ___

نرگس نے اُسے زبردستی سُوپ پلانے کی کوشش کی۔ دو چمچ پڈنگ کے بھی کھلائے۔ اور ___

دوائیاں لینے کی تاکید کرتے ہوئے ___ باہر نرسز کاؤنٹر پر چلی گئی۔

تکیوں کے سہارے بستر سے پشت ٹکاتے ہوئے اُس نے سامنے ٹی وی پر نظریں جما دیں۔

معاً ___ اُس کا سیل فون بجنے لگا۔

ناہید کا تھا، اُس کی بہت کلوز فرینڈ کا۔

جب سے اُس کی کِڈ نیپنگ کا واقعہ ہوا تھا۔ تب سے ہی وہ ابراہیم کی اینکسی چھوڑ کر اپنی حویلی واپس جانے کو عملی جامہ پہنانے کی تیاری میں لگ گئی تھی۔ جانے کہاں سے اُس میں اتنی ہمت وطاقت آ گئی تھی۔ کہ سب چھوڑ چھاڑ دوبارہ اپنی حویلی میں جا بسنے کا سوچ لیا تھا۔

ابراہیم کی بزدلی نے اُسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ مزید دوسروں کی مرہونِ منت اور احسانوں تلے دبی زندگی گزارنا نہیں چاہتی تھی۔ پچھلے کچھ عرصے کی ٹھوکروں نے اُسے قدرے مضبوط بھی بنا دیا تھا۔ انکل جہانگیر علاج کی غرض سے کچھ عرصے کے لئے بیرون ملک گئے ہوئے تھے۔ اور سرفراز کہیں چھپا ہوا تھا۔ یہ اُسے انیسہ بیگم سے پتہ چلا تھا۔ جنہیں یقیناً یاور خان نے بتایا تھا۔ بہر حال ـــــ

اُن دونوں کی غیر موجودگی میں وہ حویلی جا کر اپنے ملازموں اور گارڈز کو اکٹھا کر کے، پولیس کی مدد لیتے ہوئے اپنے گھر میں رہ سکتی تھی۔ اب تو اُسے کورٹ کچہری کا سامنا کرنا پڑا تو بھی کر لیتی۔ وہ کون تھی؟ کیا تھی؟ اُس نے سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ رہی بدنامی ــــ تو اُس کے چچا اور چچازاد نے جو اُس کے بارے میں پروپیگنڈہ کرنا تھا کر چکے تھے۔ اب اُس نے اپنی جنگ خود لڑنا تھی۔ بس اللہ کا فضل وکرم چاہیے تھا!

دو چار روز قبل ہی اُس نے ناہید کو فون کر کے سارا احوال اُس کے گوش گزار کر دیا تھا کہ اب اُس کی روپوشی کا راز عیاں ہو چکا تھا۔ سرفراز کے علاوہ انکل جہانگیر اور یقیناً ماموں جان بھی اُس کے where-abouts جان چکے تھے۔ ناہید سے کیا چھپانا تھا؟

اُس نے ناہید کو اپنے تمام ملازمین کے ایڈریسز دیتے ہوئے اُس کے والد سے ریکویسٹ کی تھی۔ کہ وہ اُن سب تک رسائی حاصل کر کے اُنہیں حویلی پہنچنے کی تاکید کریں۔ مزید ـــــ کہ اُسے پولیس کی نگرانی کی ضرورت تھی!



ناہید کے والد جمشید علی قریبی شہر کے رہنے والے تھے۔ عالمگیر حیدر کوئی ڈھکی چھپی شخصیت نہیں تھے۔ آس پاس کے علاقوں میں سبھی اُنہیں جانتے تھے۔ وہ اُن کے انتقال اور شندی کی گھر سے فرار سے بھی واقف تھے۔ اُس کی فرار کی اُس کے چچا اور سرفراز نے لوگوں کے سامنے جس غلط انداز میں پیش کیا تھا اُس پر اُنہیں بہت افسوس تھا۔

پھر ـــــ ناہید کا شندی کی وجہ سے عالمگیر حیدر کے یہاں آنا جانا بھی تھا۔ اُسے پک اینڈ ڈراپ کرنے دو ایک بار وہ خود بھی گئے تھے۔ اِسی اثناء ایک بار اُن سے ملاقات بھی ہوئی تھی۔ بہت عمدہ انسان تھے!

شندی کے حالات جان کر اُنہیں بہت دکھ ہوا۔ وہ ناہید کی دوست تھی۔ اِس ناطے اُن کی بیٹی تھی۔ اُنہوں نے فوراً اپنی ہر ممکن مدد کی یقین دہانی کرائی۔

"تمہارے انکل کچھ ہی دن پہلے لنڈن گئے ہیں۔ تمہارا کزن سرفراز پولیس کے ڈر سے کہیں چھپ گیا ہے۔ شاید تمہاری کِڈ نیپنگ کے کیس میں۔ تمہارے تین ملازم بآسانی مل گئے ہیں۔ اکرم بابا تمہارے انکل کے خوف سے کہیں روپوش ہیں۔ وہ تین ملازم کہہ رہے تھے کہ اُنہیں اُن کی جائے پناہ پتہ ہے۔ کہہ رہے تھے کہ تمہارے آنے سے پہلے پہلے وہ اُنہیں ساتھ لیکر حویلی پہنچ جائیں گے۔ چاروں گارڈز کو بھی مطلع کر دیں گے۔ رہے تمہارے ماموں۔ تو وہ بمعہ اہل وعیال کے خوش باش زندگی گزار رہے ہیں ..." ناہید نے خوشگواری سے بات ختم کی۔ اور ـــــ

شندی کو عرصہ بعد ایک گونہ اطمینان نصیب ہوا۔



دن گزرتے جا رہے تھے۔ شندی کو اب بھی شام چھ بجے تک بخار آلیتا تھا۔ رات گئے تک رہتا تھا۔ پھر دھیرے دھیرے کم ہوتے ہوئے 99°c پر آجاتا تھا۔

یاور خان اور سب گھر والے سخت پریشان تھے۔ متفکر تھے۔ طرح طرح کے وسوسے دلوں میں سر اٹھا رہے تھے۔

پچھلے چند دنوں سے وہ فزیشن کے زیرِ نگرانی تھی۔ اِس وقت بھی یاور خان شندی کے تمام Investigation reports ساتھ لئے اُن کے آفس میں بیٹھا اُن سے شندی کا کیس ڈسکس کر رہا تھا۔



فزیشن ایک ایک کر کے ایک بار پھر سب رپورٹس دیکھ رہے تھے۔

''ڈاکٹر خان۔ ہمیں کسی بھی خبر کے لئے کسی بھی وقت تیار رہنا چاہئے''۔

رپورٹس ایک طرف کرتے ہوئے اُنہوں نے پرسکرپشن پیڈ اپنے سامنے رکھا۔

''میں یہ پانچ دن کی دوائی لکھ کر دیتا ہوں۔ اِس سے ٹمپریچر ختم نہ ہوا تو we would go for further investigations." پیڈ پر میڈیسن لکھتے لکھتے فزیشن گویا ہوئے۔ "The possibility of Lymphoma can not be ruled out."

یاور خان کا رنگ بلیچ ہوگیا۔

"Lymphoma?" اُس کی آواز جیسے دور سے آرہی تھی۔

"Well, I suspect so ..." سر اٹھاتے ہوئے اُنہوں نے یاور خان کی طرف دیکھا۔

یاور خان اب بھی اُنہیں دیکھ رہا تھا۔ خالی خالی نظروں سے!

''آپ ڈاکٹر ہیں''۔ اُنہوں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے جیسے تسلی دینا چاہی۔ "And this is called life"

یاور خان نے ایک گہری بے بس سانس لی۔ پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

''اوکے۔ تھینک یو سَر''۔ اُس نے سینئر فزیشن کا شکریہ ادا کیا اور ___ بوجھل سے قدم اٹھاتا اپنے آفس آگیا۔ اسسٹنٹ کو دوائی لانے کا کہا۔ اور خود مریض دیکھنے لگا۔

آج ہفتہ تھا۔ ہاف ڈے تھا۔ آؤٹ ڈور مریضوں کی لائین لگی تھی۔

ایک بجے فارغ ہوتے ہی وہ شندی کی طرف آگیا۔

مسلسل بخار سے وہ کافی کمزور ہوگئی تھی۔ Lymphoma ___ میلگنینسی ___ دوسرے لفظوں میں کینسر! اور ___ یاور خان کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔

''کیا حال چال ہیں میم شاندانہ''۔ اُس نے خود کو سنبھالا۔ پاس آتے

ہوئے اُس کی نبض تھام لی۔

چونکتے ہوئے وہ اُسے دیکھنے لگی۔ وہ بولا تھا اُس سے۔ وہ بھی بالکل شروع کی طرح! بہت اپنائیت سے، بہت کیئر سے۔ انہونی ہی تو تھی!

بے حس بُت بنا رہتا تھا کل تک۔ سنگین سناٹا لئے ہوتا تھا پورے سراپے میں، بے درد سکوت چھایا رہتا تھا آنکھوں میں!

دیکھتے ہی دیکھتے اُس کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ ہی تو تھا اُس کا سب کچھ۔ محافظ بھی، محبت بھی! اتنے دن وہ پتہ نہیں کہاں بھٹکتی رہی تھی؟ غیروں میں، انجانوں میں! جبکہ ــــ

اپنے موجود تھے۔ لیکن ــــ کیسے موجود تھے؟ یاور خان تو کوسوں دور چلا گیا تھا۔ معلوم نہیں آج کیسے لوٹ آیا تھا؟

''روؤ نہیں پلیز!'' وہ بہت پہلے کی طرح اُس کے بستر کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ ''تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔'' اُس کے آنسو اپنی انگلیوں پر اٹھاتے ہوئے وہ ملائمت سے بولا۔

جبکہ ــــ وہ جانتا تھا وہ بخار کی وجہ سے نہیں، اُس کی بے رخی کی وجہ سے رو رہی تھی!

پر ــــ اُس نے بھی تو اُس کے ساتھ بہت زیادتی کی تھی۔ کسی اور کو اُس پر ترجیح دی تھی۔ اُس کی انسلٹ کی تھی، اُس کی محبت کی بھی!

اِس وقت بھی اُس کے پرکشش چہرے پر تاریک سا سایہ لہرایا۔

مگر ــــ دوسرے ہی لمحے کینسر؟ اور ــــ اُس کی جیسے سانس رکنے لگی۔

لنچ پر شندی نے بمشکل آدھا سیب کھایا۔ یاور خان نے اپنے ہاتھ سے فزیشن کی تجویز کردہ دوا کھلائی۔ ماما کو چند ہدایات دیں۔ تسلی دی اور ــــ

باہر آتے ہوئے سسٹر نرگس سے شندی کے ٹمپریچر سے اُسے باخبر رکھنے کا



کہتے ہوئے وہ ــــ گھر روانہ ہو گیا۔

لنچ کے بعد وہ آرام کرنے اپنے بیڈروم میں آ گیا۔ مگر ــــ

آرام کہاں؟ شندی کو کچھ ہو گیا تو؟

تمام دوپہر وہ کروٹیں بدلتا رہا۔ پانچ بجے اُٹھ کر امی کی طرف آ گیا۔ وہ اپنے کمرے میں نہیں تھیں۔ یقیناً شام کی چائے پر اُس کی منتظر معمول کی طرح کچن کے باہر گھاس پر کرسیاں ڈلوائے بیٹھی تھیں۔

وہ وہیں آ گیا۔ امی کے مقابل والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''یہ کیسا بخار ہے کہ اترتا نہیں ہے؟'' اُن کی فکرمند آنکھیں اُن کے اندیشوں کی غماز تھیں۔

''ہو جاتا ہے کبھی کبھی۔ آپ فکرمند نہ ہوں''۔

جبکہ وہ خود ــــ مجسم 'فکر' بنا ہوا تھا!

تبھی ــــ اُسے گیٹ کے قریب میوہ خان نظر آ گیا۔ اُس نے آواز دے کر اُسے بلا لیا۔ اُس کے ساتھ باتیں کر کے ہی شاید اُس کا اور امی کا دھیان بٹ جائے!

اور پھر ــــ میوہ خان شروع ہو گیا۔ پوری بستی کی خبریں ایک ہی سانس میں سنا ڈالیں۔

کتنی معصومیت تھی اِن لوگوں میں۔ کتنے Innocent تھے یہ لوگ!

نہ کسی بیماری کا پتہ۔ نہ کسی روک تھام کی پروا۔

اور ــــ عقیدہ اِس قدر مضبوط کہ مایوسی پاس بھی نہ پھٹکے۔

کوئی بیمار پڑ گیا، تو گناہ ڈھل گئے۔ مر گیا، تو اللہ کی مرضی!

کتنی تسلی آمیز حقیقت بھی۔ کتنے قریب تھے یہ لوگ خدا کے۔

پڑھ لکھ کر اُن کے عقیدے کمزور پڑ گئے تھے۔ بیماریوں کے بارے میں جاننے لگے تھے۔ مداوا ڈھونڈنے لگے تھے۔ اور ــــ کوئی مر گیا؟ تو واویلا کرنے

لگے تھے!

پڑھے لکھوں کو اِن سے سیکھنا چاہیے۔ سب کچھ اللہ پر چھوڑ کر کتنے مطمئن اور پُر سکون ہوتے ہیں!

اُس کو بھی قدرے قرار آ گیا۔

میوہ خان اب بھی وہیں بیٹھا تھا۔ اب بھی تینوں باتیں کر رہے تھے۔

شاداب کے یہاں بچی پیدا ہوئی تھی۔ انیسہ بیگم نے سب نایاب کے سپرد کر دیا تھا۔ ایسے میں شندی کو اکیلا چھوڑ جانا اُن کا ضمیر گوارا نہیں کر رہا تھا۔

شندی بھی تو بہت تکیہ کیئے بیٹھی تھی اُن پر۔ بہت پیاری بچی تھی۔ خواہ مخواہ وہ اتنا عرصہ اُس کے خلاف دل میں بغض لیئے بیٹھی تھیں۔ اُن کے کہنے پر وہ اُنہیں 'خالہ جان' کہکر بلاتی۔ تو وہ نہال ہو جاتی تھیں۔ بہت مٹھاس تھی اِس لفظ میں، اِس رشتے میں!

وہ نایاب اور شاداب کو بھی گاہے گاہے بتاتی رہتی تھیں۔ وہ لوگ بھی اُن کی اِس اچانک تبدیلی پر بہت خوش تھیں۔ لیکن ___ پر افسوس ضرور ہوتا تھا کہ ___ شندی اُن کی دسترس سے نکل گئی تھی۔ یاور بھائی کتنے خوش ہوتے ہونگے امی کا شندی کی طرف جھکاؤ دیکھ کر۔ لیکن ساتھ ہی اُنہیں بھی کتنا دکھ ہوتا ہو گا شندی کے ہاتھ سے نکل جانے کا۔ دونوں بہنیں آپس میں ہی باتیں کرتی رہتیں۔

شام گہری ہو چلی تھی۔ سردی سوا ہو گئی تھی اور ___ کہکشاں بستی پر جھک آئی تھی۔

اُس نے گہری سانس لی۔ کوشش کے باوجود اُداسی نے پھر آ لیا تھا۔ امی کو کوئی خبر نہیں تھی۔ کہ ڈاکٹرز کو کیا اندیشے تھے؟

رات دس بجے اُس نے سسٹر کو فون کیا۔ پروگریس پوچھی مگر ___ کچھ فرق آیا ہوتا تو وہ بتاتی!

اتنی جلدی کیا فرق آیا ہو گا؟ اُس نے بھی سوچا۔ اور ___

امید و بیم کی کیفیت میں سونے کی تیاری کرنے لگا۔



ہوسپٹل پہنچتے ہی وہ شندی کے کمرے میں آ گیا۔ سسٹر نرگس بھی ساتھ تھی۔ اُس نے شندی کا چارٹ دیکھا۔ ٹمپریچر ویسے کا ویسا تھا۔ شکل سے کچھ بھی ظاہر کیئے بغیر وہ شندی کے بستر کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ اُس کا حال احوال پوچھنے لگا۔

سسٹر جان چکی تھی اب تک۔ کہ وہ یاور خان کی کزن تھی۔ جبھی وہ اتنی دلچسپی لیتا تھا اُس کے کیس میں۔

''اب جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ، ہاں''۔ یاور خان نے شفقت سے اُس کا

گال تھپتھپایا اور ___ اٹھ کھڑا ہوا۔

''سر۔ اِن کی ماما کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے''۔ سسٹر نے یاور خان کو مطلع کیا۔

''کیوں کیا ہوا؟'' اُس نے ماما سے پوچھا۔

''گھٹنوں کا درد بہت بڑھ گیا ہے''۔

''سسٹر۔ اِن کو میڈیسن دیں۔'' اُس نے دوائی کا نام بتایا۔ پھر ___ ماما کی طرف متوجہ ہوا۔

''ماما آج آپ گھر جائیں ۔ آرام کریں۔ لوگ ہیں یہاں دیکھنے کو۔ میوہ خان اِدھر ہی ہے۔ آپ کو گھر چھوڑ آئے گا۔ اُس نے کہا اور ___

دروازے کی طرف بڑھا۔ سسٹر بھی ساتھ چلی گئی۔

''میں نے پہلے بھی کہا تھا آپ سے گھر جانے کو... '' شندی ماما سے مخاطب ہوئی۔

''اے کیسے تمہیں اکیلا چھوڑ کر گھر چلی جاتی۔ میرے تو اب بھی دل میں ہول اٹھ رہے ہیں۔ بخار تمہاری جان چھوڑے تو کچھ تسلی ہو... ''

''اُتر جائے گا۔ بخار ہی تو ہے''۔ شندی نقاہت سے بولی۔

''اللہ کرے آج ہی اترے اور پھر کبھی نہ آئے۔ آمین!!

اُن کے جانے کے بعد تھوڑی ہی دیر بعد نور جہان بانو آ گئیں۔ دیر تک بیٹھی رہیں۔ اُس کا دھیان بٹانے کو اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہیں۔ ڈیڑھ بجے کے قریب یاور خان بھی آ گیا۔

مزید کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد نور جہاں بانو واپس چلدیں۔

یاور خان وہیں کھڑکی کے پاس صوفے پر بیٹھا تھا۔ سوچوں میں گم تھا۔

شندی نے کروٹ اُس کی طرف لے لی۔ خاموشی سے اُسے تکنے لگی۔

کتنا چاہتی تھی وہ اُسے۔ کتنا قریب تھا وہ اُس کے۔ اِس کے باوجود کتنا



دور تھا وہ اُس سے!

وہ چاہتی تھی کہ وہ اُس سے باتیں کرے۔ پہلے کی طرح خوبصورت اور دلچسپ باتیں۔ مگر ___

جانے کن سوچوں میں گم تھا وہ؟

پہلے جیسی نہ سہی، کہ وہ اُس کی نظریں کسی اور کی ملکیت تھی۔ پر ___ ویسے تو گپ شپ کر سکتا تھا۔ اِدھر کی اُدھر کی۔ کزن تو تھا نا اُس کا!

شندی خواہ مخواہ بیڈ سائیڈ ٹیبل پر سے کچھ اٹھا اٹھا کر رکھتی گئی۔ کہ شاید اُس کی محویت ٹوٹے۔ اور وہ اُس کی طرف متوجہ ہو لیکن ___ ایسا کچھ نہیں ہوا۔

کھڑکی کے اُس پار خلاؤں میں تکتا وہ اب بھی چپ چاپ بیٹھا تھا۔

تبھی ___ سسٹر نرگس اندر آ گئی۔ یاور خان کو بیٹھے دیکھ کر سٹ پٹا سی گئی۔ بریک میں وہ اپنے کاؤنٹر پر نہیں تھی۔ اِس لئے اُس نے یاور خان کو اندر آتے نہیں دیکھا تھا۔

وہ اکثر اِسی طرح چلی آتی تھی۔ گھڑی دو گھڑی شندی سے کھڑے کھڑے بات کر کے واپس چلی جاتی تھی۔ شندی کی انکساری اور ملنساری سے وہ بہت متاثر تھی۔

''آپ کو... کچھ... چاہئے تو نہیں۔ آپ کی ماما نہیں ہیں نا۔ کوئی پروبلم ہو تو... '' یاور خان کے سامنے وہ اور کیا کہتی؟

یاور خان سمجھ گیا تھا کہ سسٹر نرگس اندر آئی تھی۔ شندی سے جو کچھ کہہ رہی تھی وہ بھی سن رہا تھا مگر ___

نظریں اب بھی کھڑکی کے اُس پار جمی تھیں۔

''پروبلم ہے نا''۔ اس کے کانوں میں شندی کی آواز پڑی۔

''بتائیں نا پھر۔'' سسٹر اُس کے سرہانے آ گئی۔

''ڈاکٹر خان مجھ سے بات نہیں کر رہے''۔ وہ بچوں کی سی معصومیت

سے بولی اور۔۔۔

یاور خان بے اختیار ہنس دیا۔ رخ شندی کی طرف کرلیا۔

سسٹر نرگس بھی مسکرادی۔ اُن دونوں کی آپس میں دلچسپی وہ پچھلی بار ہی نوٹ کرچکی تھی۔ اب تک قائم تھا رشتہ۔ اُسے اچھا لگا!

''کوئی کام ہوتو بیل کردیجئے گا''۔ نرگس نے کہا۔ اور باہر نکل گئی۔

''آپ مجھ سے بات کیوں نہیں کرتے؟'' وہ بول ہی پڑی۔

ساتھ ہی جانے کیوں؟ خوبصورت آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔

اٹھتے ہوئے وہ پاس چلا آیا۔ اُس کے قریب بیڈ پر بیٹھ گیا۔

''کیوں نہیں کرتا بات۔'' عرصہ بعد اُس نے اپنائیت سے اُس کے بال سہلائے۔ ''بس۔۔۔ کچھ پریشانیاں ہیں اپنی!''

اُس کے متواتر اٹھتیس دن کے بخار سے وہ پریشان ہی تو تھا!

جانے کیا ہونے والا تھا؟

وہ تو بھول گیا تھا سب کچھ۔ ابراہیم، منگنی۔۔۔ بیوفائی، انسلٹ۔ اُسے کچھ یاد نہیں تھا۔ یاد تھی تو بس۔۔۔

"The possibility of Lymphoma can not be ruled out..."

فزیشن کی بات۔ جو اِس وقت بھی اُس کے کانوں میں گونج رہی تھی!

معاً وہ جھکا۔۔۔ اور۔۔۔ اُس کی بھیگی بھیگی آنکھوں پر اپنے ہونٹ رکھدیئے۔

اِس لمحے وہ اُس کی تھی۔ کل کی کسے خبر۔ ہونہ ہو!

اور پھر۔۔۔ وہ جیسے بہک گیا۔ پیار پر پیار کرنے لگا اُسے۔

وہ جو اُس نے اپنے سلگتے جذبوں پر بندھ باندھ رکھا تھا۔ ٹوٹ پھوٹ گیا۔ بہہ گیا سب کچھ۔

وہ اُسی کی تھی۔ اُس کی زندگی تھی۔ وہ نہ رہی تو وہ بھی جی نہیں پائے گا!

وہ اور بھی بیقراری سے اُسے چومنے لگا۔



شندی کو اُسکی صلح کا انداز بہت پیارا لگا۔

اُس نے بھی اُس کی گردن میں اپنی دونوں بانہیں حمائل کردیں۔ کومل لب اُس کے گال پر رکھدیئے۔

پھر۔۔۔ وہ چونکی۔ یاور خان کی آنکھیں سرخ اور نم تھیں۔ کیوں؟ وہ سمجھ نہیں پائی!

شام کو یاور خان نرسز کاؤنٹر پر آیا۔ اُس کا vital chart دیکھا۔ ٹمپریچر بدستور تھا۔

خود کو سنبھالتا۔۔۔ وہ اندر گیا۔ ہشاش بشاش بنا۔ اُس کو تسلی دی۔ اور۔۔۔ جلدی ہی باہر نکل آیا۔

گھر کی طرف رواں دواں۔۔۔ وہ سوچ رہا تھا۔ کیا شندی بچ پائے گی؟



ایوننگ سیشن شروع ہوتے ہی وہ فزیشن کے آفس میں آ گیا۔ شندی کا ہی کیس ڈسکس کرنے۔ آج چوتھا دن تھا شندی کو فزیشن کی دوائی استعمال کرتے۔

"آج کا دن دیکھتے ہیں۔ ٹمپریچر میں فرق آیا تو ٹھیک ورنہ ... we Should proceed further"

یاور خان بے بسی سے انہیں دیکھنے لگا۔

"سر۔ کل کا دن بھی تو ہے۔ ہو سکتا ہے اُتر جائے ٹمپریچر ..." وہ آس



اور یاس کے عالم میں بولا۔

"جیسے آپ کی مرضی۔ کل کا دن بھی دیکھ لیتے ہیں ..."

معاً۔۔ یاور خان کا سیل فون بج اٹھا۔

اُس نے کان سے لگایا۔

"سر۔ میم شاندانہ... expire ہو گئی ہیں۔" سسٹر نادرہ کی آواز تھی۔

وہ سب چھوڑ چھاڑ تقریباً بھاگتا ہوا شندی کی طرف چل دیا۔

کمرے میں گیا۔ شندی آنکھیں بند کیے بستر پر دراز تھی۔ اور امی اُس کے سرہانے بیٹھیں پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔

وہ کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح پاس چلا آیا۔

"شندی"۔ وہ اُس پر جھک آیا۔

"شندی"۔ اُس نے اُس کا چہرہ چھوا۔ بالکل ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔

وہی ٹھنڈ یخ بستہ لہر بن کر اُس کی ریڑھ کی ہڈی میں سے تیر گئی اور۔۔

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

اوہ۔۔ کتنا بھیانک خواب تھا!

اُس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھے جگ میں سے گلاس میں پانی ڈالا۔ اور ایک ہی سانس میں پی گیا۔"

صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ وہ اٹھا، نماز پڑھی، اور امی کی طرف آ گیا۔ اِس وقت وہ نماز سے فارغ ہو کر ایک کپ چائے پیتی تھیں۔ اور پھر تسبیح لیکر۔۔ بستر میں باری تعالیٰ کا ذکر کیا کرتی تھیں۔

"نیند نہیں آ رہی کیا؟" اِس وقت خلاف توقع اُسے اپنے کمرے میں آتے دیکھ کر انہوں نے پوچھا۔

"ہاں"۔ وہ وہیں اُن کے پاس بستر میں بیٹھ گیا۔

"چائے پیئو گے؟"

''ہاں امی''۔

''ٹھہرو میں بنا کر لاتی ہوں''۔ انیسہ بیگم اِس وقت حمید کو نہیں جگاتی تھیں۔ خود بنالیا کرتی تھیں چائے۔

''آپ بیٹھیں پلیز۔ میں خود بناتا ہوں''۔

وہ نیچے چلدیا۔ اور ـــــ

تھوڑی ہی دیر میں مگ میں چائے لئے آ گیا۔

''میں نے شندی کے لئے وظیفہ شروع کیا ہے۔'' امی کہنے لگیں۔

''ویسے بیٹا۔ شندی کا بخار کوئی سیریس بات تو نہیں ہے نا؟''

اِس موذی مرض کے بارے میں تو ہر ایک کو دھڑکا لگا رہتا تھا۔ بخار کے طوالت سے وہ بھی سہمی ہوئی تھیں۔

''امی مجھے خود کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔ فزیشن ایک دوائی ٹرائے کر رہا ہے۔ پانچ دن کی ہے۔ آج اُسے بھی تیسرا دن ہے... دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے؟''

''لیکن بخار تو کم تک نہیں ہوا۔'' امی تشویش سے بولیں۔

''یہی تو ساری مشکل ہے۔ پرسوں تک بخار نہ اترا تو...'' اُس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''تو؟ تو کیا بیٹا؟'' امی کی تسبیح پر گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

''امی ڈاکٹر کو... کینسر کا شک ہے؟ کب تک چھپاتا وہ؟

''کیا؟'' امی کی آواز ڈوب سی گئی۔

اُس نے گہری سانس لی۔ تشویش تھی جس میں، کیئر تھی جس میں۔

''اوروں کے ساتھ ہوتا ہے۔ تو ہمارے ساتھ بھی ہو سکتا ہے...''

''ایسا مت کہو بیٹا۔ اللہ نہ کرے ایسا ہو۔ نہ ہمارے ساتھ ہو نہ ہی کسی اور کے ساتھ ہو...''

''کاش امی۔ سب کچھ اپنے بس میں ہوتا...''



کتنا دکھی تھا وہ؟ کتنا اَپ سیٹ!

وہ تو کب سے اپنے کئے پر پشیمان تھیں۔ جب سے شندی کے ساتھ میل ہوا تھا۔ وہ اُسے بالکل نایاب اور شاداب کی طرح چاہنے لگی تھیں۔ خون کیا ایسا بھی رنگ لاتا ہے؟ اُنہیں اکثر حیرت ہوتی!

اِس وقت فزیشن کی بات سن کر تو دل دہل گیا تھا۔ یاور خان کی حالت دیکھ کر اور بھی اوسان خطا ہو رہے تھے۔

بہت پیار کرتا تھا وہ شندی سے۔ وہ ماں تھیں۔ سب سمجھ رہی تھیں مگر ـــــ کبھی جو ماں کے سامنے زبان کھولی ہو۔ چپ چاپ سہہ رہا تھا سب کچھ۔

ایک بار پھر وہ خود کو اُس کا مجرم سمجھنے لگیں۔ یہی گلٹ تھا شاید۔ یا پھر ـــــ شندی کی اپنی بے شمار خوبیاں، یا پھر ـــــ خون کا جوش کہ وہ ـــــ کئی دنوں سے برابر سوچ رہی تھیں کہ شندی کے ہوسپٹل سے آتے ہی وہ اُس کا ہاتھ اپنے یاور کے ہاتھ میں دیدیں گی۔ مزید دکھی نہیں دیکھ سکتی تھیں وہ اُسے۔ اُنہوں نے نایاب اور شاداب سے بھی بات کر لی تھی۔ بس نہیں کی تھی تو ـــــ یاور خان سے!

وہ تینوں اُسے سرپرائز دینا چاہتی تھیں!

لیکن ـــــ شندی کا بخار کچھ اور صورت اختیار کرنے والا تھا۔ یہ تو اُن کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ وہ دل ہی دل میں کانپ اُٹھیں۔

''اللہ بہتر کرے گا بیٹا۔ امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہئے''۔ خود کو سنبھالتے ہوئے وہ اُس کو ڈھارس بندھانے لگیں۔

''ہاں۔ اُمید تو نہیں چھوڑنا چاہئے...'' سوچوں میں گم اُس نے اُنہی کی بات دہرائی۔

''آزمائش ہے اپنے رب کی۔ وہ رحمٰن اور رحیم ہے۔ اپنا کرم کرے گا انشاء اللہ۔ تم حوصلہ کرو...'' اُس کے قریب ہوتے ہوئے اُنہوں نے شفقت سے اُس کا سر اپنے سینے سے لگایا۔ ماتھے پر بوسہ دیا۔

جواب میں وہ بھی اُن سے لپٹ گیا۔ پیار کیا۔

''امی آپ بہت اچھی ہیں''۔

''بس اچھی ہوں تو پریشان مت ہو۔ تمہیں پتہ ہے۔ میں نے کیا کیا پروگرام بنائے ہیں؟''

وہ بہت اُداس تھا۔ سرپرائز کے انتظار کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اُنہوں نے بتا دینا ہی بہتر سمجھا۔

''کیسے پروگرام؟'' اُس کے بازو اب بھی امی کے گرد لپٹے تھے۔

''میں تمہاری شادی شندی سے کروانے لگی ہوں''۔

''کیا مطلب؟'' وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا''۔

''ہاں۔ شندی ٹھیک ہو کر آئے گی۔ تو نایاب اور شاداب بھی آجائیں گے۔ پھر تمہارے نکاح اور رخصتی کا پروگرام بنائیں گے''۔

''اوہ ___ لیکن امی آپ بھول رہی ہیں کہ اُس کی منگنی ہو چکی ہے ابراہیم سے''۔

امی مسکرادیں۔

''وہ تو شندی منگنی کی انگوٹھی ابراہیم کے لنڈن سدھارنے سے قبل ہی اُسے لوٹا چکی ہے۔ ساتھ ہی اُس سے ریکویسٹ کی تھی کہ جانے سے پہلے وہ نہ اپنے گھر میں کسی سے ذکر کرے نا ہی اُس کے گھر میں کسی کو بتائے۔ کہ بقول شندی وہ مزید شور شرابے کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ بھلا ہو ابراہیم کا۔ کسی کو بھنک تک لگنے نہیں دی۔ شکر کیا تھا شاید کہ جان چھوٹی تھی مسائل سے ...''

''آپ کو یہ سب کس نے بتایا؟''

''صرف کل ہی نور جہاں کو ابراہیم نے فون پر بتایا ہے۔ وہ بھی اِس لئے کہ نور جہاں اُسے شادی کرنے کا کہہ رہی تھی۔ آگے سے اُس نے ساری بات بتادی''



''اور آنٹی نور جہاں نے آپ کو بتادی''۔

''ہاں۔ میں نے بھی سب نور جہاں کے گوش گزار کر دیا۔ کہ کیوں شندی انگوٹھی واپس کرنا چاہتی تھی۔ نور جہاں بہت شرمندہ تھی۔ کہتی تھی وہ اِس منگنی کے لئے راضی ہی نہیں تھا۔ اُسے شندی کے گھریلو مسائل سے ڈر لگتا تھا۔ نور جہاں نے ہی اُسے سمجھا بجھا کر آمادہ کیا تھا...''

''اور آپ نے راتوں رات پروگرام بنالیا۔'' اُس نے ماں کو چھیڑا۔ اِس کے باوجود پرکشش چہرے پر تاریک سے سائے لہرائے۔

''نہیں بیٹا۔ میں نے راتوں رات پروگرام نہیں بنایا۔ میرا پروگرام تو شندی سے پہلی اور پھر دوسری ملاقات میں ہی بن گیا تھا۔ ابراہیم کا خیال آیا تھا مجھے۔ لیکن پھر میں نے سوچا۔ وہ ویسے بھی بے ضرر سی مخلوق ہے۔ کہہ سن کر منالوں گی۔ کہ پہلا حق یاور کا بنتا ہے...''

''ہوں...'' اُس نے ایک پل کو توقف کیا۔ ''لیکن امی۔ شندی نے اُس سے منگنی کی ہی کیوں؟ میرا انتظار کیوں نہیں کیا؟'' اُس کی ناراضگی عود کر آئی۔

اور ___ انیسہ بیگم نے سوچا۔ بھلے اُنہوں نے شندی اور یاور خان کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ مگر جو کچھ بھی کیا تھا۔ اپنی دانست میں یاور خان کے بھلے کے لئے ہی کیا تھا۔ پھر ___ اُنہیں ڈر تھا کہ شندی اُن سے یاور کو چھین لے گی۔ اور وہی اُن کی متاعِ کل تھا۔ یہ قربانی دینے کو وہ تیار نہ تھیں مگر ___

شندی سے ملیں، اچھی طرح پرکھا۔ تو اپنے اندیشے، اپنا خوف بے معنی معلوم ہوا۔ وہ اکثر سوچا کرتی تھیں۔ اُن کی بہو ایسی ہونی چاہئے کہ جس میں حیا ہو، شوہر کی عزت کا پاس ہو، گھر میں سب کا مان رکھنے والی ہو۔ قدم رکھے، تو ساس اور نندیں واری جاتی ہوں...

اور یہی سب خوبیاں اُنہیں شندی میں کوٹ کوٹ کر بھری نظر آئی تھیں۔

بہت بڑے گھر کی تھی۔ اِس کے باوجود ملازموں تک کو عزت دیتی تھی۔ بستی کے غریب مکینوں سے اس قدر ہمدردی تھی۔ کہ ذکر کرتے آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے۔ جانوروں تک سے محبت کرتی تھی۔

خود انیسہ بیگم کو بے پناہ عزت اور محبت دی تھی۔ اپنی ماں کے بعد شاید وہ اُنہیں ہی چاہتی تھی۔ اُنہیں یقین تھا اُس کی ماما اُسے یاور خان سے متعلق اُن کا پیغام دے چکی تھی۔ وہ چاہتی تو یاور خان کو بتا سکتی تھی۔ ماں اور بیٹے کے درمیان تفرقہ پڑ سکتا تھا مگر ـــــ اُس نے ایسا نہیں کیا۔ عالی ظرف اور صابر تھی۔ اُن کی نفرت کا اندازہ ہو جانے کے باوجود اُنہیں ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ بہت قدر اور احترام دیا تھا اُن کو۔ پھر ـــــ

کیسے نہ وہ اُن کے دل میں گھر کرتی؟

''ایسا کر کے اُس نے میری انسلٹ کی ہے۔''

انیسہ بیگم چونکیں۔ بجائے اُس کو حقیقت بتانے کے، وہ تو خیالوں ہی خیالوں میں کہیں اور نکل گئی تھیں۔

''اُس نے تمہاری انسلٹ نہیں کی۔ نا ہی اُس نے اپنی مرضی سے ابراہیم سے منگنی کی ہے۔ میں نے کہا تھا نور جہاں سے کہ وہ شندی کو ابراہیم سے بیاہ دے۔ اور ـــــ میں نے ہی شندی کو اُس کی ماما سے کہلوایا تھا۔ کہ وہ تمہارے ساتھ شادی کا خواب دیکھنا چھوڑ دے...''

یاور خان متحیر سا انہیں دیکھ رہا تھا۔

''کہنے دو مجھے بیٹا۔ میں تم دونوں کی مجرم ہوں۔ میں نے نور جہاں پر باقاعدہ دباؤ ڈالا تھا اِس منگنی کے لئے۔ اور میں نے ہی شندی کو بہت سخت الفاظ میں تم سے باز رہنے کی تنبیہ کی تھی۔ لیکن ـــــ یہ بھی حقیقت ہے کہ مجھے تمہاری خالہ نفیسہ سے سوتیلی بہن ہونے کی وجہ سے شدید نفرت تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ نفیسہ نے مجھ سے میرا باپ چھینا تھا۔ کہیں شندی بھی مجھ سے تمہیں نہ چھین لے۔ اِس لئے میں



نے یہ قدم اٹھایا۔ مجھے دوسرا کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا... لیکن جب میں شندی کو ملی۔ اور پھر بار بار ملی۔ تو مجھے احساس ہوا۔ میں غلطی پر تھی۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ جس نے اُس کی تربیت کی ہے۔ یقیناً وہ بھی ایک اچھی عورت ہو گی۔ نفیسہ ضرور اچھی تھی۔ ورنہ اتنی اچھی بیٹی کو کیسے جنم دیتی؟ تمہیں اُس سے خفا نہیں ہونا چاہئے۔ مجھ سے شکایت ہونی چاہئے...''

کتنی صاف دل تھیں امی۔ کتنی صاف گو!

اور ـــــ اِس سارے معاملے میں کیا صرف وہ ہی قصوروار تھیں؟ اُس نے کوئی زیادتی نہیں کی تھی؟

''امی کیسی بات کر رہی ہیں آپ؟'' اُس نے ماں کے قدم پکڑ لئے۔

''کیوں مجھے گناہ گار کرتی ہیں۔ آپ نے جو بھی کیا۔ اچھا کیا۔ پلیز! مجھے معاف کر دیں امی''۔ اُس نے ماں کے پیروں پر اپنے ہونٹ رکھے۔ ''میں نے بھی بعد میں سوچا تھا۔ خود کو آپ کی جگہ رکھ کر غور کیا تھا۔ آپ کی جگہ میں ہوتا۔ تو میں بھی سوتیلی ماں کو پسند نہ کرتا۔ میں بھی اپنی اولاد کا رشتہ 'وہاں' کرنے سے گریزاں ہوتا۔ میری بھی بالکل وہی Feelings ہوتیں جو آپ کی تھیں۔ اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں ہے۔ قصوروار میں ہوں۔ خود مجھے سوچنا چاہئے تھا کہ بچپن سے لے کر آج تک آپ جن لوگوں سے خائف رہیں۔ میں ہی وہاں کیوں گیا...؟''

انیسہ بیگم نے اُسے اٹھاتے ہوئے سینے سے لگا لیا۔

''میری جان۔ میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔ تم بھی مجھے معاف کر دو۔ میں شندی کو سمجھی نہیں تھی۔ بہت اچھی لڑکی ہے وہ...''

''امی آپ اچھی ہیں''۔ وہ اب بھی اُن کے سینے میں سر چھپائے تھا۔

''کیوں شندی اچھی نہیں ہے؟'' اُنہوں نے اچانک اُسے چھیڑا۔

اُس نے سر اُٹھا کر ماں کی طرف دیکھا۔ پھر نفی میں سر ہلایا۔

''نہیں ـــــ اُس نے میری انسلٹ کی ہے... مانا کہ آپ نے اُسے منع

کر دیا تھا۔ مگر کیا ضروری تھا کہ وہ منگنی ہی کر لیتی؟''

''بیٹا اُس کے حالات ہی کچھ ایسے تھے کہ ...''

''نہیں امی۔ پیار سچا ہو تو کسی اور کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا۔''

جتنا وہ شندی کے لئے پریشان تھا۔ اتنا ہی دل میں اُس سے ناراض تھا۔ منگنی کے بعد شندی نے اُس کو دل سے نکالنے کی کوشش کی ہوگی۔ ابراہیم کو توجہ دینے کی سعی کی ہوگی۔ ابراہیم اُسے ملتا بھی رہتا تھا۔ کہیں اُس نے کوئی Advances کی ہوں تو؟ یہاں آ کر اُس پر وحشت سوار ہو جاتی تھی۔ آپے سے باہر ہونے لگتا تھا!

''بس چھوڑو پچھلی باتیں۔ دعا کرو اُسے صحت نصیب ہو۔ بخار ٹوٹے اُس کا۔''

تبھی۔۔۔ وہ بھی حال میں پلٹ آیا۔ حقیقت کتنی تلخ تھی۔ کیا پتہ کیا ہونے والا تھا!

''او کے مام''۔ اُس کی تابعداری میں حسبِ عادت شوخی عود کر آئی۔ ''آپ بھی دعا کریں اُس کے لئے''۔

''کیسے نہیں کروں گی۔ وہ ہم سے الگ تھوڑی ہے۔'' انیسہ بیگم کے لب و لہجے میں شندی کے لئے خلوص ہی خلوص تھا۔

پھر۔۔۔ دونوں ماں بیٹا کچھ دیر بیٹھے یوں ہی باتیں کرتے رہے۔ نایاب کی، شاداب کی، شندی کی۔

پھر۔۔۔ شندی کے یہاں جانے کی۔ اُس کو اپنے گھر کراچی مدعو کرنے کی۔۔۔ اُس کے چچا کی، سرفراز کی، جن کے لئے یاور خان کا ارادہ پکا تھا۔ کہ شندی کی طرف سے مطمئن ہوتے ہی وہ اُس کے تمام کیسز خود دلجمعی سے کورٹ میں Persue کرے گا۔ اُس کے ماموں کو بھی نہیں چھوڑے گا۔ شندی کے بلڈ



رپورٹ میں زہر کے Traces موجود تھے۔ مسز علی کو اعتراف کرنا ہوگا۔ ہر حال میں۔ وہ نادیہ کو بھی Spare نہیں کرے گا۔ جس نے شندی کے کڈنیپنگ کیس میں مک مکا کر کے خود کو بچا لیا تھا!

مگر۔۔۔ دونوں کی خوشی کچھ ادھوری ادھوری سی تھی۔ دونوں ہی جیسے ایک دوسرے سے کچھ چھپا رہے تھے۔ کاش آج کوئی معجزہ ہو جائے اور شندی کو بخار نہ آئے، دونوں کے دلوں میں ایک ہی آرزو تھی!

حمید نے ناشتہ لگنے کی اطلاع دی۔ تو دونوں نیچے ڈائیننگ روم میں آ گئے۔

وہ آفس میں بیٹھا اپنے ایک پچھلے آپریشن کردہ مریض کو دیکھ رہا تھا۔ شام کے چھ بج چکے تھے۔ چھٹی ہو چکی تھی۔ مگر اِن دنوں وہ قدرے ٹھہر کر گھر جاتا تھا۔ شندی کے ٹمپریچر کی اونچ نیچ کا اندازہ کرنے یہیں رکا رہتا تھا۔ چھ بجے ہی اُس کا بخار اوپر چڑھنا شروع ہو جاتا تھا۔ اِس وقت ساڑھے چھ بجے تھے۔ یقیناً کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ورنہ۔۔۔ نرس اُس کی شدید تشویش اور انتظار کو سمجھتے ہوئے اُسے کبھی کا مطلع کر چکی ہوتی۔

پہلے وہ خود چلا جاتا تھا اِس وقت شندی کے پاس۔ مگر آج۔۔۔ پتہ نہیں کیوں؟ ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔

جانے کیا ہونے والا تھا؟ کام کرتے ہوئے وہ خود کو گھسیٹ رہا تھا جیسے۔ سات بج گئے۔ پھر۔۔۔ ساڑھے سات۔ وہ اپنا آخری پیشنٹ کبھی کا دیکھ چکا تھا۔ یوں ہی آنکھیں موندے کرسی کی پشت سے سر ٹکائے بیٹھا تھا۔

پھر۔۔۔ اٹھا۔ اور تھکے تھکے بوجھل قدم اٹھاتا، سیڑھیاں چڑھتا اوپر شندی کے کمرے میں آ گیا۔ سسٹر نادرہ بھی ساتھ آ گئی تھی۔

''کیسی ہو؟'' وہ سیدھا شندی کے پاس آ گیا۔ سسٹر سے بات ہی نہیں

کی کہ ـــــ

کوئی فائدہ نہیں تھا۔ کوئی نئی خبر نہیں تھی!

"Fine." وہ بھی مختصراً بولی۔

اُس نے حسبِ سابق اُس کی نبض پر انگلیاں رکھیں۔ اب بھی بخار تھا۔

چپ چاپ ـــــ وہ کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔

"سر!" سسٹر نادر پاس چلی آئی۔ "میڈم کا ٹمپریچر سر۔" اُس نے vital chart اُس کے سامنے کیا۔

"ہوں۔" اُس نے یوں ہی سی نظر ڈالی۔

اور پھر ـــــ وہ زور سے چونکا۔

ٹمپریچر نیچے آچکا تھا۔ تھا ضرور۔ پر کم تھا۔ پچھلے کئی دِن جہاں ٹِک کر رہ گیا تھا۔ اُس سے نیچے آ گیا تھا!

"آپ ـــــ آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟" اُس کے لہجے میں غصہ عود کر آیا تھا۔

سسٹر سہم کر رہ گئی۔

"میں نے منع کیا تھا..." شندی دھیرے سے گویا ہوئی۔

یاور خان نے ایک نظر اُسے دیکھا۔ اور پھر سے چارٹ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"سوری سر۔" سسٹر نے کہا۔

"Its okay."

"میں جاؤں سر؟" اُسے پتہ تھا۔ یاور خان ابھی بیٹھے گا۔ سو اجازت طلب کر لی۔

"ہاں۔ تھینک یو۔" اُس نے کہا۔

سسٹر جا چکی۔ تو وہ دوبارہ شندی کے پاس آ گیا۔



وہیں کھڑا اُسے تکنے لگا۔ وہ اتنا خوش تھا۔ کہ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ کہ کیا کہے؟

"بیٹھیں گے نہیں؟" وہ بیٹھتا جو تھا اُس کے بیڈ کنارے۔

وہ بیٹھ گیا۔ جھکتے ہوئے اپنے تپتے ہونٹ اُس کے ماتھے پر رکھ دیئے۔

"کیوں منع کیا تھا سسٹر کو بتانے سے، ہاں؟"

"سرپرائز دینا چاہتی تھی آپ کو"۔

وہ ایک بار پھر خاموشی سے اُسے دیکھنے لگا۔

"تمہیں یہ خیال نہیں آیا کہ میرا ایک ایک پل کتنے کرب میں گزر رہا تھا..."

"سوری... ڈاکٹر... خان۔"

وہ خوشگواری سے ہنس دیا۔

"نام اچھا رکھا ہے۔ I like it."

"ویسے ـــــ پچھلے دنوں آپ ڈاکٹر خان ہی تو تھے۔" اُس کے لہجے میں شکوہ سا تھا۔

اور ـــــ دنوں بعد اُس کا جاندار قہقہہ بلند ہوا۔

"ہنسنے کی بات نہیں ہے"۔

"رونے کی بات بھی نہیں ہے"۔

اب کے وہ ہنس دی۔

دونوں ہنس رہے تھے۔ وہ ڈر گیا۔ کہیں بخار پھر اوپر چلا گیا تو؟ اتنی خوشی دونوں کو راس آئے گی کیا؟

وہ سیریس ہو گیا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ ہلکی پھلکی۔ دلچسپ باتیں ـــــ کہ سنجیدہ بات چیت اُس کے ذہن پر بوجھ ڈال سکتی تھی!

وہ وہیں رہا۔ اُس کے پاس۔ انڈر ابزرویشن رکھنا چاہتا تھا اُسے۔

ایک اور بھی معجزہ ہوا۔ بخار کی Duration بھی پہلے کی نسبت کم تھی!

شاداں وفرحاں ۔۔۔ وہ گھر کی طرف چلا جا رہا تھا۔

اندیشہ البتہ اب بھی گاہے گاہے سر اٹھا رہے تھے۔ کہیں کل پھر ٹمپریچر اوپر چلا گیا تو؟

امی کو بھی سب بتا دیا۔ لیکن ساتھ ہی دعا کے لئے بھی کہا۔ کہ پتہ نہیں کیوں؟ وہ اب بھی خوفزدہ تھا!

اگلا سارا دن بھی سب جیسے دم روکے شندی کی جانب آس اور یاس سے دیکھ رہے تھے۔ امی اور ماما گھر پر ۔۔۔ اور یاور خان ہوسپٹل میں!

شام کے سات بج رہے تھے۔ یاور خان فورتھ فلور پر کنسلٹنٹ لاؤنج میں بیٹھا کوفی پیتا ٹی وی پر نظریں جمائے تھا۔ کان اب بھی اپنے سیل فون کی طرف لگے تھے۔

آج دن کو شندی کو بخار نہیں آیا تھا۔ اور ۔۔۔ شام چھ بجے وہ اُس کے کمرے میں گیا ہی نہیں۔ پتہ نہیں کیوں؟ کچھ خائف سا تھا جیسے اُس کے کمرے سے ہی!

یہیں آ کر بیٹھ رہا تھا۔ چھ بجے سسٹر نے اُسے بتا دیا تھا کہ شندی کو بخار نہیں آیا تھا۔ وہ خوش تھا۔ پر تھوڑی سی بے اطمینانی اب بھی تھی!

تبھی ۔۔۔ اُس کا سیل بج اُٹھا۔ امی تھیں۔

"بیٹا شندی کو بخار نہیں آیا۔ میں نے ابھی ابھی نرس سے پتہ کیا ہے"۔ امی بہت خوش لگ رہی تھیں۔

کتنی اچھی تھی اُس کی ماں۔ کتنی گریٹ تھی!

"I love you Ammi."

"I love you too Beta."

"امی میں شندی کو دیکھ کر بس جلدی گھر آ رہا ہوں۔ اُمید ہے اب اُسے



بخار نہیں ہوگا"۔ وہ مطمئن سا لگنے لگا تھا۔

"نہیں ہوگا انشاء اللہ۔ بس آ جاؤ جلدی سے۔ نایاب کا فون آیا تھا۔ وہ اور شاداب بچوں سمیت کل صبح کی فلائیٹ سے پہنچ رہی ہیں ..."

"واؤ۔ خوش کر دیا امی۔"

اگلے ہی دن شندی گھر واپس آ گئی۔ سبھی خوش تھے۔ ماما نے کلام پاک سے ختم کے لئے مسجد کے اِمام اور اُن کے شاگردوں کو بلایا ہوا تھا۔ اینکسی کے پچھلے دروازے کے باہر وہ لوگ کھلے آسمان تلے سپارے لئے بیٹھے ختمِ قرآنِ پاک میں مصروف تھے۔

نور محمد کے ساتھ ساتھ حمید بھی اُنہیں اٹینڈ کر رہا تھا۔ میوہ خان کچن سے مٹھائی لے کر بستی بھر میں تقسیم کر رہا تھا۔

نایاب اور شاداب شندی کے پہنچتے ہی اُس کے پاس چلی آئی تھیں۔ انیسہ بیگم البتہ اِس وقت گھر پر ہی کچن کے آگے اپنی مخصوص جگہ پر کرسی ڈالے بیٹھی تھیں۔ کہ صبح سے ہی بستی کی عورتیں شندی کی صحت یابی پر اُنہیں مبارکباد دینے آ جا رہی تھیں۔

انیسہ بیگم کو ایک انجانی سی خوشی ہو رہی تھی، عجیب سا سکون مل رہا تھا۔ اُنہیں بھی تو برس ہا برس کینیڈا میں گزارتے ہوئے اپنوں کی یاد آئی تھی۔ پھر تو نہیں تھیں!

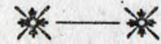
آج جیسے ۔۔۔ وہ کمی پوری ہو گئی تھی۔ ابا جان نہیں تھے پر ۔۔۔ شندی بالکل ابا جان کی تصویر تھی۔

وہ شندی کو اپنے گھر لائیں گی۔ ابا جان کی تصویر کو ضرور اپنے گھر میں سجائیں گی۔

اُن کی یاد میں اُن کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

'ابا جان۔ شندی بالکل تنہا ہے۔ اکیلی ہے۔ میں اُسے اپنے گھر لانا چاہتی ہوں۔ آپ ہم سب کی خوشیوں کے لئے دعا کریں،'

اور ـــــ اُنہیں لگا۔ ابا جان خوش ہو گئے تھے۔ اُنہیں بھی جیسے شندی کے بارے میں تشویش تھی!





ہر سُو ہلچل تھی۔ چاروں اور چہل پہل۔ یہاں وہاں کھڑے گارڈز چاق و چوبند تھے اور ـــــ

ڈھلتی شام کے دھندلکوں میں دور تک پھیلی پُرشکوہ حویلی زندگی کی رعنائیوں سے مالا مال نظر آ رہی تھی۔

اُس نے گاڑی روک لی۔ قدم باہر رکھا ہی تھا کہ ـــــ

پوری حویلی ہفت رنگی روشنیوں سے جگمگا اُٹھی۔ اونچے منارے، بام و در، رنگ و نور کے سیلاب میں نہا گئے۔ بینڈ کی خوبصورت دھنیں چھڑ گئیں اور ـــــ

جواب میں یاور خان کے دوست واحباب نے اتنی فائرنگ کی۔ کہ پورا علاقہ گونج اُٹھا۔

اُسے کزنز اور دوستوں کے جلو میں لیکر ـــــ نایاب، شاداب، اُس کی چچا زاد اور پھوپھی زاد بہنیں ـــــ اُس کے آگے آگے میوزک کی دھن پر رقص کرتیں دھیرے دھیرے حویلی کے بڑے سے منقش چوبی دروازے میں داخل ہوگئیں۔

ست رنگی روشنیوں میں، پھولوں کی برسات میں، خوشبوؤں کی پھواروں میں ـــــ اُسے لمبی راہداری سے گزارتے ہوئے وہ لوگ پچھلی طرف مہمان خانے میں لے گئیں۔ نو بجے مہندی کا رسم شروع ہونا تھا۔ تب تک یہ لوگ ستا لیتے، فرش ہو جاتے۔

جگہ چونکہ دور تھی۔ اس لئے ایک دن پہلے سے ہی مہمان آنا شروع ہو گئے تھے۔ انیسہ بیگم کی سسرال، دیگر رشتہ دار اور قریبی دوست کل شام آ پہنچے تھے۔ انیسہ بیگم بمعہ نور جہاں بانو کے، نایاب، شاداب اور شندی کو لیکر چار دن پہلے ہی آ گئی تھیں کہ انیسہ بیگم کے ذمے پوری حویلی اور مہمانوں کا انتظام بھی تھا۔ شندی کی ماں تو تھی نہیں۔ وہ ہی خالہ اور ماں دونوں بن کر سب نمٹا رہی تھیں۔

دن رات مہمانوں کی خاطر تواضع جاری تھی۔ حویلی کے اندر زرق برق کپڑوں میں ملبوس مامائیں کہیں ٹھنڈا پہنچا رہی تھیں۔ تو کہیں چائے اور کوفی۔ کہیں سنیکس جا رہے تھے، تو کہیں مٹھائیاں۔

صبح ہر ایک کی مرضی کے مطابق ناشتہ کمروں میں سرو کیا جا رہا تھا۔ دوپہر اور رات کو لمبے چوڑے دسترخوانوں پر انواع واقسام کے کھانے چنے جا رہے تھے۔

مردانے میں خدام آنکھیں فرشِ راہ کئے تھے۔ مہمانوں کی تواضع میں، اُن کی ہر خواہش پوری کرنے میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے میں کوشاں تھے۔



یاور خان کو خاص طور سے حویلی کے پرانے ملازم اکرم بابا اٹینڈ کر رہے تھے۔ باقی خدام اکرم بابا پر رشک کر رہے تھے کہ وہ ـــــ یاور خان کی دیکھ بھال پر مامور تھے!

ماما الفت سبز کامدار جوڑا زیب تن کئے زیور سے لیس شندی کی سہیلیوں کی خاطر تواضع پر تعینات یہاں سے وہاں مستقل گردش میں تھیں۔ خوشی اُن کی ہر حرکت سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ اور کیوں نہ ہو ـــــ کہ اُن کی شندی بی بی کو بہت سارے دکھ اُٹھانے کے بعد اُس کا پیار ملنے والا تھا!

ہر طرف ہلچل تھی، ہنگامہ تھا ـــــ ہنسی تھی، قہقہے تھے۔

روشنیاں تھیں، چمک دمک تھی ـــــ رنگ تھا، ترنگ تھا کہ ـــــ

عرصہ بعد حویلی کی رونقیں لوٹ آئی تھیں۔ گھر کا داماد آیا تھا۔ شندی بی بی کی شادی ہو رہی تھی!

جتنی خوشی مناتے، کم تھا۔

جب سے شندی، انیسہ بیگم، نایاب اور شاداب بمعہ بچوں کے حویلی میں پہنچی تھیں۔ ڈھولک منگوالی گئی تھی۔ سر شام شنید کی سہیلیاں پہنچ جاتی تھیں اور پھر ـــــ ایسا دھوم دھڑکا ہوتا تھا کہ الامان!

اِس وقت بھی اُس کے کمرے میں اُس کی کزنز اور فرینڈز براجمان تھیں۔

شندی بالکنی کے قریب لگے صوفے پر بیٹھی تھی۔ خوش تھی۔ کہ ـــــ

وہی مشفق چہرے تھے، قدموں کی مانوس آہٹیں تھیں، جیتا جاگتا ماحول

تھا!

لیکن ــــ پاپا نہیں تھے۔ دو موتی لڑھک کر شندی کے خوبصورت گالوں پر آ رہے۔

پھر ــــ یاور خان بھی تو اُس سے خفا تھا۔ بات نہیں کر رہا تھا۔ پچھلے جمعے کو ہی نکاح نامے پر دستخط تو کر لئے تھے۔ مگر ــــ

'نہیں کروں گا بات اُس سے۔' وہ شاداب پر برسا تھا۔

''لیکن آپ... ہوسپٹل میں تو... اُس سے بات کرتے تھے۔'' وہ سہمی سہمی سی بولی تھی۔

یقیناً اُسے شندی نے بتایا تھا۔

''ہاں کرتا تھا۔ تب وہ بیمار تھی۔ مگر اب بیمار نہیں ہے''۔

کیا منطق تھی یاور بھائی کی بھی؟ پر شاداب کو کیا خبر کہ ــــ یاور خان کی تو جان پر بنی تھی اُن دنوں۔ کیسے بات نہ کرتا؟

''یاور بھائی پچھلی باتیں بھول جائیں نا اب۔''

'ایک ــــ صرف ایک بات کا جواب چاہئے مجھے ــــ اُس نے کسی اور سے منگنی کی حامی بھری ہی کیوں؟' اُس نے پہلے بھی کئی بار کہی اپنی بات ایک بار اور دہرائی تھی۔

'وہ... اپنی پروٹیکشن... کے خیال سے...'

'ڈیم اِٹ۔ پروٹیکشن۔ میں مر گیا تھا کیا؟' وہ دھاڑا تھا۔ اور ــــ

شاداب خاموش ہو رہی تھی۔ شندی کو تسلی دے دی تھی۔ کہ بولے گا۔



کب تک نہیں بولے گا!

"He is so handsome."

اُس کے کانوں میں ناہید کی آواز پڑی۔ تو محویت ٹوٹی۔

''میں نے دیکھا ہے بالکنی سے۔'' ناہید نے اپنی بات پوری کی۔

''چاند سورج کی جوڑی ہے۔'' سسٹر نرگس بولی۔

نرگس کو شندی نے خاص طور پر انوائیٹ کیا تھا۔

''بالکل And he looked so happy.'' نویدہ نے کہا۔

''اور... ڈاکٹر خان... جو اِنہیں پسند کرنے لگے تھے۔ میں تو اُس وقت کی گواہ ہوں۔'' نرگس پھر چہکی۔

''اچھا؟ یعنی محبت کو پروان چڑھتے آپ نے دیکھا تھا؟'' نویدہ اور ناہید ایک ساتھ بولیں۔

باقی سب بھی تجسس سے نرگس کو دیکھنے لگیں۔

''ہاں۔ اپنی اِن دو آنکھوں سے''۔

''ڈاکٹر خان کو بتاؤں گی''۔ شندی نے تڑی دی۔

''پلیز! پلیز میم۔ اُن سے مت کہیئے گا''۔

اور سب کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

''آپ اتنا ڈرتی ہیں اُن سے؟'' ناہید نے پوچھا۔

''اِس سے بھی کہیں زیادہ۔''

''میں... بھی... ڈرتی ہوں۔'' شندی نے مسکین صورت بناتے ہوئے کہا۔

ایک بار پھر لڑکیاں خوشگواری سے ہنس دیں۔

"سچ کہہ رہی ہو یا؟" ناہید کو فکر لاحق ہوگئی۔ "کہیں غصے والا تو نہیں؟"

"ایسا ویسا؟" شندی بولی۔

"اوہ۔۔۔ پھر تو اچھی خبر نہیں۔۔۔" اب کے فرزانہ بولی۔

"جورو کا غلام تو مجھے بھی اچھا نہیں لگتا۔" شندی نے آہستہ سے کہا۔

"اچھا؟" کئی آوازیں ایک ساتھ آئیں۔

اور وہ۔۔۔ کھلکھلا کر ہنس دی۔

"ٹھیک تو کہتی ہے۔ مرد کو مرد ہونا چاہئے۔" بڑی دیر کی چپ سادھے لیلیٰ چہکی۔

"نہ زیادہ مرد ہونا چاہئے۔ نہ ہی زیادہ غلام ہونا چاہئے"۔ ناہید نے مخلصانہ رائے دی۔

"ہاں۔ یہ ٹھیک ہے۔ کاٹ چھانٹ کر درست کرلیں گے۔" فرزانہ نے سنجیدگی سے کہا۔

ایک بار پھر قہقہے گونجے۔

یوں ہی چہلیں ہوتی رہیں۔ چھیڑ چھاڑ ہوتی رہی۔

پھر۔۔۔ بیوٹیشنز آئیں۔ اور شندی کو مہندی کی رسم کے لئے بنانے سنوارنے لگیں۔

حویلی کے سائیڈ والے دور تک پھیلے لان میں۔۔۔ پنڈال اور اُس کے اندر خوبصورتی سے سجا سٹیج جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ میوزک آن تھی۔ شوخ وشنگ



لڑکیاں میوزک کی دھن پر رقص میں مصروف تھیں۔

شندی کو تھامے نایاب اور شاداب پنڈال میں داخل ہوئیں۔ تو میوزک رک گئی۔ رقص کرتی لڑکیاں سمٹتے ہوئے اپنی اپنی نشستوں پر جا بیٹھیں۔ اور۔۔۔ کیمرے حرکت میں آگئے۔

شندی نایاب، شاداب، ان کی کزنز اور شندی کی سہیلیاں آہستہ آہستہ سٹیج کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

شندی بیٹھ چکی تو۔۔۔ یاور خان کو بھی کزنز اور دوستوں کی سنگت میں، ضو پاشیوں اور گل پاشیوں کے درمیان سٹیج پر لایا گیا۔

واقعی۔۔۔ چاند سورج کی جوڑی تھی۔ نگاہ نہ ٹھہرتی تھی دونوں پر!

پیلے رنگ کے زرق برق کپڑوں میں ملبوس ماما الفت دونوں کے آگے ہرمل کی دھونی دے رہی تھیں۔ اُنہیں ڈر تھا اُنہیں کسی کی نظر نہ لگ جائے!

سٹیج کے آگے نایاب، شاداب اور سب کزنز ڈانس پر ڈانس کرتی جا رہی تھیں۔

نور جہاں بانو سے مزید صبر نہ ہوا۔ میوزک بدلواتے ہوئے لڑکیوں کو پرے کیا اور۔۔۔ انیسہ بیگم، اُن کی نندوں اور دیورانی کو لا کر میدان پر قبضہ کرلیا۔

خوب خوب بھنگڑا ڈالا۔ خوب خوب داد ملی۔

لڑکیوں اور پھر خواتین نے جی بھر کر ناچ کیا۔ تو یاور خان کے کزنز اور دوست فلور پر آگئے پھر تو۔۔۔ سماں ہی بندھ گیا!

یاور خان سب کچھ بہت دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

پاکستان آنے کے بعد دو ایک شادیاں اٹینڈ کی تھیں اُس نے۔ مگر ایسی
دھوم دھام اور آن بان نہیں تھی اُن میں ___ اُسے اچھا لگ رہا تھا سب!

تبھی ___ ڈاکٹر نادر سٹیج پر گیا اُسے ہاتھ سے پکڑا۔

"چلیں سر آپ بھی۔"

"نہیں یار۔ تم لوگ کرو۔"

نایاب دور سے اُس کا انکار سمجھ گئی۔ فوراً پاس چلی آئی۔

"آئیں بھائی۔ اُٹھیں"۔

"نو"۔

"کیوں؟"

"میں یہیں ٹھیک ہوں"۔

اور ___ شندی سمجھ گئی، وہ کیوں نہیں اٹھ رہا تھا۔ خفا جو تھا اُس سے!

جانے کہاں سے سسٹر نرگس بھی آ گئی۔

"سر پلیز! آئیں نا"۔

اور ___ اتنی ساری ریکویسٹس اکٹھی ہوئیں۔ تو اُسے اٹھنا ہی پڑا۔

شندی اُسے خوبصورت سٹیپس اٹھاتے دیکھتی رہی۔

سب میں نمایاں تھا وہ۔ ٹال، ہینڈسم اور ___ بہت gracefully اپنی
movements سے میوزک کا ساتھ دیتا۔ فن کی باریکیوں سے آشنا تھا!

معاً ___ انیسہ بیگم سٹیج پر آئیں۔ اور شندی کو ہاتھ سے تھامتے ہوئے نیچے
لا کر سیدھا یاور خان کے سامنے لا کھڑا کر دیا۔



وہ چونکا۔ پہلے شندی کو دیکھا۔ پھر ماں کو۔

جانے کیا تھا ماں کی نظروں میں۔ وہ رد نہ کر سکا۔

دھیرے سے بازو شندی کی نازک کمر میں ڈالا۔ اور دوسرے ہاتھ میں
اُس کا کومل ہاتھ تھام لیا۔

اتنی تالیاں بجیں، اتنا شور بلند ہوا۔ اتنے پٹاخے گونجے، اتنی آتشبازی
ہوئی کہ ___ الامان!

بہت دھیمے دھیمے دونوں waltz کی سحر انگیز دُھن کا ساتھ دینے
لگے۔

"تم ... تم کون ہو؟" یاور خان نے اُس کی آنکھوں میں دیکھا۔ نہ
چاہتے ہوئے بھی اُسے چھیڑا۔

عرصہ پہلے ___ جو سوال شندی نے اُس سے پوچھا تھا۔ اُسے یاد دلایا!

وہ خاموشی سے اُسے تکتی رہی۔ کیا کہتی؟

اِس وقت اُس کے چہرے پر چند روز قبل والی گہری سنجیدگی، گہرا سناٹا
نہیں تھا۔ آنکھوں میں وہ وحشت بھی نہیں تھی۔

اتھارٹی البتہ اب بھی وہیں کہیں بھٹک رہی تھی۔ کمانڈ اب بھی آس پاس
ہی منڈلا رہا تھا!

"ہوں ___ بتاؤ نا؟" اُس کی قربت سے پگھلتا سا وہ پھر بولا۔

اُس کی آنکھیں متلاطم ___ نظریں ہنگامہ خیز تھیں۔

"نہیں پتہ۔" اُس کی پلکیں تیورا کر گر گئیں۔

"سنو۔"

"جی"۔ وہ بمشکل بولی۔ کہ فلور پر صرف وہ دو ہی تھے۔ اور ہر ایک کی نظریں اُن پر ہی لگی تھیں۔

"ابراہیم کے لئے تمہارے دل میں کوئی جگہ بنی تھی؟" اُس نے اپنا خدشہ ظاہر کر ہی دیا۔

"No ... never."

"اُس نے تمہیں چھوا تو نہیں تھا"۔

Waltz کی مدھر دھن کے ساتھ ہولے ہولے سٹیپس اٹھاتا وہ دل پر دھرا بوجھ کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"میں نے اُسے ہمیشہ دروازے کے باہر ہی رکھا تھا"

"کیوں؟" اُس کی سرگوشی ابھری۔

"Because I never liked him."

اُسے ایک گونہ تسلی ہوئی۔

"لیکن تمہاری کسی بات پر ایک دفعہ وہ بہت زور سے ہنسا تھا"۔ یہی تو وہ Episode تھا۔ جس پر اُس نے اُسے کبھی یاد نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا!

شندی کو یاد تھا۔ کیسے بھول سکتی تھی کہ ___

اُسی وقت یاور خان گاڑی میں بیٹھا دھیرے دھیرے اپنے گھر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اور یقیناً اُن دونوں کی موجودگی بھی نوٹ کی تھی۔ شومئی قسمت اُسی وقت اُس نے اپنے پاؤں پر کوئی چیز رینگتی محسوس کی۔ بے طرح گھبراتے ہوئے اُس نے دیکھا۔ ایک Lady bird تھی۔ بس اُسی پر ابراہیم کا زور سے قہقہہ



بلند ہوا تھا۔

وہ تب بھی سہم کر رہ گئی تھی گو ___

اُن دنوں وہ یاور خان کی پابند بھی نہیں تھی!

اُس نے ہولے ہولے بات یاور خان کے گوش گزار کر دی۔

"اور مجھے اُس کا قہقہہ بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔" شندی نے کہا۔

"کیوں؟"

"کیونکہ وہ مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔"

"تو پھر ___ منگنی کے لئے حامی کیوں بھری؟"

اسکا یہ سوال اسے شاداب سے معلوم ہو چکا تھا۔

پتہ نہیں کیوں؟ اُس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"مجھے ڈر تھا۔ کہ آپ نہ رہے۔ تو وہ لوگ مجھے اپنی اینکسی سے نکال دیں گے۔ میں ... اکیلی ... دنیا کی بھیڑ میں کیسے نکلتی۔ جب کہ قدم قدم پر دشمن میری تاک میں تھے ..." اُس نے بمشکل کہا اور ___ آہستہ سے اپنا ہاتھ چھڑاتی ___ واپس سٹیج پر آ گئی۔

اُسے بے تحاشا رونا آیا تھا۔ جس پر وہ بہت مشکل سے قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔

یاور خان متحیر سا اُسے دیکھ رہا تھا۔

پھر ___ خود کو سنبھالا۔ نہیں چاہتا تھا کہ لوگ کچھ سمجھیں۔

اُس کے ذہن پر کا بوجھ تو چھٹ گیا تھا مگر ___

شندی کی بات اُس کے دل میں نشتر بن کر اتر گئی تھی۔

'مجھے ڈر تھا۔ کہ آپ نہ رہے۔ تو وہ لوگ مجھے اپنی اینکسی سے نکال دیں گے ...'

'وہ لوگ مجھے اپنی اینکسی سے نکال دیں گے ...'

'اینکسی سے نکال دیں گے ...'

'نکال دیں گے ...'

اوہ___ اُس نے آنکھیں جھپکیں۔

اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود ___ وہ اُس عام سی اینکسی میں سر چھپانے کو ترسی تھی۔ کہ وہ اکیلی دنیا کی بھیڑ میں کیسے نکلتی؟

'اُس نے میرا انتظار کیوں نہیں کیا؟' کل ہی اُس نے غصے میں شاداب سے کہا تھا۔

'کیا انتظار کرتی۔ امی نے جو اُسے کہلوا دیا تھا کہ آپ لنڈن سے واپسی پر سیدھے کراچی آئیں گے۔ وہیں وہ اپنی دوست کی بیٹی کے ساتھ آپ کا نکاح کروا کر ہی آپ کو یہاں ڈیوٹی پر آنے دیں گی ...'

تو___ شندی نے اُس کی طرف سے مایوس ہو کر سر چھپانے کے لئے ابراہیم کا سہارا لیا تھا!

اُس نے گہری سانس لی۔

-کس کا دکھ بڑا تھا؟ اُس کا یا شندی کا؟

متاسف سا وہ بھی سٹیج پر آ گیا۔ اپنی جگہ پر شندی کے پہلو میں بیٹھ گیا۔



تبھی ___ خواتین آئیں۔ اور شندی کے ہاتھوں میں مہندی لگانے لگیں۔

وہ دلچسپی سے دیکھنے لگا۔ بہت اچھا لگ رہا تھا اُسے سب!

پھر___ ماما الفت آ گئیں۔ سب کو کھانا لگ جانے کی اطلاع دی۔

''شندی۔ فنکشن کے بعد مجھے ملو''۔ اُس نے آہستہ سے اُس کے کان میں کہا۔

''نہیں''۔ پتہ نہیں کیوں؟ اب وہ خفا تھی!

پلیز! میں انکل کی لائبریری میں انتظار کروں گا۔'' وہ کچھ ہی دیر قبل گھومتے پھرتے انکل عالمگیر کی لائبریری دیکھ چکا تھا۔

''نہیں''۔ اُس نے سر نفی میں ہلایا۔

اور___ وہ خاموشی سے سٹیج سے اترتے ہوئے دوستوں کے ہمراہ مردوں کے سائیڈ پر چلا گیا۔

ڈنر بہت شاندار تھا۔ انواع واقسام کے پاکستانی اور چائینز کھانے تھے۔ Salad bar تھا۔ سویٹ بار تھا۔

سامنے ہی لیمب بھی بن رہی تھی؟ چکن باربی کیو ہو رہا تھا، سیخوں میں تکے بھونے جا رہے تھے، تندور پر گرم گرم نان بن رہے تھے ___ ساتھ میں ایک طرف تازہ پھلوں کا جوس نکالا جا رہا تھا، کولڈ ڈرنکس کا سٹال تھا، کشمیری چائے تھی!

مہمان جا جا کر اپنی مرضی سے ہر چیز لے رہے تھے۔

رات گئے تک ہنگامہ جاری رہا۔

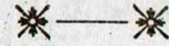
انیسہ بیگم اور نور جہاں بانو لڑکیوں بالیوں کو سو جانے کی تاکید کر رہی تھیں
کہ ___

صبح تڑکے یہاں سے روانہ ہو کر ___ کراچی جانے کے لئے ایئر پورٹ
پہنچنا تھا!

یاور خان انکل عالمگیر کی لائبریری میں بیٹھا شندی کے انتظار میں کتابیں
الٹ پلٹ کرتا رہا۔

مگر ___ شندی نہیں آئی۔

اُس نے کچھ کم ستایا تھا اُسے؟





شندی دلہن بنی یاور خان کے سجے سجائے بیڈ روم میں خوبصورت کشادہ
بیڈ پر بیٹھی تھی۔ نایاب بھی اُس کے ساتھ تھی۔ دونوں باتیں کر رہی تھیں۔

رات کے بارہ بجنے لگے تو نایاب اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"اب چلتی ہوں۔ ورنہ یاور بھائی آ کر زبردستی نکال دیں گے۔ گڈ لک۔"

مسکراتے مسکراتے اُس نے اُسے پیار کیا اور ___

باہر نکل گئی۔

رات بھر کی جاگی، دن بھر کی تھکی تھکائی شندی بھی اُٹھی۔ دل چاہتا تھا
نہا لے اور پھر ___ جی بھر کر سو لے۔

لیکن پھر اِرادہ بدل دیا کہ ___ یاور خان بھی تو آنے والا تھا۔ یہی سوچتے

ہوئے وہ سامنے کے صوفے پر بیٹھ گئی۔

ایک ___ پھر دو بج گئے۔ مگر یاور خان نہیں آیا۔

وہ سخت تھکن محسوس کر رہی تھی۔ رات مہندی کے فنکشن کے بعد وہ بمشکل گھنٹہ ڈیڑھ بستر پر لیٹ پائی تھی۔ اُس کے بعد پھر کراچی روانگی کی تیاری میں لگ گئی تھی۔

اُس نے آدھا گھنٹہ مزید یاور خان کا انتظار کیا۔ وہ اب بھی نہیں آیا۔

خفا تو وہ تھی ہی اُس سے، اب غصہ بھی آنے لگا۔

تبھی ___ وہ اٹھی، واش روم گئی، ٹھنڈے پانی کا شاور لیا، سادہ سا ہلکے گلابی رنگ کا نائیٹ سوٹ پہنا، بالوں میں برش کیا اور ___ واپس کمرے میں آ کر صوفے پر پڑ رہی۔

تھکی ہوئی تو تھی ہی۔ بے خبر ہو کر سو گئی۔

صبح کے پونے چار جا کر کہیں یاور خان کو دوستوں نے اندر آنے دیا۔

دنوں کے تھکے ہارے سب سو رہے تھے۔ وہ دبے قدموں اپنے بیڈ روم میں آ گیا۔

واہ ___ کیا دلہن تھی! اُسے ہنسی آ گئی۔

نہ زرق برق لباس، نہ جگمگ کرتے زیور، نا ہی بستر پر سر جھکائے بیٹھی روایتی دلہن!

پر ___ نکھری نکھری سی، سادہ سادہ سی وہ اُسے اور بھی زیادہ پیاری لگی۔



اُس نے بھی ڈریسنگ روم جا کر کپڑے تبدیل کیے۔ ایزی ہوا۔ اور کمرے میں آ گیا۔

چند پل اُڈورنگ نظروں سے اُسے دیکھتا رہا۔ پھر ___ پاس آتے ہوئے آہستہ سے اُس کے سرہانے بیٹھ گیا۔

دھیرے سے اُس کے چہرے پر بکھر آئے بال پیچھے ہٹائے، ہولے سے اپنے ہونٹوں سے اُسے چھوا۔ اور ___

شندی کی آنکھ کھل گئی۔

پل دو پل کو اجنبی اجنبی سا لگ سب کچھ۔

پھر ___ نظریں یاور خان پر پڑیں۔ دو ثانیے حسین خمار آلود آنکھوں سے اُسے تکتی رہی۔ پھر ___

پاس رکھا چھوٹا سا فلفی کشن اٹھایا اور ___ اُس پر دے مارا کہ ___

پچھلے بہت سارے دن اُس نے اُسے بہت ستایا تھا۔ بہت رُلایا تھا!

وہ زور سے ہنس دیا۔ اُس کی ناراضگی کا انداز بہت پیارا تھا!

وہ باری باری کر کے صوفے کے روئیں دار، نرم نرم کشنز، اُس پر مارتی گئی۔

وہ ہر وار بچاتا رہا۔ خوشگواری سے ہنستا رہا۔

''بس؟'' آخری کشن بھی دے مارا تو اُس نے پوچھا۔

''نہیں''۔

''اچھا اور بھی کچھ ہے؟''

وہ اٹھی۔۔۔ اور بستر کے ملائم ملائم تکیے اور کشنز بھی اُس پر پھینک دیئے۔

''اور؟'' وہ جاندار قہقہوں کے درمیان بولا۔

اور۔۔۔ شندی نے ارد گرد دیکھا۔ باقی کی ہر چیز بہت بھاری تھی

اور۔۔۔ یاور خان اُسے اپنی جان سے بھی زیادہ پیارا تھا۔

آہستہ سے چلتی وہ دوبارہ صوفے پر آ گئی۔

ایک روٹھی روٹھی سی نظر اُس پر ڈالی۔ اور پھر بے اختیار اُس سے لپٹ گئی۔





☆ ''مسٹر! میں اس آدمی کا پتہ لگانا چاہتی ہوں۔ میں۔۔۔ اور پھر کوئی بھی اس کیس کے فیصلے سے مطمئن نہیں۔ اسکا یوں آسانی سے بری ہو جانا سب کو عجیب لگ رہا ہے...''

''یہ کام اتنا آسان نہیں۔ پچھلے کئی مہینوں سے ہم لوگوں نے کتنی کوشش کی اُسکا انٹرویو لینے کی۔ مگر صاف جواب مل جاتا تھا کہ وہ کسی کو انٹرویو نہیں دیگا...''

''میں کروں گی اُسکا انٹرویو۔'' وہ ایڈیٹر کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔

''مشکل ہے۔''

''تو سر یہ مشکل کام آخر کون کرے گا؟'' وہ الجھ سی گئی۔

پولیس۔ قانون کا کام ہے یہ...''

''صرف پولیس یا قانون کا نہیں ہمارا بھی ہے۔ آپ جانتے ہیں بعض اوقات پولیس ناکام ہو جاتی ہے اور پریس کامیاب رہتی ہے۔ پریس، پولیس، قانون سب کو مل کر کام کرنا چاہیے۔ پریس کا تعاون بہت Count کرتا ہے...''

☆ برآمدے کے لکڑی کے کھمبے سے سر ٹیکے اُسکی نظریں بائیں جانب دریا کے اس پار اونچائی پر چیڑ، صنوبر اور قد آور درختوں پر گئیں۔

یہ۔۔۔ فخر عالم کے جنگلات تھے۔ اور۔۔۔ اُس سے بھی آگے کوسوں پر محیط اُسکی اسٹیٹ تھی۔ رات باتوں کے دوران آنٹی نے اُسے اپنے مشرقی پڑوسی کے بارے میں بتایا تھا!

اُس نے سر جھٹکا۔ سوچوں سے باہر نکلی۔

کہ اُس نے کم سے کم وقت میں بہت سارا کام کرنا تھا!

☆ دریا کے تنگ تر حصے پر پہنچ کر وہ ایک پل کو رکی۔ اوپر نگاہ کی۔ جنگل میں

بادلوں نے کھلبلی مچا رکھی تھی۔ بالکل ایسے ہی جیسے اس وقت اُس کے ذہن و دل میں مچی تھی۔
وہ بارڈر کراس کرنے جا رہی تھی۔ جہاں جانے کی اجازت بھی نہ تھی۔ پھر اس جگہ کا مالک ایک قاتل اور سفاک شخص تھا۔ اور وہ بہرحال ایک لڑکی!
بولڈ ہونے کے باوجود اس وقت دل ایک بار دھڑکا ضرور!
بڑے سے پتھر پر قدم رکھتے ہوئے اُس نے دل ہی دل میں اپنی کامیابی کی دعا مانگی اور اللہ کا نام لیکر آگے بڑھی۔
اُس نے دریا پار کیا، اونچی ڈھلان عبور کی، اوپر پہنچی۔
جنگل میں بادل اور کہر گڈمڈ ہو رہے تھے۔ بھول بھلیوں کا سماں تھا۔ کوئی سرا کوئی سمت تو نظر آتا نہیں تھا۔ وہ اندازے سے آگے بڑھنے لگی۔
کچھ دور جا کر وہ ٹھٹھک سی گئی۔ پاس ہی کہیں سے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز آئی تھی۔ اُس کا دل ایکبار پھر دھڑکا۔ کہیں وہ ہی تو نہیں تھا۔ ایک درخت کے تنے کے پیچھے سے وہ مڑ کر دیکھنے لگی۔
وہ ہی تھا۔ سو فیصد وہی تھا۔ وہ اُسے ہزاروں میں پہچان سکتی تھی۔ عام سی جینز پر جیکٹ پہنے چند قدم نیچے دریا کے رخ پر آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا۔ رائیڈنگ کا یہ آخری مرحلہ تھا جیسے۔
اور — اپنے پلین کے مطابق — ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر — وہ وہیں لیٹتے ہوئے اُسکی جانب جا لڑھکی۔ انجام کیا ہوگا؟ یہ سوچنے کو اُس نے وقت ہی کب لیا تھا۔ فخر عالم تک ڈھلان پر لڑھکتے ہوئے تو اُسے خاص چوٹ نہیں آئی تھی مگر اُس کے گھوڑے کے ٹاپوں میں الجھنے کے بعد اُسے کوئی ہوش نہیں رہا تھا۔
'اکیلا' آمنہ اقبال احمد کے منفرد سٹائل میں ایک اور خوبصورت اضافہ ہے۔